

تذکرہ وسوانح

امیر شریعت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

تالیف

مولانا عبد القیوم حقانی

2010

القاسم اکیڈمی • جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد ضلع نوشہرہ

تذکرہ وسوانح

امیر شریعت

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

تالیف

مولانا عبد القیوم حقانی

2010

القاسم اکیڈمی • جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد ضلع نوشہرہ



تذکرہ وسوانح

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

جملہ حقوق اشاعت برائے القاسم اکیڈمی محفوظ ہیں

تذکرہ وسوانح سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

84658

.....	ترتیب
مولانا عبدالقیوم حقانی
.....	کمپوزنگ
حافظ محمد طیب حقانی، جان محمد جان
.....	ضخامت
316 صفحات
.....	تعداد
1100
.....	اشاعتِ اول
ربیع الاول ۱۴۳۱ھ / اپریل 2010ء
.....	ناشر
القاسم اکیڈمی، جامعہ ابو ہریرہ، خالق آباد، نوشہرہ

یہ کتاب درن ذیل اداروں سے مل سکتی ہے

صدیقی ٹرسٹ، صدیقی ہاؤس المنظر اپارٹمنٹس 458 گارڈن ایسٹ، نزد سبیلہ چوک کراچی

انجمن خدام الدین، شیر نوالہ گیٹ، لاہور

مکتبہ رشیدیہ سردار پلازہ، اکوڑہ خٹک، ضلع نوشہرہ

کتب خانہ رشیدیہ، مدینہ کلاتھ مارکیٹ، راجہ بازار، راولپنڈی

مکتبہ سید احمد شہید، ۱۰ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

زم زم پبلشرز، نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کواچی

مولانا خلیل الرحمن راشدی صاحب، جامعہ ابو ہریرہ، چنوں موم، ضلع سیالکوٹ

تذکرہ و سوانح

سید عطاء اللہ شاہ بخاری^{رح}

خاندانی پس منظر، ولادت، تذکرہ والدین، تعلیم و تربیت، شخصیت و کردار، عادات، اطوار، فقر و درویشی، مصائب و مشکلات، عفو و درگزر، اوصاف و کمالات، تواضع و انکساری، تقویٰ و حشمت الہی، سیاسی زندگی، سیاسی بصیرت، قرآن سے محبت، انگریزوں سے نفرت، سراپا علم و عمل، اخلاص و للہیت، زہد و استغناء، اصول پسندی، عشق رسول ﷺ، اتباع سنت، مسئلہ ختم نبوت سے والہانہ عقیدت، فرق باطلہ کا تعاقب، دعوت و خطابت، قید و بند کی صعوبتیں، ذوق شعر و ادب، ظرافت، حاضر جوابیاں، چٹکے، سفر آخرت، آخری ایام اور ان جیسے لاجواب عنایں اور روح پرور مضامین اس پر مستزاد۔

مؤلف

مولانا عبدالقیوم حقانی



القاسم اکیڈمی، جامعہ ابو ہریرہ، خالق آباد، نوشہرہ



انتساب

ایک مبتدی طالب علم ایک معصومانہ مطالبہ مطالبے پر اصرار ادھر سے انکار
ادھر سے پھر اصرار اور شدید انتظار کا اظہار

..... اپنے معصومانہ لب و لہجہ میں بار بار اپنے والد گرامی سے درخواست
اباجی ! حقانی صاحب سے کہو کہ وہ اپنے انداز میں حضرت امیر شریعت
کی سوانح لکھیں، ضرور لکھیں

..... سوانح کب آئے گی؟ کیوں نہیں آرہی؟ کئی سوانحات آئے، کتنی
کتابیں چھپیں.....؟ مگر القاسم اکیڈمی اب تک حضرت امیر شریعت پر
تبا کیوں نہ لاسکی

..... اباجی ! اب کے بار جانا تو کتاب ساتھ لانا اس انداز سے
..... حافظ امداد اللہ ولد حضرت مولانا قاری محمد عبداللہ بنوی نے احقر کو اپنی
مجوزہ کتاب ”تذکرہ وسوانح حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری“ پر لکھنے کے
لئے بے چین کر دیا جواب ہدیہ ناظرین ہے

..... کتاب کا انتساب حافظ امداد اللہ کے نام



فہرست عناوین

۲۳	عرض مؤلف
	باب : ۱ خاندانی پس منظر، ولادت، تذکرہ والدین اور تعلیم و تربیت
۳۰	خاندانی پس منظر
۳۱	احساس شرف
۳۱	جگر شق ہو جائے گا
۳۲	رشد و ہدایت کا محور
۳۲	سید ضیاء الدین
۳۲	ایک ہی رکعت میں سارا قرآن
۳۳	والدہ محترمہ
۳۳	سوتیلی ماں کا احترام
۳۳	ولادت

۳۴ بچپن

۳۵ پیار و محبت کا حصار

۳۶ تعلیم و تربیت

۳۷ تسلاناً حامیہ

۳۸ اندازِ تربیت

باب دوم : شخصیت و کردار عادات و اطوار فقر و درویشی

مصائب و مشکلات اور عفو و درگزر

۴۰ چہرے کا تقدس

۴۰ لباس

۴۱ ٹوپی نہیں پہنوں گا

۴۱ بھائی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس ہے

۴۲ بخاری ڈنڈے والا

۴۲ بابا پھر آگئے

۴۳ خوراک

۴۴ چائے کا سامان

۴۴ غیبت سے نفرت

۴۴ فوراً مٹھی کھول دیتے

۴۵ عجیب بٹوا

۴۵ اراضی کی پیشکش

- ۴۷ عفو و درگزر
- ۴۷ امیر شریعتؒ کو زہر دیا گیا
- ۴۸ چائے نہیں زہر ہے
- ۵۰ قاتل سے ملاقات
- ۵۱ موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے
- ۵۲ ایک دلچسپ واقعہ
- ۵۳ بچی کے لئے دُعا
- باب سوم : اوصاف و کمالات، تواضع و انکساری، تقویٰ و خشیت الہی سیاسی زندگی اور سیاسی بصیرت
- ۵۶ شاہ جی کی عادتیں
- ۵۷ ماضی کے انسان
- ۵۸ یادِ الہی
- ۵۹ روٹی کے لئے جینا
- ۵۹ چشتی بھی، نقشبندی بھی
- ۶۰ شاہ جیؒ اور وقت کی پابندی
- ۶۰ ملکوتی صفات
- ۶۱ قرآن کو رفیق بنا لیا
- ۶۱ سیاسی زندگی کا آغاز
- ۶۲ واقعہ جلیانوالہ

- ۶۳ شاہ جی پر حادثہ کارڈ عمل
- ۶۳ واعظ سے سیاسی لیڈر تک
- ۶۵ پہلی گرفتاری
- ۶۶ میاں والی جیل
- ۶۶ قومی زندگی کا آغاز
- ۶۸ بیعت جہاد
- ۶۹ ہجرت
- ۷۱ تواضع و انکساری
- ۷۲ چھابڑی فروش
- ۷۲ کیا مزید ارساگ ہے
- ۷۳ انسان تو ہو
- ۷۳ نفس کا علاج
- ۷۵ جفاکشی اور دلیری
- ۷۶ قدروانی
- ۷۷ علماء و صلحاء کا احترام
- ۷۸ تدبر و بصیرت اور مجسمہ علم و حکمت
- ۸۱ شیخ پر آنچ نہ آنے پائے
- ۸۲ دیانتداری کا فیصلہ
- ۸۲ تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا

- ۸۳ تقویٰ
- ۸۴ تصویر اور آواز
- ۸۵ اپنی تقریر پر استغفار
- ۸۶ میری تصویر میرے افکار
- ۸۶ میری تصویر میرا بیٹا ہے
- ۸۶ سیاست میں مقلد تھا شریعت میں نہیں
- ۸۷ چوک میں رکھ کر جوتے مارنا

باب چہارم : قرآن سے محبت، انگریزوں سے نفرت

سراپا علم و عمل

- ۸۹ قاری عمر عاصم سے تلمذ
- ۹۰ قرآن کا اعجاز
- ۹۱ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن
- ۹۲ علماء خدا کی رحمت
- ۹۳ محفل عشاق
- ۹۳ حضرت رائے پوری کی شہادت
- ۹۴ گل و بلبل
- ۹۵ مجھے قرآن کے سوا کچھ نہیں آتا
- ۹۶ قرآن سے محبت، انگریزوں سے نفرت
- ۹۶ زمانہ تحریک خلافت کی یادیں

- ۹۷ ----- لعنت بر پدِ فرنگ
- ۹۷ ----- فرنگی بابا
- ۹۸ ----- ایک ہی دشمن انگریز
- ۹۸ ----- میرا ملک چھوڑ کر تشریف لے جائے
- ۹۹ ----- انگریز اور مرزائی
- ۹۹ ----- اب یہ ٹوپی نہیں اترے گی
- ۱۰۲ ----- کسی اور ڈبے میں جاؤ
- ۱۰۳ ----- دوستوں کے لئے معہ
- ۱۰۴ ----- بڑھیا جھانسنے میں آگئی
- ۱۰۵ ----- خان صاحب، تصویر عبرت بن گئے
- ۱۰۶ ----- یہ وظیفہ پہلے کیوں نہ بتا دیا
- ۱۰۶ ----- نوکری چھڑوانے والا پیر
- ۱۰۷ ----- آپ جیسے محسن کو کیسے بھول جاتا
- ۱۰۹ ----- گورنمنٹ کے باغی سے مصافحہ

باب پنجم: اخلاص و للہیت، زہد و استغناء، اصول پسندی

- ۱۱۲ ----- کھوٹے مرید
- ۱۱۲ ----- قیمتی بات
- ۱۱۳ ----- ایصالِ ثواب یوں ہوتا ہے
- ۱۱۳ ----- فقیر کا ڈیرہ

- ۱۱۴ چوری کا مال
- ۱۱۵ پروردگار کی گداناوازیں
- ۱۱۶ غیبی فتوحات شاہ جیؒ کی نیاز مندیاں
- ۱۱۸ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان سے کہہ دیتا ہوں
- ۱۱۹ بھئی! اپنی ضرورت پر خرچ کر لینا
- ۱۲۰ فرشتہ یا انسان
- ۱۲۱ یاروں نے کوٹھے سے کوٹھی بنالی
- ۱۲۲ مغربی مصنوعات سے اجتناب
- ۱۲۲ صبح و شام دو روٹیاں مل جاتی ہیں
- ۱۲۳ سکندر مرزا کی خواہش
- ۱۲۳ لندن آنے کی دعوت

باب ہشتم: عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اتباع سنت

- ۱۲۶ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم
- ۱۲۷ تبلیغ دین سے شغف و انہماک
- ۱۲۸ معاملہ عقل و خرد کا نہیں عشق کا ہے
- ۱۲۸ حضور کی قدم بوسی کی سعادت
- ۱۲۹ وہی خواب اب زبانی سناؤ
- ۱۳۰ عشق است ہزار بدگمانی
- ۱۳۲ لوگو! گواہ رہو میں نے توہین نہیں کی
- ۱۳۳ اگر معراج کی رات میں ہوتا؟

- ۱۳۳ یہ نعلین سر پر رکھنے کے قابل ہیں
- ۱۳۴ عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم
- ۱۳۵ لدھارام کی گواہی
- ۱۳۶ ضعیفہ کی دعائیں
- ۱۳۶ شاہ جی کی صحبتیں
- ۱۳۷ خالصہ کالج میں داڑھی رکھنا آسان ہے
- ۱۳۷ مسلک کی پابندی
- ۱۳۹ سنت کی اہمیت
- ۱۴۰ بیٹی کی سنت کے مطابق شادی
- ۱۴۰ آنسو کے زیورات
- ۱۴۱ بعد از مرگ احتساب
- ۱۴۱ علم دین سے قلبی وابستگی
- ۱۴۲ اولاد کی تربیت
- ۱۴۲ امیر شریعت کی نگاہ میں علماء کا مقام
- ۱۴۳ حضرت رائے پوری اور شاہ جی
- ۱۴۵ مسلمانوں کا اصل دشمن

باب ہفتم مسئلہ ختم نبوت سے والہانہ عقیدت

اور فرق باطلہ کا تعاقب

- ۱۴۸ محافظ ختم نبوت

- ۱۴۹ ----- امیر شریعت کا اعزاز
- ۱۵۰ ----- پانچ صد سالہ تاریخ کی نادر مثال
- ۱۵۱ ----- مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت کی حقیقت
- ۱۵۱ ----- تاج امامت و رسالت
- ۱۵۲ ----- مرزائیت کے خلاف فتویٰ
- ۱۵۳ ----- مرزائیت کے پھنسنے کے وسائل
- ۱۵۴ ----- قادیان میں تحریک ختم نبوت کے دفتر کا قیام
- ۱۵۴ ----- بیماری کو بھول گئے
- ۱۵۵ ----- یوم احتجاج
- ۱۵۶ ----- شہداء کو خراج عقیدت
- ۱۵۶ ----- جذبہ قربانی کو سلام
- ۱۵۷ ----- مجلس عمل کا قیام
- ۱۶۰ ----- مسئلہ ختم نبوت کی وضاحت
- ۱۶۲ ----- محمد علی بوگرہ کی آمد
- ۱۶۳ ----- موقف اور اعتماد
- ۱۶۵ ----- قادیان میں تاریخی تقریر
- ۱۶۵ ----- قصر خلافت میں اہم میٹنگ
- ۱۶۵ ----- تقریر کا اعلان
- ۱۶۷ ----- با محمد ہوشیار

- ۱۶۸ ----- میری ٹوپی ناظم الدین کے قدموں میں ڈال دو۔
- ۱۶۹ ----- امیر شریعت اور جسٹس منیر کا مکالمہ۔
- ۱۶۹ ----- سرکار بنام عطاء اللہ شاہ بخاری۔
- ۱۷۰ ----- امیر شریعت عدالت میں۔
- ۱۷۰ ----- مردِ مؤمن کا چہرہ۔
- ۱۷۳ ----- انسان یا چٹان۔
- ۱۷۴ ----- میرا سب کچھ قربان۔
- ۱۷۴ ----- شہداء ختم نبوت۔
- ۱۷۵ ----- جان، ایمان اور روح قرآن۔
- ۱۷۶ ----- بیٹی! تم نے میری دکھتی رگ پکڑی ہے۔
- ۱۷۶ ----- مبلغین کو وصیت۔
- ۱۷۸ ----- رفعت، عزت و احترام۔
- ۱۷۹ ----- ایک مخالفانہ اشتہار کا جواب۔
- ۱۸۰ ----- مجھے اور مرزا محمود کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دو۔
- ۱۸۰ ----- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے کا تسمہ۔

باب ہشتم..... دعوت و خطابت اور قید و بند کی صعوبتیں

- ۱۸۵ ----- پہلی تقریر۔
- ۱۸۵ ----- امامت۔
- ۱۸۶ ----- نخن داؤدی۔

- ۱۸۷ ایفائے عہد کا اہتمام
- ۱۸۷ شاہ جیؒ کو دھمکی
- ۱۸۸ جورات قبر میں آنی ہے باہر نہیں آسکتی
- ۱۸۹ چھوڑو، اللہ کے سپرد کرو
- ۱۹۱ سنگ پر سنگ چلاؤ تمہیں ڈر کس کا
- ۱۹۲ سکھوں کو قرآن سنایا
- ۱۹۳ سرمہ لگانے آیا ہوں
- ۱۹۴ مفتی محمد حسنؒ صدارت کی کرسی پر
- ۱۹۵ جب تقریر کا طلسم ٹوٹا
- ۱۹۶ ہندو لڑکیوں سے خطاب
- ۱۹۷ بندے کا اللہ سے تعلق
- ۱۹۸ تقریر کے ایمان افروز اقتباسات
- ۱۹۹ ہم کسی اپنے کام کو تو نہیں جارہے
- ۲۰۰ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
- ۲۰۱ یہ آگینے بڑے نازک ہیں
- ۲۰۲ نرالا بیان نرالی شان
- ۲۰۲ ہندو بھی قرآن سنتے
- ۲۰۳ خطابت کا سحر
- ۲۰۵ مینڈھی گال سمجھ گدھی ہا

- ۲۰۶ تیس برس خطاب کیا
- ۲۰۷ پہلی سیاسی تقریر
- ۲۰۷ ابوالکلام آزاد کی حمایت میں تقریر
- ۲۰۸ برطانوی استعمار کے خلاف مسلسل جہاد
- ۲۰۸ پنجاب کا ”کالا پانی“
- ۲۰۹ چھ ماہ قید بامشقت
- ۲۰۹ آؤ اپنی زندگی کا ثبوت دیں
- ۲۲۱ اہمات المؤمنین کی ناموس پر قربان ہو جاؤ
- ۲۱۲ خطابتی معرکے
- ۲۱۲ خطابت کے جلوے
- ۲۱۲ ہوئے مر کے ہم جوڑ سوا
- ۲۱۳ خطابت کی کرامت
- ۲۱۴ جرأت و شجاعت
- ۲۱۵ ہائے مشکل تھی جو آسان ہوتے ہوتے رہ گئی
- ۲۱۵ تحریک مدح صحابہؓ
- ۲۱۷ اپنے عہد سے پھر نہیں سکتا
- ۲۱۸ احساسِ فرض
- ۲۱۹ تدبر اور وفاداری
- ۲۲۰ گندگی نام کونہ رہے گی

- ۲۲۲ ----- تین چیزیں
- ۲۲۲ ----- میری آنکھ میلی نہیں ہوئی
- ۲۲۳ ----- کل پھل کا درخت ان شاء اللہ یہاں نہیں ہوگا
- ۲۲۴ ----- حکومت کا منصوبہ بنا کام بنایا
- ۲۲۵ ----- میری آمد کی اطلاع نہ کرنا
- ۲۲۶ ----- امیر شریعت عوام سے خطاب کریں گے
- ۲۲۷ ----- پانچویں مصلے کے تم مالک ہو
- ۲۲۸ ----- اسلامی مساوات کا نمونہ
- ۲۲۸ ----- نادر روزگار شخصیت
- ۲۲۹ ----- انتہائی خطرناک پستیاں
- ۲۳۰ ----- قید و بند
- ۲۳۱ ----- معافی کی درخواست کے ہزار ٹکڑے کر دیے
- ۲۳۱ ----- جیل خانے کی محدود دنیا
- ۲۳۲ ----- خاناماں کا فرانس
- ۲۳۳ ----- تربیت گاہ
- ۲۳۳ ----- ہندوستان کی یادیں
- ۲۳۴ ----- دلفریب شخصیت
- ۲۳۵ ----- یاد ہائے رفتہ
- ۲۳۵ ----- جیل خانے کا نقشہ

- ۲۳۶ امام السارقین
- ۲۳۷ جیل کو دیکھ کے گھریا آیا
- ۲۳۸ مولانا عبداللہ چوڑی والے
- ۲۳۸ شعر فہمی، سخن سنجی
- ۲۳۹ لاتنا بز و باللقاب
- ۲۴۰ شہنجم کا اچار
- ۲۴۰ دلکش لطیفہ
- ۲۴۱ جیل یا کھیل
- ۲۴۲ مجھے ایسی سیاست سے تعلق نہیں
- ۲۴۳ جسے غرور آئے کرے شکار مجھے
- ۲۴۳ قرآنی وظائف
- ۲۴۴ سبوا پنا اپنا ہے جام اپنا اپنا
- ۲۴۴ تجربہ گاہ
- ۲۴۵ قانون مکڑی کا جالا

باب نہم ذوقِ شعروادب، ظرافت،

حاضر جوابیاں اور چٹکے

- ۲۴۸ شعروادب
- ۲۴۹ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟
- ۲۵۲ تین میں ایک، ایک میں تین

- ۲۵۵ ----- خلاصہ کلام
- ۲۵۷ ----- شاہ جی کی شاعری
- ۲۵۹ ----- پنجابی شاعری سے دلچسپی
- ۲۶۰ ----- ہے آنکھوں میں موجود اور چشم حیران
- ۲۶۱ ----- قوم پر سکرات کا عالم طاری ہے
- ۲۶۲ ----- پرسش احوال کا جواب
- ۲۶۲ ----- شکوہ ترکمانی، ذہن پسندی، نطق اعرابی
- ۲۶۳ ----- گالی سے انسان قائل نہیں ہوتا
- ۲۶۳ ----- سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
- ۲۶۵ ----- گستاخ اکھیاں
- ۲۶۶ ----- میکدہ آباد است
- ۲۶۷ ----- گھی لے کر پہنچو جوتے تیار ہیں
- ۲۶۸ ----- اس لئے مجھ کو ترپنے کی تمنا کم ہے
- ۲۶۸ ----- تم نے مشاعرہ لوٹ لیا
- ۲۶۹ ----- کمال محبت کی ایک ادا
- ۲۷۰ ----- کور ذوقوں کی پروانہ کریں
- ۲۷۱ ----- نفس نفس میں رحمتیں
- ۲۷۲ ----- چمگاڈ کے مہمان
- ۷۲۳ ----- ہزارہ کے حکیم حاذق

۲۷۵ حاضر جوابیاں برجستہ جملے

۲۷۶ باادب بے ایمان

۲۷۶ دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

۲۷۶ حضرت عائشہؓ اور حضرت خدیجہؓ میں فرق

۲۷۷ یا علی مدد

۲۷۷ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ

۲۷۷ وہ نوری ہیں اور میں خاکی

۲۷۷ مجھے بیعت کر لیجئے

۲۷۸ فَبِئْتِ الَّذِي كَفَرَ

۲۷۹ منکرین بشریت سے

۲۷۹ میرا دل چھین لیا ہے

۲۷۹ ایک کرامت

۲۸۰ ظرف و استعداد کی بات

۲۸۱ ہیر نام میں کیا حرج ہے؟

۲۸۱ ہم تمہاری بصیرت کے قائل ہیں

۲۸۱ تیسرا حلال

۲۸۲ سورہ رحمان ساتھ لگا لو

۲۸۲ خدا کا خوف کرو

۲۸۳ یہ بھی کوئی نام ہوا؟

باب دہم سفر آخرت، آخری ایام

- ۲۸۵ ----- صحت کا گلہ کس سے کروں ؟
- ۲۸۶ ----- بیماری کا اثر زائل ہو گیا
- ۲۸۷ ----- خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت
- ۲۸۸ ----- میری محفلیں اُجڑ گئیں
- ۲۸۸ ----- گھر میں خوبصورت تحریریں
- ۲۹۰ ----- دُعاے صحت کے لئے
- ۲۹۱ ----- زندگی کی آخری سانس گن رہا ہوں
- ۲۹۲ ----- تماشاخانے اہل وفادیکھتے ہیں
- ۲۹۳ ----- اخبار والوں سے شکایت
- ۲۹۳ ----- یارانِ گہن کی یادیں
- ۲۹۵ ----- چائے کے رسیا
- ۲۹۶ ----- عمر تھوڑی مگر قرینے کی ہو
- ۲۹۶ ----- شبِ وصال بہت کم ہے
- ۲۹۶ ----- استبداد کی چکی
- ۲۹۷ ----- وراثت کا مسئلہ اور ہندوؤں میں کھلبلی
- ۲۹۷ ----- فالج کا دوسرا بڑا حملہ معالج سے گفتگو
- ۲۹۸ ----- فالج کا آخری حملہ
- ۲۹۹ ----- شاہ جی غیر مسلموں کی نظر میں
- ۲۹۹ ----- نشتر ہسپتال میں معالجہ کے مراحل



عرض مؤلف

الحمد لحضرة الجلالة والصلوة والسلام على خاتم الرسالة

ہر ملت کی قیمتی متاع وہ افراد ہوتے ہیں جو اپنے اخلاق، کردار، خدا پرستی اور مشن سے لگن کے باعث اعلیٰ انسانیت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ انسانیت کی شاہراہ تاریخ پر روشن مینار ہوتے ہیں۔ لوگ ان کے کردار کی روشنی سے استفادہ کر کے اپنی زندگیوں کے راستوں کو روشن کرتے ہیں۔

مجھ گناہ گار نے اپنی زندگی میں اپنے اکابر میں جن کو اعلیٰ نمونے کے انسان پایا اور وہ دنیا سے گزر گئے اور اپنا نمونہ چھوڑ گئے تو احقر نے ان کی بشری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کر کے (اس لیے کہ ان کے جاننے میں کسی کا بھلا نہیں ہے) ان کے کردار کے درخشاں پہلوؤں کو ان کی سوانحات میں ابواب میں تقسیم کر کے اختصاراً دلچسپ واقعات کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ گل دستہ وہی ہوتا ہے جس میں پھول ہوں لوگوں کو کانٹوں کی نہیں پھولوں کی ضرورت ہوتی ہے ویسے بھی مسلمانوں کے فن سوانح نگاری میں انسانیت کے لیے سبق آموز اور کردار ساز مواد جمع

کرنے کی روایت زندہ ہے یورپ کی طرح حقیقت نگاری کے نام سے کردار کشی اور بد نما نمونے پیش کرنے کی روایت نہیں ہے۔ اب تک جن علماء کے سوانحات لکھے ہیں ان کو انسانیت کا بہترین نمونہ پایا ہے جو دوسرے بنی نوع انسان کے لیے بہترین مثال بن سکتے ہیں۔

احقر نے اپنے اکابر علماء کی سوانح نگاری اس معنی میں نہیں کی ہے کہ ان کی پوری زندگی کے سارے گوشے بیان کرنا مقصود ہو بلکہ یہ وہ سوانحی خاکے ہیں جن میں ان کے کردار کی تابناکی کو درخشاں اور نمایاں کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔

اپنے اکابر علماء میں امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ایک معنی میں میرے استاد بھی ہیں، میں نے ان کی وفات کے بعد ان سے استفادہ کیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا میں نویں جماعت میں گورنمنٹ ہائی سکول درابن کلاں ڈیرہ اسماعیل خان میں زیر تعلیم تھا۔ تعلیم کے لیے میری مسافرت کا آغاز کار یہیں سے ہوا، سکول کے ہاسٹل میں دو سال قیام رہا یہیں پر مجھے اپنے سکول کے استاد حضرت مولانا صاحبزادہ عبدالحلیم صاحب فاضل دیوبند سکونہ چودھوان ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کی رفاقت، صحبت، خدمت، اور ان کے الطاف و عنایات سے حصہ وافر حاصل ہوتا رہا۔ مرحوم نے عوام الناس کے افادہ و اصلاح کے لیے بازار میں ایک دینی کتب کی لائبریری قائم فرمائی جہاں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا اور لوگ کتب دیدیہ سے استفادہ کرتے مرحوم نے چاروں طرف سے کتابیں سجا رکھی تھی۔ اُن میں مرزا جانباز کی ”حیات امیر شریعتؒ“ سب سے نمایاں تھی جس میں امیر شریعتؒ کی خوبصورت تصویر بھی لگی ہوئی تھی میں شاہ جیؒ کی تصویر دیکھ کر ان کو دل

دے بیٹھا اور فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی بن پڑے شاہ جی کی تصویر پھاڑ کر چرائی ہے۔ ایک روز جب لائبریری میں حاضرین کی تعداد کم تھی لائبریرین بھی غائب تھا تو میں نے موقع غنیمت سمجھا اور تصویر کو پھاڑنے اور جیب میں چھپانے کی غرض سے آگے بڑھا اب اگر تصویر پھاڑتا ہوں تو کاغذ کے چرچرانے کی آواز حاضرین کے کانوں میں جاسکتی ہے اور وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی چیز پھاڑی جا رہی ہے لہذا بجائے کاغذ پھاڑنے کے پوری کتاب چرائی اور سکول میں اس کا مطالعہ شروع کر دیا طلبہ دسویں جماعت کے امتحانات کی تیاری کر رہے تھے اور میں ”حیات امیر شریعت“ کے مطالعہ میں مگن رہ کر اپنے مستقبل کو نورِ علم کی روشنی مہیا کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ بالآخر کتاب ”حیات امیر شریعت“ نے حضرت امیر شریعت کے راستے پر لگا دیا کتاب پوری پڑھ لی بار بار پڑھی جملے الفاظ تراکیب اور اشعار مجھے ازبر ہو گئے اس وقت فیصلہ کر لیا کہ اب امیر شریعت بنا ہے اور اسی راستے پر چلنا ہے جس پر حضرت امیر شریعت چلتے رہے میٹرک پاس کیا تو مدرسہ عربیہ نجف المدارس کلاچی میں داخلہ لے لیا۔

مادرِ علمی نجف المدارس بزرگ اساتذہ قاضی برادران شیخ التفسیر حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب فاضل دیوبند بزرگ عالم دین حضرت مولانا قاضی عبداللطیف صاحب مدظلہ اور اسی کتاب ”حیات امیر شریعت“ کی برکت تھی کہ احقر نے اپنے گھر چودھوان کے ایک چھوٹے سے کمرہ میں اپنی طالب علمانہ سطح کے مطابق چھوٹا سا کتب خانہ سجا رکھا تھا۔ میری طالب علمی کے تیسرے سال استاذ فی المکرّم حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب مدظلہ (فاضل دیوبند) جب ہمارے علاقہ کے تبلیغی دورے پر تشریف لائے، تو صبح کا ناشتہ اسی کتب خانہ والے کمرے میں مبرے ساتھ کیا۔ کتب

خانے میں کتاب ”حیاتِ امیر شریعت“ کو پسند فرمایا اور سفر میں مطالعاتی زاویراہ کے طور پر ساتھ لے لیا۔ پانچ چھ ماہ تک میری یہی کتاب ان کے مطالعہ میں رہی۔ اس کے بعد کتاب مجھے واپس مل گئی، جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے، حضرت قاضی صاحب نے سفر سے واپسی پر میرے استاذ حضرت مولانا محمد زمان صاحب مدظلہ (صاحب المصنفات فی الحدیث) سے فرمایا :

”عبدالقیوم کا خیال رکھنا، علمی، مطالعاتی اور کتابی ذوق عمدہ ہے، ضائع نہ ہو جائے۔“

مورخہ ۱۹/۱۱/۲۰۰۳ء جب حضرت امیر شریعتؒ کے جانشین اور ان کے علوم و معارف اور مشن کے امین مولانا سید عطاء المہبین مدظلہ جامعہ ابو ہریرہ تشریف لائے۔ جامع مسجد عمار میں اجتماعِ عظیم سے خطاب فرمایا۔ تو ان سے قبل میں نے اپنے بیان میں ”حیاتِ امیر شریعتؒ“ کا وہی نسخہ ہاتھ میں لے کر سامعین کو تمام پس منظر سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ :

”بعض اوقات شر میں خیر ہوتا ہے۔ یہ کتاب میں نے چوری کر لی تھی، علمی، کتابی اور مطالعاتی حد تک حضرت امیر شریعتؒ کو اپنا استاذ بنا لیا۔ وہی میری آئیڈیل شخصیت قرار پائے۔ حضرت امیر شریعتؒ سے میری محبت، عشق اور والہانہ قلبی تعلق کا اللہ نے مجھے یہ ثمرہ دیا ہے کہ آج ان کے صاحبزادے اور میرے مخدومزادے حضرت مولانا سید عطاء المہبین شاہ بخاری مدظلہم میرے مہمان ہیں۔“

چار سال بعد جب کتاب چرانے کی غلطی اور گناہ کا احساس ہوا تو حضرات

اساتذہ کے مشورہ کے مطابق اس کا ازالہ کر دیا۔ حضرت امیر شریعتؒ گویا میرے استاد ہیں اور میں نے ان کی رحلت کے بعد ان سے استفادہ کیا ہے وہی استفادہ آج ان کی سوانح کی ترتیب میں ڈھل رہا ہے۔

ماہنامہ نقیب ختم نبوت کی خصوصی اشاعت ”امیر شریعت نمبر“ (دو جلد) اس موضوع پر جامع، مکمل اور ایک عظیم تاریخی دستاویز ہے، مگر ضخامت کے پیش نظر کم فرصت لوگوں کے لئے اس سے استفادہ آسان نہیں۔ احقر نے اپنی اس کتاب کی تالیف میں اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ماہنامہ نقیب ختم نبوت، شورش کاشمیری، مرزا جانباز، امین گیلانی، ابو ذرا ابو معاویہ اور غازی خان کابلی کی کتابیں میرا ماخذ رہی ہیں۔

کسی شخصیت کی کامیابی کا یہ پیمانہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے تمام مخالفین پر غالب آگئی ہو، وہ اپنے نظریے کے نفاذ و عموم اور ترویج میں کامیاب ہوگئی ہو اور اس نے یکسر ایک انقلاب پیدا کر دیا ہو..... کسی شخص کی بڑائی ہمیں اس کے فکر و رائے کی صحت میں، عمل و سن کی راہ میں، اخلاص و ایثار میں، اس کی سیرت کی عزیمت و استقامت میں اور حق کی راہ میں کچھ پالینے کے بجائے سب کچھ لٹا دینے کے ذوق میں تلاش کرنی چاہئے۔ حضرت امیر شریعتؒ کی سیرت اس کا علمی مرقع ہے جسے ہم اپنے قارئین کی خدمت میں لائحہ عمل، روشنی کا چراغ اور نور ہدایت کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

عبدالقیوم حقانی

صدر القاسم اکیڈمی، جامعہ ابو ہریرہ خالق آباد نوشہرہ

۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ / ۲۷ فروری ۲۰۱۰ء

تیرے قدموں میں رہا تاج فرنگی کا وقار

تیری آواز سے ہے حشر جہانداروں میں
تیرے قدموں میں رہا تاج فرنگی کا وقار
اک قدم تیرا اٹھا، کفر نے راہیں بدلیں
تجھ سے وابستہ رہا ختم نبوت کا وقار
عہدِ افرنگ کی ہر شاخ چمن ٹوٹ گئی
وقت اک قافلہ ہے، قافلہ سالار ہے تو
ہاتھ اُلجھے ترے شاہوں کے گریبانوں سے
آئینہ لاکھ ہو تصویر بدل جاتی تھی
تیرے نعمات کبھی دار و رسن گائیں گے
تو خریدانہ گیا مصر کے بازاروں میں
تو نہ ہوگا تو مسلمان بدل جائیں گے

تیری آواز سے ہے زلزلہ کہساروں میں
تو نے آباد کئے سینکڑوں ایماں کے دیار
تو نے دیکھا تو زمانے کی نگاہیں بدلیں
تیرا اندازِ خطابت ہے پیمبر کا سنگھار
تیری اک ضرب سے زنجیر کہن ٹوٹ گئی
شاہِ گفتار ہے تو صاحبِ کردار ہے تو
جب بھی ٹکرایا کبھی کفر کے ایوانوں سے
تیری تقریر سے تقدیر بدل جاتی تھی
پھر سے منصور کا اندازِ سخن پائیں گے
گرچہ فرعون رہے تیرے خریداروں میں
تجھ سے تاریخ کے عنوان بدل جائیں گے

وقت دُہرائے گا اس دور کے افسانے کو
عقل خود چاہے گی جانباز سے دیوانے کو



باب اول

خاندانی پس منظر، ولادت، تذکرہ والدین،
اور تعلیم و تربیت

شورش کاشمیری مرحوم نے مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کی سوانح حیات، خاندانی پس منظر اور اس موضوع سے متعلق بعض سوالات کئے تو مولانا آزاد نے فرمایا :

”ایک زمانے میں سوانح نگاری بعض خاص چیزوں کا نام تھا۔ تب شخصی حالات اور ان کے متعلقات کو اہمیت حاصل تھی۔ اب وہ نقطہ نگاہ نہیں رہا۔ آخر اس میں رکھا ہی کیا ہے کہ شرف و مجد کی وہ چیزیں تلاش کی جائیں کہ جس شخصیت کا تذکرہ مقصود ہو وہ ان بیساکھیوں پر چلے یا بعض بڑے ستونوں سے نسبت دیکر اس کی فضیلت قائم کی جائے۔ اصل چیز علم و عمل کے آثار و مظاہر ہیں۔ ابو جہل قریش کے رؤساء میں سے تھا اور کی تھا لیکن بلالؓ حبش کا ایک کالا کلونا غلام تھا۔ پھر تاریخ کا فیصلہ موجود ہے کہ شرف کس کو حاصل ہوا؟۔ اور

خاسر کون رہا؟ اگر معیارِ عزت زمین، جائیداد، بینک بیلنس یا خاندان و قبیلہ ہوتا تو ابو جہل کے بدن پر قبائے فضیلت ہوتی لیکن تاریخ کی ترازو مختلف ہے نتیجہً حضرت بلالؓ کے سر پر کلاہ افتخار ہے اور ابو جہل کے سر پر دھول اڑ رہی ہے۔ (ابوالکلام آزاد ص ۳۳)

امت مسلمہ کا شیرازہ بکھیرنے والی لعنت برادری ازم اور اپنے آباؤ اجداد پر بے جا فخر و مباہات کرنا ہے خود حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا عمل شاہد ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو قبیلہ پسندی سے بلند رکھا۔ آج ہم ہیں کہ کئی ٹکڑوں میں بٹ چکے ہیں.....

حیرت نہ کر بدن کو میرے چور چور دیکھ کر
ان رفعتوں کو دیکھ جہاں سے گرا تھا میں

آج دولت، بینک بیلنس، جائیداد، کار، کوٹھی اور کارخانے شرافت و عزت کا معیار بن چکے ہیں۔ دولت آتے ہی حسب و نسب بدل جاتے ہیں۔ غربت کے وقت حقیقی باپ دادا کا نام لیا جاتا ہے اور مال و دولت کے آتے ہی شیخ سے مغل، مغل سے پٹھان، پٹھان سے سید بن جانا عام روٹین ہے اکبر الہ آبادی مرحوم نے آج سے ساٹھ ستر سال قبل فرمایا.....

طے کرو صاحب! نسب نامہ وہ وقت آیا ہے اب
بے اثر ہوگی شرافت، مال دیکھا جائے گا

خاندانی پس منظر :

امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے۔ سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہ جیؒ کا سلسلہ نسب اُنٹالیس ویں (۳۹) پشت میں

حضرت امام حسنؑ سے ملتا ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالغفار بخاریؒ بخارا سے کشمیر آئے۔ سید عبدالغفار امام حسنؑ کی چوبیسویں اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تیرہویں پشت سے تھے۔ شاہ جیؒ ننھیال کی طرف سے بھی سید تھے۔ شاہ جیؒ کی والدہ سیدہ فاطمہؒ بی بی حکیم سید احمدؒ کی صاحبزادی تھیں۔

امیر شریعتؒ عین اسلامی اصولوں کے مطابق کبھی بھی نسلی برتری، بے جا فخر و مباہات اور قوم و نسب پر فخر کرنے کے جذبہ میں مبتلا نہیں ہوئے۔ البتہ اپنے سید ہونے کا جائز فخر تھا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ**۔ میں اولاد آدم کا سردار بنایا گیا ہوں لیکن اس پر فخر نہیں کرتا۔

احساسِ شرف :

امیر شریعتؒ ایک دن دہلی دروازہ کے باغ میں مدح صحابہؓ پر تقریر کر رہے تھے کسی نے اعتراض کیا شاہ جیؒ! غضب کرتے ہو سید ہو کے ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کی مدح؟ شاہ جیؒ جذب میں آگئے اور اپنے گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ تم کون ہو مجھے ٹوکنے والے، جاؤ؟ میں علیؓ کا بیٹا، ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدح کرتا ہوں۔ یہ علیؓ کا بیٹا ہی جانتا ہے کہ ان کا رتبہ کیا ہے۔ ایرے غیرے کیا جانیں کہ شیخین کا مقام کیا ہے۔

جگر شق ہو جائے گا :

شورش کشمیری بیان کرتے ہیں : ایک دفعہ میں نے عرض کیا شاہ جیؒ! سانحہ کربلا پر تقریر فرمائیے۔ کہنے لگے اس موضوع پر تقریر نہیں کر سکتا میرے خاندان پر جو بیتی ہے بیان کروں تو خود میرا جگر شق ہو جائے گا۔ عام تقریروں میں جب کبھی اس

حادثہ کا ذکر کرتے تو ایک آدھ روایت ہی سے لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں۔

(سوانح و افکار ص ۵۴)

رشد و ہدایت کا محور :

جانبا زمر زار قم طراز ہیں۔ تاریخ جن لوگوں کو اپنی تکمیل کے لیے منتخب کرتی ہے لازم نہیں کہ ان کی نسبت کسی اونچے اور اعلیٰ خاندان سے ہو۔ بلکہ ماضی بعید میں جن لوگوں نے تاریخ کے صفحات پر اپنے ان مٹ نقش چھوڑے ان کے آباؤ اجداد کو وقت کے حاکمانہ وقار نے کبھی نظر التفات سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ لیکن جھونپڑیوں میں پرورش پانے والوں نے جب محلات پر کمندیں ڈالیں تو شاہی تاج ان کے قدم چومنے لگا۔ اور فرمان روائی ان کی عبائیں اٹھائے پھری۔ سید عطاء اللہ بخاری نے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا جو روحانی دنیا میں رشد و ہدایت کا صدیوں سے محور رہا۔ (حیات امیر شریعت ۲۳)

سید ضیاء الدین :

امیر شریعت کے والد کا نام سید ضیاء الدین شاہ تھا۔ تجارت پیشہ تھے۔ اور اپنے چچا حافظ حیدر شاہ بخاری کے ساتھ پشمینے کی سوداگری کرنے اپنے گاؤں ناگریاں ضلع گجرات سے بہار کے مشہور شہر پٹنہ میں اکثر جایا کرتے تھے۔

ایک ہی رکعت میں سارا قرآن کریم سنا دیا :

جانبا زمر زار لکھتے ہیں : امیر شریعت کے والد محترم حافظ ضیاء الدین حافظ قرآن تھے۔ انہیں قرآن کریم پڑھنے اور سنانے کا اس قدر شوق تھا کہ ایک دفعہ محلہ

چوک بازار پٹنہ میں ملک عنبر کی مسجد میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں شبینہ کے روز نماز عشاء کے وقت پتہ چلا کہ آج تین حافظ باہم مل کر قرآن کریم ختم کریں گے تو غصہ میں کہا۔ یہ کیا حرکت ہے؟ ایک ہی آدمی کو قرآن کریم ختم کرنا چاہیے۔ اس پر دوسرے حافظ نے طنزاً کہا تو پھر یہ کام آپ ہی کریں۔ بہت اچھا۔ یہ کہہ کر مسجد سے چلے آئے۔ گھر آئے تو چہرے پر تقیر کے آثار دیکھ کر سید حیدر شاہ نے فرمایا کیا بات ہے حافظ جی؟ کچھ کھوئے کھوئے سے دکھائی دیتے ہو۔ اس پر مسجد کا سارا واقعہ کہہ دیا۔ حیدر شاہ نے فرمایا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے اللہ کا نام لیکر شروع کر دینا۔ چنانچہ رات کو جب قرآن کریم پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو پہلی رکعت میں چھبیس پارے ختم کر دیئے۔ اس طرح ایک دفعہ ایک رات میں ایک ہی رکعت میں سارا قرآن کریم سنا دیا تھا۔ (حیات امیر شریعت ص ۲۷)

حضرت شاہ صاحب کے والد حافظ ضیاء الدین ۱۹۴۹ء میں فوت ہوئے، جب شاہ جی کو اپنے والد محترم کے انتقال کی خبر پہنچی تو ایک سرد آہ بھری، لئالہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا:

”واہ رے عطاء اللہ! اب تمہیں عطاء اللہ کہہ کر بلانے والا کوئی

نہیں، سب امیر شریعت اور شاہ جی کہنے والے رہ گئے۔ وہ میرے

باپ بھی تھے، استاذ بھی تھے اور یار بھی تھے“۔ (سیدی وانی ص ۵۲)

والدہ محترمہ :

امیر شریعت کی والدہ محترمہ کا نام فاطمہ بی بی تھا جو پٹنہ کے دین دار صاحب فکر

حکیم سید احمد کی صاحبزادی تھیں۔

سوتیلی ماں کا احترام :

ام کفیل بخاری رقمطراز ہیں کہ :

”اباجی (امیر شریعتؒ) نے حقیقی ماں تو گویا دیکھی ہی نہیں، داداجی نے دوسرا نکاح اس وقت کیا جب اباجی کی عمر نو دس سال کے درمیان تھی، اباجی نے سوتیلی والدہ کا ادب بھی ویسے کیا جیسا اپنی حقیقی والدہ زندہ ہوتیں تو کرتے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اباجی کو سوتیلی ماں کے پاؤں اپنے چہرے پر ملتے دیکھا ہے۔“

(سیدی وانی ص: ۵۱)

ولادت :

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ یکم ربیع الاول ۱۳۱۰ھ بمطابق ۱۸۹۱ء پٹنہ میں پیدا ہوئے جب آپ کی عمر چار سال ہوئی تو آپ کی والدہ محترمہ فوت ہو گئیں یوں بچپن ہی میں امیر شریعتؒ ماں کی شفقتوں سے محروم ہو گئے۔

بچپن :

شاہ جیؒ اپنے بچپن کے متعلق خود فرمایا کرتے تھے کہ مجھے بچپن میں پٹنگ اڑانے کا بہت شوق تھا۔ قرآن کریم اور دوسری تعلیم سے ذرا فرصت ملتی اور والد صاحب کہیں کام کے لیے گھر سے نکلے تو ماموں کو ساتھ لیا اور جھٹ سے چھت پر جا چڑھے پٹنگ کا شغل شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ آمنے سامنے پیچ لڑ رہے ہیں۔ دونوں طرف سے ڈور ہلائی جا رہی ہے کہ اتنے میں والد صاحب تشریف لائے بس پھر کیا تھا

وہیں ہاتھ سے ڈور توڑ کر نیچے بھاگ آئے۔ اب ایک طرف پتنگ کٹی جا رہی ہے اور دوسری طرف مد مقابل شکست کی آوازیں لگا رہے ہیں مگر ہو بھی کیا سکتا تھا۔ آنکھیں پتنگ کی طرف، کان دشمنوں کی آوازوں پر اور دل میں خوف کہ کہیں ابا نے دیکھ پایا اور اگر پتہ چل گیا تو پھر جو پٹائی ہوگی وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

پیار و محبت کا حصار :

جانناز مرزا فرماتے ہیں :

”والدہ کی موت کے بعد شاہ جیؒ کو ماں کا پیارا اور ان کی ذمہ داریاں صرف والد کے پیار میں تلاش کرنی پڑیں۔ چنانچہ باپ نے فرزند کے گرد پیار و محبت کا ایک ایسا حصار تعمیر کیا جس میں علم دین کی تکمیل ہو سکے۔ یہ وہ دور تھا کہ اس میں انگریزی تعلیم مذہب سے لگاؤ رکھنے والے لوگوں کے نزدیک اخلاقی طور پر جرم سمجھی جاتی تھی۔ نیز شرفا کے ہاں بچوں کی ابتدائی تعلیم گھروں میں تکمیل پاتی تھی۔ چونکہ عربی اور فارسی خود شاہ جیؒ کے اپنے گھر کی تعلیم تھی۔ نانا اور نانی معلم بنے، باپ نے نگرانی کی اور پھر شاد کی ادبی محفلوں نے اس سونے کے نکھار میں سہاگے کا کام کیا۔ والد صاحب کا شوق تھا کہ بیٹا ان کی طرح حافظ قرآن ہو، چنانچہ کاروبار کے علاوہ وقت کا اکثر حصہ شاہ جیؒ کو قرآن پڑھانے میں صرف کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ جیؒ کو قرآن سے عشق ہو گیا اور ہر وقت کتاب اللہ کو سینے سے لگائے رکھتے۔ شاہ جیؒ کو کتاب اللہ وراثت میں ملی تھی۔ نہال کا گھرانا بھی

دین مبین سے نا آشنا نہیں تھا۔ والدہ محترمہ قرآن کی حافظہ، والد صاحب کا سینہ بھی اس خزینے سے مالا مال تو پھر بیٹا اس دولت سے کیوں کر تہی دامن رہ سکتا تھا۔ دو سال میں قرآن کریم ازبر کر لیا۔ خود شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ ”میں اکثر ظہر اور عصر کے درمیان قرآن کریم ختم کر لیا کرتا تھا“۔ (حیات امیر شریعت ص ۳۱)

تعلیم و تربیت :

شورش کاشمیری رقم طراز ہیں۔ خواجہ باقی باللہ علوم متداولہ حاصل کر رہے تھے کہ ایک مجذوب صدا دیتا ہوا گزرا.....

درکنز و ہدایہ نتواں دید خدارا

آئینہ دل بین کہ کتابے بہ ازیں نیست

(ہدایہ اور کنز کی کتب میں خدا کا دیدار حاصل نہیں ہوتا دل کے آئینہ کو دیکھو کہ اس سے کوئی دوسری بہتر کتاب نہیں) خواجہ باقی باللہ نے کتابوں کو طاق پر رکھا اور کتابِ دل سے معاملہ کر لیا حضرت امیر شریعتؒ بھی کسی باقاعدہ مدرسے کے طالب علم نہ تھے۔ اور نہ علوم متداولہ کے سند یافتہ تھے لیکن آئینہ دل بین کہ کتابے بہ ازیں نیست“ سے حصہ وافر پایا تھا۔ شاہ جی ان لوگوں میں سے تھے جو مادر زاد عبقری ہوتے اور جن کی تربیت مبداء فیاض کرتا ہے۔ اس ضمن میں چند باتیں واضح ہیں مثلاً:

(۱) ان کی والدہ جب رحلت کر گئیں تو ان کی عمر چار سال تھی نانی اماں نے آغوش میں لے لیا۔ ان حالات میں وہ بہ ہمہ وجوہ مدرسہ کی تعلیم سے محروم ہو گئے۔

(۲) انگریزی مدرسوں میں ان کے داخلہ کا سوال ہی نہ تھا۔ کیونکہ جس خاندان

سے متعلق تھے وہاں انگریزی مدرسوں میں داخلہ خارج از بحث تھا۔

(۳) اس زمانہ میں ایک خاص عمر تک شرفاء کے بچے گھروں ہی میں تعلیم حاصل کرتے اور بڑی بوڑھیوں سے زبان و محاورہ سیکھتے تھے۔

شاہ جیؒ کی بیٹی صادقہ بانو نے لکھا ہے کہ ابا جیؒ نے فارسی کتابیں ننھیال ہی میں پڑھیں۔ خواجہ عنبر کی مسجد میں ایک مولوی صاحب سے دینی کتابیں پڑھیں۔ پنجاب آگئے تو گھر سے نزدیک موضع راجوالی میں قاضی عطا محمدؒ کے ہاں پڑھنے جاتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں امرتسر کی سکونت اختیار کی تو وہاں حضرت مولانا نور احمدؒ سے تفسیر قرآن پڑھی۔ امرتسر میں مدرسہ نعمانیہ مسجد خیر الدین میں مشکوٰۃ شریف پڑھتے رہے۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ سے فقہ اور حضرت مفتی محمد حسنؒ سے حدیث (مسلم شریف) پڑھتے رہے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمان مکیؒ سے بھی استفادہ کیا۔ قرآن پاک دادا جی (حافظ ضیاء الدینؒ) سے حفظ کیا۔ دادا مرحوم دو یا تین بجے شب جگا دیتے۔ دو پارے منزل سنتے اور سلا دیتے۔ پھر نماز فجر کے لیے اٹھاتے۔ نماز پڑھ لیتے تو پھر سبق ہوتا۔ (سوانح و افکار ص ۴۴)

تسلا ناراً حامیہ :

جناب امین گیلانی رقمطراز ہیں کہ حکیم غلام نبی صاحب نے مجھے یہ واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ : ”میں اور شاہ صاحبؒ دونوں ہم سبق تھے اور حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ سے پڑھتے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا، ایک روز غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: غلام نبی! دیکھو وہ کونے میں تسلا (لوہے کی کڑا ہی) پڑا ہے لے جاؤ اور ہمارے گھر جا کر استانی صاحبہ سے کہہ دو کہ انگاروں سے بھریں۔“

آج بہت سردی ہے، کمرہ گرم کر لیں۔ میں نے جھٹ وہ تسلا اٹھایا، گھر گیا، دہکتے ہوئے کوئلے بھروا لیئے اور تسلا کناروں سے پکڑ کر اٹھایا، کلاس کی طرف بھاگا مگر عین کلاس کے آگے پہنچ کر میرے ہاتھ اتنے جلے کہ میں نے ایک چیخ مار کر تسلا زمین پر رکھ دیا۔ میری چیخ سن کر سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ حضرت مفتی صاحب نے دیکھا، میں تکلیف سے ہاتھ مل مل کر پہلو بدل رہا تھا، سید عطاء اللہ شاہ بخاری قوی ہیگل بھی تھے اور جی دار بھی، فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور تسلا اٹھایا ہی تھا کہ وہ مزید تپ چکا تھا، انہوں نے اٹھا تو لیا جب ہاتھ جلے تو فوراً زور سے آگے کی طرف پھینک دیا اور بلند آواز سے کہا تسلا ناراً حامیہ تسلا پھینکنے سے وہ سارے دہکتے ہوئے کوئلے بکھر گئے، یہ منظر دیکھ کر ساری کلاس ہنس پڑی، حتیٰ کہ مفتی صاحب بھی تسلا ناراً حامیہ کا برجستہ جملہ سن کر مسکرا دیے۔ (بخاری کی باتیں، ص: ۱۲۵)

اندازِ تربیت :

شاہ جی کی بیٹی ام کفیل بخاری راویہ ہے کہ ابا جی ایک واقعہ سنایا کرتے تھے

کہ :

”ایک دن مولانا نور احمد پسروری سے سبق پڑھ کر اقامت گاہ کو جا رہے تھے

، راستے میں ریڑھی پر سنگترے پک رہے تھے، چند سنگترے خریدے، چھیل کر ایک

پھانک (قاش، ڈلی) منہ میں ڈالی، دوسری ہاتھ میں تھی کہ پیچھے سے کسی نے کندھے پر

ہاتھ رکھا اور کہا حافظ جی! بازار میں کھڑے ہو کر کھانے والے کی گواہی شریعت میں

معتبر نہیں (وہ استاذ حضرت مولانا نور احمد تھے) وہ پھانک گلے میں پھنستی محسوس ہوئی،

پھر بازار میں کھڑے ہو کر کبھی نہیں کھایا۔ (سیدی و ابی، ص: ۵۳)

باب دوم

شخصیت و کردار، عادات و اطوار، فقر و روشنی

مصائب و مشکلات اور عفو و درگزر

ایک نامعلوم اندھیرے کی طرف سے ایک معلوم روشنی کی طرف انسان آتا ہے اور پھر ایک نامعلوم اندھیرے کی طرف آگے بڑھ جاتا ہے، درمیان میں ایک معلوم روشن گزرگاہ ہے جسے ہم دنیا کہتے ہیں، اسے بھی سورج کی روشنی میسر ہے۔ بس اسی روشنی کی مدد سے اس گزرگاہ پر چلنے والے راہی ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں، جب یہ لوگ سورج سے اوجھل ہو کر تہہ خاک چلے جاتے ہیں تو چند دنوں بعد کسی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ اس زمین کی اوپر کی سطح پر کبھی کوئی شخص رہتا تھا یا نہیں۔ لیکن جو لوگ سورج کی روشنی کے علاوہ اپنی شخصیت و کردار اور عادات و اطوار کے اُجالے میں بھی پہچانے جاتے ہیں وہ اگر سورج کی روشنی سے اوجھل بھی ہو جائیں تو بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتے ان کے سیرت و کردار اور عادات و اطوار کا اجالا اتنا دلنشین ہوتا ہے کہ آنکھ کی پتلی چاہے ان کو نہ دیکھے لیکن دل کی فضا میں وہ مدتوں تک آباد رہتے ہیں۔

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جنہوں نے زمانے کی تختی پر اپنا نام اپنے کردار کے قلم سے کندہ کر دیا۔
ذیل میں حضرت امیر شریعتؒ کی شخصیت و کردار، سادگی، فقر و درویشی، صبر و تحمل اور عفو و درگزر کے واقعات درج کر کے ان کی شخصیت کی عکاسی کی گئی ہے۔

چہرے کا تقدس :

گوجرانوالہ کے معروف کارکن غلام نبی صاحب نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ۱۹۵۳ء میں ختم نبوت کی تحریک میں شاہ جیؒ کے ساتھ میں بھی کراچی میں تھا۔ وہاں ایک انگریز افسر بھی اسیری کے دن گزار رہا تھا، وہ انگریز جب شاہ جیؒ کو دیکھتا تو اردو میں کہتا، باپ سلام، ایک روز شاہ جیؒ نے پوچھا، تم مجھے باپ کیوں کہتے ہو؟ اس نے کہا آپ کے چہرے کا تقدس دیکھ کر حضرت مسیح یاد آ جاتے ہیں۔ اس مناسبت سے باپ کہنا پسند کرتا ہوں۔ شاہ جیؒ نے مصنوعی برہمی کے انداز میں کہا، یہ بات ہے تو آئندہ مجھے باپ مت کہتا۔ وہ انگریز کچھ شرمندہ اور سراسیمہ سا ہو کر بڑے ادب سے بولا: کیوں باپ؟ شاہ جیؒ نے کہا پھر وہی باپ؟ ایک باپ کو تو پہلے سولی پر لٹکا دیا۔ اب مجھے باپ باپ کہہ کر سولی پر لٹکانے کا خیال ہے، وہ انگریز مسکرایا اور کہا: باپ ! میں اس باپ کو سولی پر لٹکانے والوں میں سے نہیں۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۴۲)

لباس :

اوائل جوانی میں جب آپ بہار سے پنجاب آئے تو تنگ موری کی بہاری طرز کی شرعی شلووار، گھٹنوں تک گول آستین کا لمبا کرتہ، سبز رنگ کی پگڑی اور پاؤں میں

سرخ بہاری قسم کی جوتی پہن رکھی تھی، پھر جیسے جیسے پنجابی طرز تمدن قبول کرتے گئے لباس میں تبدیلی آتی گئی، اسی طرح کبھی تہبند اور کبھی کھدر کی شلووار پہنتے۔ طالب علمی کے زمانے میں سر پر لنگی اور کھدر کے نیلے رنگ کا تہبند عام استعمال کرتے تھے۔ آگے چل کر کھلی آستین کا کھدر کا لمبا کرتہ پہنتے تھے۔ اس نسبت سے اس زمانے کا کھدر اس قدر مقبول ہوا کہ بخاری کھدر کے نام سے مشہور ہو گیا۔ موسم سرما میں کھدر کا لمبا شیروانی نما کوٹ اس پر کبھی کبھار کابلی گرم عبا پہنتے، سر پر اتار کر ترک طرز کی ٹوپی پہنتے۔

احرار کانفرنسوں میں شمولیت کے وقت سیاہی مائل سرخ رنگ کا کرتہ پہنتے جو

احرار رضا کاروں کا امتیازی نشان تھا۔

ٹوپی نہیں پہنوں گا :

ایک زمانہ میں ٹوپی پہننا چھوڑ دی۔ کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا پہلی دفعہ جیل گیا تو جیلر نے ہاتھ بڑھا کر ٹوپی اتارنا چاہی میں نے اس کا ہاتھ روک لیا اور خود ٹوپی اتار کے اس کے حوالے کر دی تب سے فیصلہ کیا ہے کہ ٹوپی نہیں پہنوں گا۔ بس یہ چوگوشہ رومال سر پر رکھتا ہوں۔

بھائی حضور ﷺ کا لباس ہے :

شورش کاشمیری بیان کرتے ہیں :

میں نے عرض کیا : شاہ جی ! آپ تو گرتے کے ساتھ شلووار پہنا کرتے

تھے لیکن کچھ دنوں سے آپ نے تہبند پہننا شروع کر رکھا ہے فوراً ہی بات کاٹ لی فرمایا

بھائی حضور ﷺ کا لباس ہے۔ میاں (صلی اللہ علیہ وسلم) پہنتے تھے۔ (سوانح و افکار ص: ۱۹)

بخاری ڈنڈے والا :

شاہ جی ! ابتداء (۱۹۲۱ء) میں ہاتھ میں موٹا ڈنڈا رکھتے تھے، اس نسبت سے ایک عرصے تک عوام میں ”بخاری ڈنڈے والا“ مشہور رہے، لیکن جب چودھری افضل حق نے پنجاب اسمبلی سے مسلمانوں کے لئے تلوار رکھنے کا عام قانون منظور کرایا تو امیر شریعت نے ڈنڈے کی بجائے تلوار پکڑ لی۔ ۱۹۳۷ء میں جب مجلس احرار نے اپنے رضا کاروں کے لئے کلہاڑی کو اپنا جماعتی نشان قرار دیا تو دم واپس سے کچھ عرصہ پیشتر تک ہاتھ میں کلہاڑی رکھتے رہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں بید کا کھونٹا بطور سہارا رکھے رہے۔

بابا پھر آگئے :

شاہ جی نے ایک دن فرمایا: میں ایک دفعہ علی الصبح ڈیرہ اڈا جہاں ڈیرہ غازی خان کی بسیں چلتی ہیں پہنچا، ٹکٹ کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالے تو بٹوہ موجود نہ تھا۔ خیال آیا، بٹوہ تو میں چارپائی پر بھول آیا ہوں۔ بس تیار کھڑی تھی، اچانک میری نظر ایک پان والے پر پڑی، وہ دکان کھول کر صفائی وغیرہ میں مصروف تھا، ان دنوں میرے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا ہوتا تھا، میں لپک کر اس کی دکان پر پہنچا اور اپنا ڈنڈا اس زور سے زمین پر مارا کہ وہ لرز گیا اور میری طرف دیکھا، میں نے جلالی روپ بنا کر رعب سے کہا جلدی نکالو دس روپے وہ بے چارا ایسا خوف زدہ ہوا کہ بغیر چوں و چرا کے دس روپے نکال کر مجھے دے دیے۔ میں جلدی سے گیا اور ٹکٹ خرید کر بس میں جا بیٹھا۔ دوسرے دن جب میں ڈیرہ سے واپس اسی اڈے پر پہنچا تو میں نے دس روپے جیب سے نکالے اور پان والے کو دینے کے لئے دکان کے قریب پہنچا تو وہاں

کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے، پان والے نے سہمے ہوئے انداز میں ان سے کہا، اوہو، لو وہ بابا پھر آ گیا، ان لوگوں میں سے کچھ نے مجھے پہچان لیا اور ملنے کے لئے آگے بڑھے، میں نے ان سب کو اصل واقعہ بتایا، سب ہنس پڑے۔ اب وہ پان والادس روپے واپس نہیں لیتا تھا، میں نے اُسے سمجھایا کہ بیٹا میں نے اُدھار کی نیت سے لیے تھے اور اس وقت میں نے مجبوری سے یہ ڈرامہ رچایا تھا، پھر اس نے روپے واپس لے لئے۔

(بخاری کی باتیں ص: ۱۶۱)

خوراک :

گھر ہوتے عموماً چنے کی دال کو دوسرے کھانوں پر ترجیح دیتے، سفر کے دوران خوراک میزبان کی مرضی پر چھوڑ دیتے، سفارش پر کبھی کھانا نہیں پکوا یا۔ سادے چاول زیادہ مرغوب تھے، لیکن دردِ گردہ کے باعث بہت کم استعمال کرتے تھے، بعض دیہاتوں میں پیاز اور باسی روٹی نمکین لسی کے ساتھ بھی پسند کرتے، لیکن جسم بُلغمی ہونے کے باعث لسی ان کے لئے نقصان دہ تھی، گائے کے گوشت سے ہمیشہ اجتناب رہا، مرغن غذاؤں سے نفرت نہیں تھی لیکن پسند نہیں کرتے تھے، میزبان کو اکثر اس پر ڈانٹ دیا کرتے تھے۔

جلسوں یا کانفرنسوں کے موقعہ پر صرف ایک کھانا پکانے کی تاکید کرتے۔

سبزیوں میں شلجم، سرسوں کا ساگ اور گھٹیا شوق سے کھاتے۔ بیٹھی اشیاء

خاص کر حلوہ مرغوب نہیں تھا، فرمایا کرتے، یہ مولویوں کے منہ پر سیمنٹ کا کام دیتا ہے یعنی حلوہ خور مولویوں کے منہ سے حق بات نہیں نکل سکتی۔

پھلوں میں آم سے زیادہ محبت تھی، اور خر بوزہ بہت کم کھاتے تھے۔ امیر شریعت

کی رائے میں خر بوزہ کے بکثرت استعمال سے گلے پر برا اثر پڑتا ہے، جب کبھی آواز دب جاتی تو کچا مرد یا مرد کے پتے اُبال کر ان کا پانی استعمال کرتے۔

چائے کا سامان :

انسانی عادات قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ لیکن حضرت امیر شریعتؒ کو اپنی قوت ارادی (WILL POWER) کی وجہ سے اپنی عادات پر خاصا قابو تھا۔ لیکن عام عادات جو ان کی جزو زندگی بن چکی تھیں، ان کے ہاتھوں مجبور تھے۔ مثلاً جیل میں ہوں یا ریل میں، نماز صبح سے پیشتر چائے بغیر دودھ کے ضرور پیتے۔ چنانچہ چائے کا سامان (سٹوو، مٹی کا تیل، بہترین چائے کی پتی، چینی، نمک، فنجان اور ایک چھوٹا چمچ) سفری بکس میں ہمیشہ ساتھ رہتا۔ کبھی کبھار شہروں میں اگر اچھی چائے نایاب ہو جاتی، تو دیہاتوں کے سفر میں اس کی تلاش کرتے جو اکثر مل جاتی۔

غیبت سے نفرت :

کبھی کسی دوست کی غیبت نہ کی اور نہ کسی دوست کی غیبت سنتے تھے۔ جو لوگ اُن سے شدید اختلاف رکھتے مگر مخلص تھے ان کی جی جان سے عزت کرتے آنکھوں پر بٹھاتے ذاتی دوستوں میں کئی ایسے تھے جن کی سیاسی راہیں مختلف تھی لیکن ان سے ایک گونہ تعلق خاطر تھا۔

فوراً مٹھی کھول دیتے :

بہت سے لوگ آپ کو مشائخ اور پیروں کی طرح چاہتے، عقیدت کا اظہار کرتے، ہاتھ چومتے، نذرانے پیش کرتے، لیکن آپ درویشِ خدامت تھے۔ اگر

کبھی کسی مرید نے چھپ چھپا کر کچھ نذرانہ دینا چاہا تو فوراً مٹھی کھول دیتے.. مزاحیہ انداز میں فرماتے.. کیا حرام کا مال ہے جو چھپا کر دیتے ہو۔

زندگی بھر جو کمایا اس سے امرتسر میں دو مکان خریدے ایک میں خود رہتے دوسرا کرایہ پر دے رکھا تھا۔ لیکن تقسیم پاکستان و ہندوستان کے وقت دونوں متروکہ ہو گئے۔ پاکستان آ کر کسی سرکاری دفتر سے کوئی درخواست، اپیل، التجا اور گزارش نہیں کی حتیٰ کہ متروکہ جائیداد کے کلیمز بھی داخل نہ کیے۔

عجیب بوٹا :

حضرت امیر شریعتؒ کے پاس ایک عجیب و غریب بوٹا تھا جس میں ایک مجذوب کی دی ہوئی پائیاں اور دھیلے موجود تھے۔ خود فرماتے کہ ان کی برکت سے میرا بوٹا کبھی خالی نہیں رہا۔ دولت کے معاملے میں خود بھی مجذوب تھے۔

(سوانح و افکار ص: ۶۲-۶۵)

آراضی کی پیشکش :

جانبا زمر زار قم طراز ہیں :

ملتان کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مختار مسعود نے اپنے ایک قریبی دوست کی وساطت سے امیر شریعتؒ سے ملنے کی خواہش کی۔ اس کے امیر شریعتؒ سے گہرے مراسم تھے.. چنانچہ اس دوست نے امیر شریعتؒ سے ڈپٹی کمشنر کی خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا کسی دن چلیں گے آخر اتوار کا دن مقرر ہوا۔

امیر شریعتؒ حسب وعدہ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر پہنچے مسٹر مختار مسعود بڑے خوش ہوئے اور امیر شریعتؒ کی آمد پر اپنے کمرے کو خاص انداز سے آراستہ کیا۔ امیر شریعتؒ

جیسے ہی کار سے اترے ڈپٹی کمشنر پزیرائی کے لئے آگے بڑھے۔ کمرے میں بیٹھتے ہی ہمہ اقسام کے مشروبات سامنے لائے گئے لیکن امیر شریعتؒ نے فرمایا! بھائی میرے لئے تو سادہ اور ٹھنڈا پانی منگوا دو بڑی مہربانی ہوگی۔ ڈپٹی کمشنر نے بہ اصرار کہا یہ سارا کچھ بھی تو سادہ ہے اس پر امیر شریعتؒ نے فرمایا! اس سادگی پر مجھے غالب کا ایک شعر یاد آ گیا.....

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

میز مشروبات سے سجا رکھی ہے، ساغر و مینا کا سماں باندھ رکھا ہے، اور ابھی

یہ سارا کچھ سادہ ہے۔ سبحان اللہ۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد فرمایا! آپ کا حکم نامہ ملا تو سوچا چلو

اسی بہانے اپنا ایک کام ہی کرتا آؤں۔ اس فقرے سے ڈپٹی کمشنر کو گمان ہوا کہ شاہ جیؒ

کوئی ذمہ داری بات کہنے لگے ہیں چنانچہ بڑی بے تابی سے ڈپٹی کمشنر نے کہا فرمائیے.....

امیر شریعتؒ نے چند کاغذات نکال کر ان کے سامنے رکھے اور فرمایا۔ سارے

مغربی پاکستان میں تحفظ ختم نبوت کے دفاتر حکومت نے واگزار کر دیئے ہیں لیکن ملتان

کا دفتر ہنوز سر بہ مہر ہے اگر آپ یہ دفتر کھولنے کی اجازت دے دیں تو میں ممنون

ہوں گا۔ اس کے جواب میں ڈپٹی کمشنر نے کہا.. شاہ جیؒ! یہ کام تو صوبائی حکومت کی

پالیسی سے تعلق رکھتا ہے البتہ میرے بس میں تو یہ ہے کہ میں آپ کو چھ سات مربعے

ارضی دے سکتا ہوں اور اس میں ٹیوب ویل کا انتظام بھی کر سکتا ہوں۔ اس پر

امیر شریعتؒ مسکرائے اور فرمایا!

مختار صاحب! میں اپنی ذات کے لیے حاضر نہیں ہوا باقی رہے آپ کے

آن میں امیر شریعتؒ کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا اور قاضی صاحب کا ہاتھ بھی پھول کر ڈبل روٹی کی طرح ابھر آیا۔ تقریر سمیٹ لی اور جلسہ ختم کر دیا گیا اس واقعہ نے شہر کے عوام کو پریشان کر دیا اور قاضی جی کا تمام گھر پاگل ہو گیا۔ ڈاکٹر کچھمن داس ریٹائرڈ سول سرجن نے امیر شریعتؒ کو دیکھ کر تشخیص کی کہ انہیں واقعی زہر دے دیا گیا ہے۔ اس وقت پیاز کا پانی بڑی مقدار میں تیار کرایا گیا۔ ڈاکٹر نے اس پانی سے دوا دینا شروع کی تو جسم سے زہر کا رنگ پیشاب اور پاخانے کے راستے خارج ہونا شروع ہوا۔ پیاز کے مسلسل استعمال سے رات تین بجے تک جسم کا تمام زہر خارج ہو گیا۔ اس دوران ڈاکٹر کچھمن داس امیر شریعتؒ کے سر ہانے بیٹھے رہے آخر ساڑھے تین بجے رات ڈاکٹر نے قاضی صاحب کو مبارکباد دی کہ اب شاہ جیؒ خطرے سے باہر ہیں۔

زہر دینے والے کو پولیس صبح ہونے تک گرفتار کر چکی تھی۔ اس کا نام سید عنایت اللہ شاہ یا ولایت شاہ تھا۔ بہر حال جب اسے امیر شریعتؒ کے سامنے لایا گیا تو امیر شریعتؒ نے اپنے زہر دینے والے سے مخاطب ہو کر صرف اتنا کہا :

”بھائی! میں نے آپ کا کیا نقصان کیا تھا“۔ پھر پولیس افسر سے کہا میں اس سے کوئی انتقام لینا نہیں چاہتا.. اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائیں۔ آپ بھی معاف کر دیں۔ (حیات امیر شریعت ص: ۱۵۳)

چائے نہیں زہر ہے :

امین گیلانی راوی ہیں :

مارشل لاء اٹھنے کے بعد مجلس احرار اسلام کے لئے لاہور میں میٹنگ ہوئی، کچھ دوستوں میں شاہ جیؒ کی باتیں چل پڑیں۔ مولانا عبدالرحمن صاحب میانوی،

مولانا ابو ذر بخاریؒ نور احمد صاحب آزادؒ کچھ اور دوست اور راقم الحروف بیٹھے تھے، تو ایک صاحب نے جو بحیثیت کارکن کسی شہر سے احرار کی میٹنگ میں نمائندہ بن کر آئے تھے، انہوں نے واقعہ سنایا افسوس کہ کسی ضروری کام کے لئے مجھے اٹھنا پڑ گیا، میں ان صاحب کا نام اور پتہ دریافت نہ کر سکا۔ بہر حال انہوں نے سنایا کہ ایک دفعہ شاہ جیؒ ہمارے ہاں تشریف لائے، تقریر کے بعد ہمارے مکان پر ہی قیام فرمایا۔ شاہ جیؒ لیٹے ہوئے تھے اور میں انہیں دبا رہا تھا کہ گھر سے چائے بن کر آگئی۔ میں نے چائے پیش کی تو آپ نے فوراً اسے سونگھا اور فرمایا: کیوں جیؒ! ہمارے ساتھ کوئی دشمنی ہوگئی ہے؟ میں نے کہا شاہ جیؒ! خدا نہ کرے۔ فرمایا: تو چائے میں زہر کیوں ملایا گیا ہے؟ میں حیران ہو گیا، میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے کہا: شاہ جیؒ! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ یہاں سب آپ کے خدام ہیں، مگر آپ نے پورے اعتماد سے فرمایا: بھائی! یہ چائے نہیں زہر ہے۔ میں گھبرایا ہوا اندر گیا۔ بیوی سے پوچھا چائے کس نے پکائی؟ اس نے کہا میں نے خود دودھ اپنی بھینس کا ہے۔ میں نے کہا: اللہ کی بندی! شاہ جیؒ فرما رہے ہیں، اس میں زہر ہے، اس نے متعجب ہو کر کہا: خدا نہ کرے ہائے ایسے نیک بندے سے کون ایسا کر سکتا ہے؟ اور پھر ہمیں اپنی جان عزیز نہیں۔ میرے لئے یہ بات معہ بن گئی، مارے ندامت کے قدم بوجھل ہو رہے تھے کہ شاہ جیؒ کو کیسے سمجھاؤں اور کیا منہ دکھاؤں؟ اتنے میں میری بیوی کچھ سوچ کر بولی! اوہو ایک بات ہے سنو تو ہمارے ہاں کھانڈ نہیں تھی، راشن کی کھانڈ ابھی مل نہیں سکتی تھی، میں نے پاؤ بھر کھانڈ ہمسایوں سے منگوائی تھی۔ وہ تو آپ کو معلوم ہے مرزائی ہیں، کہیں انہوں نے شرارت نہ کی ہو۔ بس میں سمجھ گیا۔ تحقیق پر یہی معلوم ہوا کہ چینی میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ ہم شاہ جیؒ کی فراست پر

حیران ہوئے اور شکر کیا کہ خدا نے ہمیں ذلت سے بچالیا۔ (بخاری کی باتیں ص: ۸۶)

قاتل سے ملاقات :

جانبا زمر زار قم طراز ہیں :

حالات کی پیشانی شکن آلود تھی، فضاؤں میں انتقامی ارادوں کے تیور ہنوز سرخ تھے کہ امرتسر میں راجندر سنگھ آتش سے پھر ملاقات ہو گئی۔ اس نے امیر شریعتؒ سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن میں اسے طرح دے گیا۔ آخر جب اس کا اصرار بڑھا تو میں اسے امیر شریعتؒ کے مکان پر لے گیا۔ قاتل اور مقتول کا آنا سامنا ہونے سے پیشتر میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، اور اپنی تسلی کے لئے راجندر سنگھ کے جسم کو ہاتھ اور نگاہوں سے کھنگال ڈالا، جس پر وہ مسکرایا، اس کی یہ مسکراہٹ میرے شبہ پر طنز تھی۔

”لباس اور جسم کی تلاشی میں اب کیا رکھا ہے جانبا ز! دل اور آنکھوں میں دیکھو، جن میں ندامت کے کس قدر آنسو ہیں، جو شاہ جیؒ کی بھینٹ کرنے آیا ہوں۔ میں اپنے پر ماتما کی سو گند کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میرے پاپ مجھے پچھیا تاپ کے لئے اس عظیم انسان کے چرنوں میں سیس جھکا دینے کے لئے مجبور کر رہے ہیں کہ جس کی زبان نے میری چھری کو گند کر دیا اور میرے ارادوں کو موت آگئی، ورنہ آج قاتل اور مقتول کا ناٹھ ٹوٹ چکا ہوتا۔“

یہ کہتے ہوئے راجندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور میں نے امیر شریعتؒ کے دروازے پر دستک دی۔

”کون ہے بھائی! اندر آ جاؤ“ یہ امیر شریعتؒ کی آواز تھی، ہم بیٹھک میں

چلے گئے۔ سید امیر شریعت پان بنانے میں مصروف تھے۔

”یہ آپ کا قاتل ہے شاہ جی!“ میں نے عرض کیا۔ امیر شریعت نے ایک نظر

راجندر سنگھ کی طرف دیکھ کر فرمایا :

”ہاں بھائی! ایسے ہی لوگ میرے قاتل ہوتے ہیں“ میں نے اپنے

فقرے کو دوبارہ ذرہ وضاحت سے دہرایا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور متعجب

ہو کر سوال کیا ”کیا مطلب؟“

”یہ راجندر سنگھ آتش ہے، یہ آپ کے حالیہ سفر میں مرزائیوں کی

طرف سے آپ کے قتل پر مامور کیا گیا تھا۔“

”اچھا.... کیوں بابو! یہ درست ہے؟“۔ ”ہاں شاہ صاحب۔“

”تو پھر کوئی چیز مانع رہی۔“

یہ میں نہیں جانتا شاہ صاحب! مگر آپ کے طرز تکلم نے مجھے اس گناہ سے

بچائے رکھا اس پر امیر شریعت نے زور سے قہقہہ لگایا اور راجندر سنگھ کو مخاطب کر کے کہا:

موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے :

”میرا طرز تکلم مجھے کیا بچا سکتا ہے بابو! موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں

ہے۔ یاد رکھو! جو رات قبر کی ہے وہ باہر نہیں آسکتی اور جس رات کو باہر رہنا ہے اسے دنیا

کی کوئی طاقت قبر کے سپرد نہیں کر سکتی۔ البتہ تمہیں میری نصیحت ہے کہ بحیثیت انسان

ہمیشہ انسان کی بھلائی کے لئے سوچا کرو۔ دولت ہاتھ کی میل ہے بابو! اس کے لالچ

میں اگر تم مجھے قتل بھی کر دیتے، اور میرے قتل کے الزام سے تمہارا دامن محفوظ بھی رہتا تو

کسی دوسرے موقعہ پر بغیر جرم کے مار کھا جاتے... خیر!“

امیر شریعتؒ پھر مسکرائے اور قرآن کریم کی چند آیات کا ترجمہ سناتے رہے کہ اتنے میں چائے آگئی۔ راجندر سنگھ امیر شریعتؒ کی گفتگو اور قرآن عزیز کے لفظوں میں اپنے ماضی پر غور کرتا ہوا بے اختیار رونے لگ پڑا اور روتا ہوا امیر شریعتؒ کے قدموں پر گر پڑا۔ امیر شریعتؒ نے فرمایا :

”اپنے رب کے سامنے گرو جو تمہیں معاف کرے.. میں تمہارا

چا کر ہوں بابو! لو چائے پیو۔“

امیر شریعتؒ اور راجندر سنگھ آتش کے درمیان یہ ملاقات مغرب کی نماز تک

رہی۔ (حیات امیر شریعت ص ۱۹۳)

ایک دلچسپ واقعہ :

امیر شریعتؒ اپنی بیمار بیوی کو ڈاکٹروں کے کہنے پر مسوری (ایک پہاڑی مقام ہے) لے گئے۔ جانبا ز مرزا لکھتے ہیں: ایک دن امیر شریعتؒ کی چھ سات سالہ بیٹی گھر سے کھیلنے بازار اتری کہ غائب ہو گئی.. بیٹی کی گمشدگی نے سارے گھر کے ساتھ ساتھ حلقہ احباب کو بھی پریشان کر دیا مسوری کے نشیب و فراز کھنگال ڈالے گئے مگر بیٹی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ بستر پر مریضہ (امیر شریعتؒ کی اہلیہ) کی حرارت بڑھ گئی۔ برطانیہ جیسی سلطنت کو لکارنے والا پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا، دوستوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، اس طرح دن گزر گیا اور شام کے چراغوں نے مسوری کو جگ مگا دیا۔ اتنے میں ایک انگریز خاتون بیٹی کو لیکر گھر پہنچی دیکھتے ہی امیر شریعتؒ نے بیٹی کو سینے سے لگایا اور انگریز خاتون سے غصے اور تلخی میں کہا! تم نے یہ کیا کیا؟ تم کون ہو؟ میرے گھر کا نظام تو نے درہم برہم کر دیا۔ انگریز خاتون امیر شریعتؒ کی یہ گفتگو نہ سمجھ

سکی۔ مگر اس نے انگریزی میں کہا عرصہ ہوا میری بچی جو شکل و صورت میں بالکل ایسی ہی تھی فوت ہو چکی ہے۔ مجھے یہ بچی بہت بھلی معلوم ہوئی میں آپ کی اطلاع کے بغیر اسے لے گئی مجھے معاف کر دیں۔ لیکن آئندہ ہر صبح میں اسے یہاں سے لے جایا کروں گی اور شام کو چھوڑ جایا کروں گی۔ اس پر امیر شریعت نے فرمایا!

تو ماں ہے اگر ماں کے دکھی دل کو میرے دل کے ٹکڑے سے کوئی سکون مل سکتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ دیکھنا کہ اس کی مریض والدہ بھی اس کے سہارے زندہ ہے۔ (حیات امیر شریعت ص ۱۶۱)

بچی کے لئے دُعا :

خانپور کٹورہ کے مشہور کارکن نور احمد صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ شاہ جی خانپور تشریف لائے اور ہمارے ہاں قیام فرمایا۔ ہماری ایک بچی بولتی نہیں تھی۔ ہم نے شاہ جی سے عرض کیا: شاہ جی! اس بچی کے لئے دُعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اسے قوتِ گویائی عطا فرمادیں، شاہ جی نے پیار سے بچی کو گود میں لے کر اس کی زبان پر اپنا لعابِ دہن لگایا اور فرمایا کہیں سے خالص شہد ملے تو اسے چٹایا کرو۔ انشاء اللہ بولنے لگے گی۔ اس کے بعد شاہ جی حافظ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ صاحب درخواسی کی ملاقات کے لئے تشریف لے چلے۔ گھر کے دروازے سے باہر گئے ہی تھی کہ شہد کی مکھیوں کا ایک ہجوم اسی دروازے سے ہمارے گھر میں داخل ہوا، اور ایک جگہ ڈیرہ جمالیا۔ ہم انہیں کا شہد حاصل کر کے بچی کو کھلاتے رہے، تیسرے سال بچی بولنے لگی جب بچی نے بولنا شروع کر دیا تو مکھیاں اپنا ڈیرہ اٹھا کر کہیں چلی گئیں۔ ہم ہمیشہ اس اچھنبہ یر جیران رہے وہ بچی اب ماشاء اللہ صاحبِ اولاد ہے اور اس کی قوتِ گویائی

بالکل صحیح ہے۔ (بخاری کی باتیں ص: ۸۵)

ہم نے یہاں حضرت امیر شریعتؒ کی کتاب زندگی کے چند ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جو تہذیب، اخلاق، صبر و تحمل اور عفو و درگزر کا سبق دیتے ہیں۔ یہ واقعات اپنی قوت و تاثیر میں بے مثل ہیں۔ جو شخص بھی ان پر عمل کرے گا تو سعادت و طہارت کے بلند مراتب پر فائز ہو جائے گا اگر پورا معاشرہ ان باتوں کو اپنا اصول و معمول بنالے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مثالی معاشرہ نہ بن سکے۔



باب سوم

اوصاف و کمالات، تواضع و انکساری تقویٰ و خشیتِ الہی، سیاسی زندگی اور سیاسی بصیرت

وہ لوگ جو اللہ کی زمین پر اللہ کی بندگی، عبادت، انابت، عاجزی اور انکساری کے نقوش چھوڑ جاتے ہیں، اور ہزاروں انسانوں کے دلوں میں اپنی شرافت، محبت، اخوت اور مودت کے پھول کھلا جاتے ہیں وہ اپنے مریدوں، شاگردوں، رشتہ داروں، احباب اور متعلقین کی یادوں اور دعاؤں سے کبھی محو نہیں ہوتے۔ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک بدوی صحابیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

”جس نے کسی جنتی کو دیکھا ہو وہ اس صحابی کو دیکھ لے۔“

اس طرح زندگی میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی زیارت و ملاقات سے مستفید ہونے والوں کو یہ خیال آتا تھا جس نے کسی جنتی انسان کو دنیا میں اپنی آنکھوں

سے دیکھنا ہو وہ ان کو دیکھ لے۔ امیر شریعت سیاسی میدان میں حصہ لینے کے باوجود دور حاضر کی سیاست کی خرابیوں سے مبرا تھے۔ دورِ حاضر کی سیاست کی خرابیاں کیا ہیں خود آگے بڑھنا، نمایاں ہونا، قیادت، مناصب کے لئے امیدواری، غیبت، حسد، ان میں سے کوئی بیماری بھی ان کے کردار کو چھو کر بھی نہیں گذری تھی۔ وہ ایک عالم دین تھے اور دینی انداز میں دین کا کام کرنے کا ذوق رکھتے تھے۔ امیر شریعت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو شورش کاشمیری نے بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

شاہ جی کی عادتیں :

شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں :

”شاہ جی خوبصورت عادتوں کے ایک دلفریب انسان تھے۔ قرونِ اولیٰ میں ہوتے تو صحابہؓ کی صفِ اول میں ہوتے۔ اور کربلا میں سیدنا حسینؑ کے ساتھ شہید ہوتے۔ ان کی درویشی اور فقیری میں بوئے اسدِ للہی بھی تھی اور غیرتِ شبیری بھی۔ وہ ابوذر غفاریؓ کی طرح املاک پیدا کرنے کے ہر طریق کو ناجائز سمجھتے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی رحمتوں سے بے پناہ ارادت رکھتے تھے۔ عہدِ عتیق کے روم و یونان میں ہوتے تو ڈیما سیتھینز یا سرو ہوتے۔ جنہوں نے خطابت کے اصول مدون کئے۔ گمشدہ یونان میں ہوتے تو عجب نہ تھا کہ سقراط کی طرح انہیں بھی زہر کا پیالہ پینا پڑتا۔ ویدوں کے ہندوستان میں ہوتے تو ہمالیہ کے غاروں میں رشیوں کے ساتھ قدم ملا کر چلتے اور گیتا کے ورق اجالتے پھرتے یا پھر گوتم بدھ کے ساتھ ہوتے جن کی یادیں ایلوار اور اجنتا کے محیر العقول غاروں میں نہ مٹنے والی خطابت کا شاہکار محسوس ہوتی ہیں۔

شاہ جیؒ ایک عجیب و غریب تصویری مرقع تھے۔ ان کے چہرے مہرے پر فقراے اسلام کا طنطنہ اور دانشورانِ یونان کا ہمہ ہالہ کئے ہوئے تھا۔ آدمی ان کے نزدیک آکر اور نزدیک ہو جاتا تھا۔ ان کے مخالف وہی لوگ تھے جو ان سے دور رہے تھے۔ یا پھر انگریزوں کے پٹھو، مسلمانوں کے دشمن اور قادیانیت کے قبیح۔ وہ نور کا تڑکا تھے کہ اندھیری رات اس کی گرفت میں آکر فغرو ہو جاتی ہے یا پھر اوس کا قطرہ تھے کہ غنچوں کا منہ دھلاتے اور پھول کھلاتے تھے۔ ان کی عاد میں جو ان کے انفاس کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں اتنی سادہ اور عجیب تھیں کہ عظیم کتابی انسانوں کے سوا ان کا وجود فی زمانہ شاذ ہی ملتا ہے۔ (ماہنامہ نقیب ختم نبوت امیر شریعت نمبر)

ماضی کے انسان :

وہ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے تھے۔ ہر چیز کو اللہ کی رضا کے تابع سمجھتے حال سے انہیں بس اتنا ہی تعلق تھا کہ اس کو جھنجھوڑتے اس پر کڑھتے یا کبھی کبھار اس پر قہقہے لگاتے تھے۔ البتہ وہ ماضی کے انسان تھے۔ امور ماضی ہی سے محبت کرتے تھے۔ ان کا اوڑھنا، بچھونا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، سوچنا سمجھنا، بولنا ہنسنا، سب ماضی کا مرہون اثر تھا۔ اور اسلام کے ماضی کے سوا کسی بھی ماضی کے قائل نہ تھے۔ وہ تہبند اس لئے باندھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تہبند باندھا کرتے تھے۔ وہ کسی بھی غذا کے عادی نہ تھے۔ ساگ ستو جو ملا خدا کا شکر کیا اور کھا لیا۔ میں نے ہری مرچ کی رغبت کے سوا ان میں کسی شے کے لئے رغبت نہیں پائی انہیں بغیر پکائے بھی کھا جاتے اور قیے میں بھون کر بھی۔

ٹھنڈا پانی کثرت سے پیتے۔ بلکہ تقریر کرتے وقت تھرماس ساتھ رکھتے تھے اور برف ہی چباتے چلے جاتے۔ ان کا گلابرف سے اور کھلتا بلکہ کرارا ہوتا تھا۔ اکثر فرش پر ہی بستر کھول کر سو جاتے یا پھر بان کی کھردری چار پائی پر۔ وضو کے لئے لوٹا ہمیشہ ساتھ رکھتے۔ جب پان کھانے کی عادت پختہ ہو گئی تو تیلیوں کی ایک غریب الحال ٹوکری میں پانوں کی ڈھولی، چونا، کھتا اور سپاری کی گولیاں کھدر کے ٹکڑوں میں لپیٹ لپاٹ کے رکھتے تھے۔

یاد الہی :

سحر خیز تو تھے ہی۔ یعنی صبح کی نماز قضاء نہ ہونے دیتے۔ نماز ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ مگر رات گئے دیر سے سوتے اور یہ ان کی فطرت ثانیہ ہو چکی تھی۔ جلسوں میں آخری مقرر وہی ہوتے۔ اور ان کا کوئی جلسہ بارہ ایک بجے رات سے پہلے ختم نہ ہوتا تھا۔ اور صبح ہو جانا تو عام معمول تھا۔ جلسہ ختم ہو جانے کے بعد عقیدت مندوں کا ہجوم گھنٹہ دو گھنٹہ گھیرے رکھتا جس روز جلسہ نہ ہوتا یا گھر پہ ہوتے تو محفل آرائیاں فرصت نہ دیتیں۔ وہی دو بجے شب کا سونا مقدر ہوتا۔ البتہ رمضان شریف کے مہینے میں یہ معمول نہ رہتا۔ تراویح پڑھ چکنے کے بعد محفل جماتے اور سحری سے کچھ ہی پہلے ذکر الہی میں مشغول ہو جاتے آخری برسوں میں حال یہ ہوتا کہ صحبت آرائیاں بالکل مختصر کر دی تھیں۔ وقت کا بڑا حصہ یاد الہی میں بسر کرتے۔ بلکہ صورت حال یہ تھی کہ عبادت کے لمحے قریب ہوتے تو دوستوں سے کہتے کہ بھائی میری گدائی کا یعنی اللہ سے مانگنے کا وقت ہے۔ محفل برخاست ہونی چاہیے۔ پھر خود ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔

روٹی کے لئے جینا :

فرماتے! جو لوگ روٹی کے لئے جدوجہد کرتے اور اسی کے لئے جیتے ہیں! ان میں اور ایک کتے میں کوئی فرق نہیں وہ بھی روٹی کے لئے بھونکتا اور دم ہلا کر مالک کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ روٹی کوئی چیز نہیں اصلی چیز عقیدہ اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی دھن ہے۔

چشتی بھی نقشبندی بھی :

مذہب آپکے مسلمان اور بہ لحاظ مسلک حنفی العقیدہ تھے۔ دیوبند کے مدرسہ فکر کے پیرو۔ لیکن طبیعت میں کسی کے لئے تنفر نہ تھا۔ ہر فرقے کی اچھائیوں سے محبت کرتے۔ مرزائیوں کو تو مسلمان ہی نہ سمجھتے تھے۔ صوفیاء اور اولیاء کا بے حد احترام کرتے اور مزے میں آکر فرماتے بھئی میں تو چشتی بھی ہوں نقشبندی بھی، قادری بھی، صابری بھی، اور سہروردی بھی۔ مولانا داؤد غزنوی نے شکایت کی کہ مظہر علی اظہر اپنے بیٹے قیصر مصطفیٰ کی شادی پر باجا بجوار ہا ہے۔ فرمایا بھئی! ان سے گلہ نہ کرو، وہ تو محرم کے دنوں میں باجے بجوا کر تعزیہ نکالتے ہیں۔ اپنے دوائر سے باہر عام مجلہ عوتوں میں شاذ ہی شریک ہوتے تھے۔ میں نے انہیں اپنے بھائی یورش کاشمیری کے لئے دعائے مغفرت مانگنے کو کہا۔ تو فرمایا! اجی چھوڑو! اس ننھی کلی سے کون حساب لے گا۔ خدا ہماری اور تمہاری طرح تھوڑا ہی ہے۔ قیامت کے روز چنگیز، ہلاکو، ہٹلر، مسولینی وغیرہ کا حساب ہی لمبا ہوگا ہاشما سے کون پوچھتا ہے۔

شاہ جی اور وقت کی پابندی :

وعدہ بہر حال پورا کرتے سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو تیس دن تقریریں فرماتے لیکن وقت کی پابندی ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ جلسہ میں دیر سے پہنچتے اور جس کے ہاں جا کر ملنا ہو وہاں وقت مقررہ کا دو چار گھنٹے اوپر ہو جانا تو معمولی بات تھی۔ مولانا آزاد سے ملنے کا وقت طے کیا۔ وہ سیکنڈوں پر نگاہ رکھنے والے اور یہ دو (۲) گھنٹے لیٹ پہنچے۔ وقت ہو رہا تھا۔ دوستوں نے متوجہ کیا مگر قیلولہ کرنے لگے گاندھی جی سے بھی یہی کیا۔ مولانا حبیب الرحمن کہا کرتے تھے کہ شاہ جی نے انگریز کے خلاف اتنا جہاد کیا ہے کہ کئی انسانوں کا مجموعہ بھی یہ نہیں کر سکا۔ مگر وقت کے اسراف کا یہ حال ہے کہ اگر آج یہ کہیں کہ فلاں روز ٹھیک اتنے بج کر اتنے منٹ پر شاہ جی کو وائسرائے لیگل لاج بھجوادو ہم آزادی کا پروانہ دے دیں گے تو آزادی کبھی نہیں ملے گی کیونکہ شاہ جی اور وقت کی پابندی دو متضاد چیزیں ہیں۔

ملکوئی صفات :

اپنی تعریف سے کبھی خوش نہ ہوتے۔ نہ پسند کرتے نہ اجازت دیتے۔ اخباروں میں چھپنے چھپانے کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے پریس کانفرنس کا وجود ہی نہیں دیکھا تھا۔ اخبارات کو عمر بھر کبھی کوئی بیان نہیں دیا۔ نہ مضمون لکھا۔ آزاد کے نام سے دو چار مضمون چھپے، وہ راقم الحروف کے لکھے ہوئے لیکن ان کی گفتگوؤں کا عکس تھے۔ اس معاملہ میں وہ عام لیڈروں کی کمزوریوں سے اتنے بالاتھے کہ ان کی ملکوئی صفات پر حیرت ہوتی تھی۔

پان خود بناتے، چائے بھی خود ہی تیار کرتے، خود پیتے اور دوسروں کو پلاتے تھے۔ اللہ سے حد درجہ ڈرتے اور حضور ﷺ سے والہانہ ارادت رکھتے تھے۔

قرآن کو رفیق بنا لیا :

ان کے پاس کوئی وسیع لائبریری نہ تھی۔ فرماتے قرآن کے سوا کسی اور کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہی۔ ابتداء میں خوب کتابیں پڑھی تھیں پھر مطالعہ کا یہ ذوق کچھ دنوں ساتھ رہا۔ آخر قرآن پاک ہی کو رفیق بنا لیا۔ مولانا طفیل منگلوری کی کتاب ”مسلمانوں کا روشن مستقبل“ ایک زمانہ میں ساتھ رکھتے اور ساتھیوں کو اس کے پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ”الہلال“ ظفر علی خان کا ”ستارہ صبح“ انہوں نے ڈوب کر پڑھے تھے۔ علامہ اقبال کے کلام کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا تھا۔

اپنی ذات کی ہر حال میں نفی کرتے اور جماعت کے دوستوں یا جماعت سے باہر کے انگریز دشمنوں کے قصیدے پڑھواتے اور دعائیں دیتے تھے۔

سیاسی زندگی کا آغاز :

جنگ عظیم کے دوران سیاسی جلسوں پر پابندی تھی۔ ۱۹۰۷ء میں ہی سیاسی سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں۔ یکا یک ۱۹۱۸ء میں ترکوں نے برطانوی اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ترکوں کی شکست کے بعد کرمس کے دنوں میں حکومت ہند نے برطانوی فتح کا جشن منانے کا اعلان کیا۔ اسی دوران مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کو اپنے انگریزی اخبار کمریڈ میں (VOICE OF TURKY) کے عنوان سے مضمون لکھنے پر نظر بند کر دیا گیا۔ علماء ہند نے مسلمانوں کو جشن میں شرکت

کرنے سے منع کر دیا کہ ترکی کی فتح پر جشن منانا مسلمانوں کو زیبا نہیں۔ گاندھی جی بھی احتجاج کرتے ہوئے خود جیل چلے گئے اور ملک کے کونا کونا میں احتجاج کی خبریں آنے لگیں۔ سب سے زیادہ اشتعال انگیز حادثہ جلیانوالہ باغ امرتسر میں ہوا۔

واقعہ جلیانوالہ باغ :

یہ ”باغ“ شہر کے درمیان واقع تھا۔ کوتوالی سے جنوب کی طرف کچھ فاصلہ پر اس کا آمدورفت کا علاقہ نہیں تھا۔ اس باغ میں جلسے ہوا کرتے تھے۔ مارشل لاء ہو جانے کے باوجود ایک ہفتہ تک شہر میں حکومت اپنا نظام قائم نہ کر سکی۔ باغ میں ہر روز جلسے ہوتے تھے اور لوگوں کو صورت حال سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ اور پرامن رہنے کو بھی کہا جاتا۔ کیونکہ کارکن حضرات تشدد کو درست نہیں سمجھتے تھے اور گاندھی جی نے پرامن رہنے کی ہدایت کی تھی۔ ۱۳ اپریل اتوار کے روز بیساکھی کے دن امرتسر میں خاص ہجوم تھا لوگ دیہاتوں سے بڑی تعداد میں آئے تھے۔ جلیانوالہ باغ میں جلسہ ہو رہا تھا۔ حاضری معمولاً بھی غیر معمولی ہوتی تھی۔ لیکن بیساکھی کے دن غیر معمولی ریکارڈ بھی مات ہو گیا۔ لیفٹیننٹ گورنر لارڈ ڈاؤنر کی ہدایت کے مطابق جنرل ڈائر فوج کا ایک دستہ لے کر شہر میں آیا۔ اس نے کوتوالی کی طرف بڑھ کر عام آمدورفت کا راستہ روکا اور آگے بڑھ کر کوئی تنبیہ کئے بغیر فوج کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ ہزاروں زخمی اور سینکڑوں قتل ہوئے بھاگ دوڑ میں نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ لوگ مکانوں اور دیواروں کو پھاند کر بھاگنے لگے۔ لیکن مسلمان سب سے زیادہ تختہ مشق ستم ہوئے ڈائر اور اس کے فوجی واپس چلے گئے اور لوگ بھی ہراساں ہو کر جدھر رخ ہوا بھاگ گئے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ پر حادثہ کار و عمل :

اس قتل عام نے نہ صرف امرتسر کے شہر اور ضلع میں آگ لگا دی بلکہ قرب و جوار کے لوگوں میں بھی اپنے مرنے والوں اور زخمی ہونے والوں کی خبر سن کر غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اخبارات میں جب اس قتل عام کی خبر پھیلی تو سارے ملک بلکہ ساری دنیا میں انگریزی تشدد کے خلاف گہرا جذبہ پیدا ہوا۔ نوجوان سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی رہائش گاہ بھی کوٹوالی اور جلیانوالہ باغ کے قریب ہی تھی۔ اس سانحہ جانکاہ سے طبیعت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ ترکوں کی شکست کے بعد خود اپنے گھر میں انگریزی مظالم کی داستان ایک چشم دید واقعہ بن کر سامنے تھی۔ جو شیلی طبیعت، تڑپنے والا دل، تڑپانے والی زبان کب تک خاموشی اختیار کرتی۔ قسمت نے پہلے ہی کرسمس کے دنوں میں کانگریس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں کرانے کا فیصلہ کر چھوڑا تھا۔ اب انگریزی حکومت کے سامنے یہ سوال تھا کہ آیا کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہونے دیا جائے یا نہ؟ اجلاس کا فیصلہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں ہو چکا تھا۔ اس لئے اسے خود ساختہ فتنہ سے تعبیر نہ کیا جاسکتا تھا۔ ہندوستان کے چپہ چپہ میں جلیانوالہ باغ کے مظالم کی داستان پہنچ چکی تھی۔ دنیا کی رائے عامہ بھی برطانیہ کے خلاف تھی۔ اس لئے اس اجلاس کو روکا نہ جاسکا۔ اور وزیر ہند نے اعلان کر ہی دیا کہ کانگریس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں ہونے دیا جائے گا اور اسے روکا نہیں جائے گا۔ (تلخیص ماہنامہ نقیب ختم نبوت امیر شریعت نمبر ص: ۳۸۵۲۹)

واعظ سے سیاسی لیڈر تک :

مولانا محمد داؤد غزنوی لکھتے ہیں :

۱۹۱۹ء کے مارشل لاء کے بعد میں نے امرتسر میں پبلک جلسوں کا انتظام کیا۔ جلیانوالہ باغ میں انگریز کے ظلم و تشدد کی وجہ سے تمام پنجاب اور امرتسر میں خوف و ہراس تھا۔ میں نے اس خوف و ہراس کو ختم کرنے اور اس کی جگہ عوام میں آزادی کی تحریک کو پھر سے زندہ کرنے اور برطانیہ کی اسلام دشمنی کو بے نقاب کرنے کے لئے مسئلہ خلافت کو سامنے رکھ کر شہر کے مختلف مقامات پر جلسوں کا انتظام کیا۔

اس وقت میری عمر ۳۵ سال تھی۔ حکومت کے تشدد سے بے نیاز ہو کر جب میں نے تقریریں شروع کیں تو عوام میں ہر وقت میری گرفتاری کا چرچا تھا۔ میں نے اللہ کے نام پر اپنے مشن کو جاری رکھا۔ جو قلبی سکون مجھے اس وقت حاصل تھا میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس وقت مدرسہ نعمانیہ مسجد خیر الدین (امرتسر) میں مشکوٰۃ شریف پڑھ رہے تھے۔ لیکن وہ اپنے خوش بیان ہونے کی وجہ سے بطور ایک واعظ امرتسر میں مشہور تھے۔

میری ایک تقریر چونک کڑھ سعید میں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد ہر دوست کا خیال تھا کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ اور ساتھ ہی مجھے دوستوں نے نصیحت کرنی شروع کی کہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ آپ اس قسم کی تقریریں نہ کریں۔ دوسرے دن اسی جگہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریر کی اور کہا :

”کل اسی جگہ مولوی داؤد غزنوی جو آگ لگا گیا ہے میں اس پر پانی

ڈالنے آیا ہوں۔“

شاہ جی کی اس تقریر سے عوام میں غلط فہمی پیدا ہوئی۔ مجھے جب اس تقریر کا علم ہوا تو میں نے سمجھا کہ شاہ جی کو واقعات کا علم نہیں اور ان سے یہ تقریر کرائی گئی

ہے۔ لہذا میں نے دوسرے دن شاہ جیؒ کو اپنے مکان پر بلوایا۔ اور اخبارات کے تمام گزشتہ فائل ان کے سامنے رکھے اور ان سے عرض کیا کہ اس وقت عالم اسلام کے خلاف برطانیہ کیا سلوک کر رہا ہے۔ اور خاص کر ترکی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ عالم اسلام کے لئے تباہی کا باعث ہے۔

یہ حالات سن کر شاہ جیؒ نے فرمایا کہ : ”نہ تو میں اخبارات پڑھتا ہوں اور نہ میں نے سیاست میں کبھی حصہ لیا ہے، اس لئے مجھے حالات کا کوئی علم نہیں۔“

میں نے عرض کیا: اگر آپ تمام حالات معلوم کرنے کے بعد میرے ساتھ مل کر کام کریں تو اس وقت مسلمانوں اور عالم اسلام کی بہتر خدمت ہو سکتی ہے۔ شاہ جی نے فرمایا : ”میں تو ایک طالب علم ہوں ان حالات میں کیسے تقریر کر سکتا ہوں۔“

میں نے کہا آپ دو تین مہینے میرے ساتھ جلسوں شرکت کریں۔

شاہ جی میں جذبات کی کمی نہ تھی۔ تقریر کی قابلیت ان میں قدرت نے ودیعت کر رکھی تھی۔ چنانچہ تھوڑے عرصے میں شاہ جی خلافت کے موضوع اور حالات حاضرہ کے بہترین مقرر بن گئے۔ پھر تو ان کی تقریر کا یہ عالم ہو گیا کہ نہ صرف امرتسر بلکہ پنجاب سے باہر سارے ہندوستان میں وہ اپنی ایمان پرور تقریروں سے لوگوں کے جذبہ حریت اور ایمان کو گرماتے رہے۔

یہ ان کی خاندانی شرافت یا عالی نسب کی جھینے کہ اس مقام پر پہنچ کر بھی وہ مجھے اپنا بڑا بھائی اور استاد تسلیم کرتے رہے۔ (حیات امیر شریعت ص: ۴۳)

پہلی گرفتاری :

جاننا مرزا بیان کرتے ہیں :

تحریک خلافت ۱۹۲۱ء میں جب عوام کی گرفتاریاں شروع ہوئیں اور شاہ جی بھی اپنی ایک تقریر کی بناء پر جو انہوں نے مسجد خیر الدین امرتسر میں کی تھی گرفتار کر لئے گئے۔ اس مرتبہ انہیں تین برس تک کی سزا ہوئی۔ یہ شاہ جی کی پہلی گرفتاری اور سزایابی تھی۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد سول نافرمانی کی عام تحریک شروع ہو گئی اور ہم سب گرفتار ہو کر جیلوں میں چلے گئے۔

میانوالی جیل :

پنجاب کے تمام کارکن میانوالی جیل میں تھے۔ وہاں شروع میں تو سخت پابندی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے مل بھی نہ سکتے تھے۔ امرتسر کے کچھ کارکن وہاں پہنچے تو ہماری ایک طاقت بن گئی۔ شروع میں ہم گیہوں کی روٹی کھاتے تھے لیکن ہم نے یہ روٹی ترک کر دی اور مطالبہ کیا کہ ہم سب کو ایک ساتھ رکھا جائے۔ چھ دن بعد ہماری بات مان لی گئی اور ہم نے بھوک ہڑتال ترک کر دی۔ اس کے بعد ہمارا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ سیاسی اور اخلاقی قیدیوں کے لنگر الگ الگ ہوں اور اس کا تمام نظام ہمارے ہاتھ میں ہو۔ ہمارا یہ مطالبہ بغیر بھوک ہڑتال کے مان لیا گیا اور سیاسی قیدیوں کے لنگر کا انتظام ہمارے سپرد کر دیا گیا۔ مجھے لنگر کا مینیجر مقرر کیا گیا۔ اس بناء پر مجھے تمام جیل میں آنے جانے کی آزادی مل گئی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ پابندیاں کم ہوتی چلی گئیں اور ہم سب ایک دوسرے سے ملنے جلنے لگے۔

قومی زندگی کا آغاز :

۱۹۱۹ء کے فوراً بعد جب امرتسر کے لوگ مارشل لاء اور جلیانوالہ باغ کے

حادثہ جانکاہ سے بُری طرح نڈھال تھے۔ یکا یک لفظ خلافت سننے میں آیا۔ اس وقت مولانا محمد داؤد غزنوی پہلے بزرگ تھے جو میدان میں نکلے اور انہوں نے مسلمانوں کو مسئلہ خلافت سمجھانا شروع کیا ساتھ ساتھ دولت عثمانیہ ترکی کے خاتمہ کا ماتم بھی تھا۔ یہ زمانہ عالم اسلام پر چاروں طرف سے مصیبتوں اور آفتوں کا زمانہ تھا۔ جزیرۃ العرب اور دیگر مقامات مقدسہ غیروں کے قبضہ میں تھے۔ جب اس اجمال کی تفصیل مسلمانوں کو سنائی جانے لگی تو مسلمان عوام کے اندر صدمہ اور جوش کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔

حضرت شاہ جی اس وقت صرف مذہبی وعظ فرماتے تھے وہ مولانا داؤد غزنوی کے ساتھ شریک نہ ہوئے۔ البتہ کبھی کبھی مولانا غزنوی کے نظریہ پر شاہ جی مخالفانہ انداز بھی اختیار کر لیتے۔ مجھے شاہ جی نے بتایا کہ ایک بار مولانا داؤد غزنوی نے خود کوشش کر کے مجھ سے ملاقات کی اور کئی گھنٹوں کی ملاقات میں موجودہ مسئلہ کھول کر بیان کیا۔ تب شاہ جی قائل ہو گئے پھر کیا تھا پھر تو امرتسر کے مسلمانوں کی کا یا ہی پلٹ گئی۔ شاہ جی کا عہد جوانی اور ساتھ ساتھ جوش ایمان اور قوت بیان کی ایک آگ لگ گئی۔

میرے لئے سیاسی جلسوں میں شمولیت کا پہلا موقع تھا۔ مسئلہ خلافت اور انگریز حکومت کی چیرہ دستیایں مسلمانوں کے دلوں کے زخموں پر نمک کا کام دیتی تھیں۔ امرتسر ابھی ابھی زخم کھا کر نکلا تھا مگر مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں اور مذہبی وعظوں نے ہندو مسلمان سب کے اندر بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا۔ اتنے میں ۱۹۱۹ء کا دسمبر آ گیا اور کانگریس کا سالانہ جلسہ زیر صدارت پنڈت موتی لال نہرو امرتسر میں منعقد ہوا، ساتھ ساتھ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی حکیم اجمل خان صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔

یہ دسمبر امرتسر کے لئے تو بارانِ رحمت ثابت ہوا کہ ہندوستان کے تمام لیڈر امرتسر پہنچ گئے جو جیلوں میں تھے وہ رہا کر دیئے گئے۔ علی برادران بھی جیل سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر وارد ہوئے یہ زمانہ علی برادران کے عروج کا زمانہ تھا۔ مولانا شوکت علی کی صدارت میں آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں مولانا محمد علی جوہر نے حالات حاضرہ اور عالم اسلام کی تباہی و بربادی پر تقریر کی۔ اس جلسہ میں شاہ جی نے تقریر فرمائی اور دس لاکھ روپیہ چندہ کے لئے اپیل کی جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور روپیہ کی فراہمی شروع ہو گئی۔ مولانا ظفر علی خان اس جلسہ میں موجود تھے مگر حکومت کی طرف سے ان کو تقریر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ زمانہ زمیندار اور مولانا ظفر علی خان پر انگریزوں کے انتہائی عتاب کا تھا۔ مگر اسی اجتماع میں ان کو تار ملا کہ مولانا کی زبان بندی ختم کر دی گئی ہے۔ تب امرتسر کا یہ قومی ہفتہ پوری شان سے منایا گیا۔ یہیں شاہ جی کا گہرا تعلق علی برادران سے ہو گیا۔

بیعتِ جہاد :

کچھ عرصہ بعد مولانا ابوالکلام آزاد کا دورہ پنجاب ہوا۔ یہ دورہ زیادہ تر مذہبی تھا اور مولانا مسلمانوں سے بیعت جہاد لے رہے تھے۔ لاہور کی شاہی مسجد میں نماز جمعہ کے بعد رانا فیروز الدین نے جو اس وقت خلافت کمیٹی پنجاب کے سیکرٹری جنرل تھے، اعلان کیا کہ جو مسلمان مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہے وہ کر سکتا ہے اس مجمع کے آخر میں شاہ جی حوض کے قریب ہی کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہی مولانا عبدالقادر صاحب قصوری بھی تھے۔ شاہ جی نے سنا تو سخت بے چین ہوئے۔ مولانا عبدالقادر صاحب سے کہا کہ دیکھو سب کام خراب ہو رہا ہے۔ یہ کہہ کر شاہ جی نے ایک

چھلانگ لگائی اور لوگوں کے گویا سروں سے گزرتے ہوئے منبر تک پہنچ گئے۔ صدر خاموش تھا ان سے کہا کہ میں ان کے اس اعلان کی وضاحت کروں گا۔

مولانا عبداللہ قصوری خاموش رہے۔ شاہ جی نے اپنی خداداد قرأت و بلند آواز سے مجمع کو اپنی طرف متوجہ کر لیا یہ پہلا موقع تھا کہ مولانا آزاد بھی محو حیرت شاہ جی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاہ جی نے اس عظیم الشان مجمع کو چند منٹوں کے اندر اندر اپنی گرفت میں لے لیا اور اس نقطہ کی وضاحت فرمائی کہ جو لوگ پہلے کسی مرشد سے بیعت ہیں ان کی اس بیعت سے اثر نہیں پڑتا وہ بیعت ارشاد تھی اور یہ بیعت جہاد ہے۔“

اتنا کہہ کر اپنے ہاتھ مولانا آزاد کے ہاتھوں میں دے دیئے اور کلمات بیعت کا ورد شروع کیا۔ شاہ جی پہلے پڑھتے پھر تمام مجمع پڑھتا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تمام درود یوار سے یہ آواز آرہی ہے اور خشوع و خضوع کا یہ عالم تھا کہ اس وقت بلاشبہ قرن اول کا یہ واقعہ یاد آ گیا جب حضور ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مدینہ منورہ میں انصار سے بیعت لی تھی۔ ایسا منظر پھر زندگی میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا اس واقعہ کے بعد شاہ جی کا تعلق مولانا آزاد سے ہو گیا۔ (مولانا آزاد نے اسی موقع پر فرمایا۔ میرے بھائی! آپ کی اس خدمت پر ملک و ملت کا ہر گوشہ شکر گزار ہے)

ہجرت :

حضرت شاہ جی کی زندگی کے حالات مختصر ہی کیوں نہ بیان ہوں مگر وہ نامکمل اور سراسر نامکمل ہوں گے اگر تحریک ہجرت کا ذکر ان کے ساتھ نہ کیا جائے کیونکہ اس تحریک کے روح رواں شاہ جی ہی تھے۔ گو اس قافلہ کے ہراول جناب عزیز ہندی تھے

جنہوں نے پہلے پہل اس کا بیڑا اٹھایا۔ اس بات کی تفصیل آج میں کافی حد تک بیان کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ جو حقیقت حال پر مبنی ہوگی۔ میرے بعد اب کوئی دوسرا آدمی زندہ بھی نہیں جو اس تحریک کے بنیادی پہلو پر روشنی ڈال سکے۔

ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد ہمیشہ سے ہندوستان کے انقلاب کی پناہ گاہ رہی ہے۔ اور افغانستان میں جب غازی امان اللہ خان برسر اقتدار آئے تو آزاد ہند کے راہنماؤں کو ایک گونہ تسکین ہوئی۔ کیونکہ امان اللہ خان آزادی ہند کے حامی تھے۔ مگر ان کی مجبوری تھی کہ ان کے والد کے زمانہ ہی سے شاہ افغانستان انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا۔ عملاً برطانوی سفیر مقیم کابل کی حکومت افغانستان میں تھی۔ بادشاہ برائے نام ہی تھا۔ امان اللہ خان نے آتے ہی پہلا حملہ جب انگریزی سرحد پر کیا تو اس وقت انگریزی فوج بہت کم تھی پنجاب میں شورش ہونے کی وجہ سے مارشل لاء نافذ تھا اور فوج پنجاب میں تھی۔ حکومت ہند کے لئے یہ وقت بڑا مشکل تھا اس افغانی حملہ کی وجہ سے ایک تو عملاً مارشل لاء اٹھ گیا۔ دوسرے پنجاب کی شورش کے باعث انگریزوں کو امان اللہ سے عارضی صلح کرنا پڑی۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو انگریزوں کا پنجاب کو پریشان کرنے کا فیصلہ ابھی بہت باقی تھا۔ اس کا ایک فائدہ ہندوستان کو یہ بھی ہوا کہ حکومت برطانیہ کی پالیسی ہندوستان کی طرف عارضی طور پر کچھ نرم پڑ گئی۔

ان تمام حالات کے باوجود ۱۹۳۰ء کا ہندوستان سخت آزمائش سے گزر رہا تھا۔ اس کو کوئی راستہ نہ ملتا تھا کہ وہ اب کیا کرے؟ یہی وہ دور ہے جب ہجرت کی تحریک یکا یک شروع ہو گئی۔ اور اس کا اثر مسلمانوں پر بے پناہ ہوا۔ حضرت شاہ جی نے کافی غور و فکر کے بعد اس میں ہاتھ ڈالا کیونکہ حکومت افغانہ نے اپنی طرف

سے ہجرت کرنے والوں کو بلایا۔ اس سے امید کی یہ کرن پیدا ہوئی کہ شاید حکومت پر کچھ دباؤ پڑ جائے اور وہ مسلمانان ہند کے مطالبات پر توجہ دے سکے۔ اب شاہ جی نے ہجرت کی تحریک میں جان ڈالنی شروع کی۔ پنجاب، سندھ، اور صوبہ سرحد کے اندر تو یہ قابو سے باہر ہو گئی اور حکومت انگریزی سخت گھبراہٹ میں پڑ گئی۔ سپیشل گاڑیاں بھی چلنی شروع ہو گئیں۔ صوبہ سرحد کے چیف کمشنر سر سملٹن گرانٹ نے تو ایک قافلہ کو ہاتھ جوڑ کر روکنے کی کوشش کی مگر مسلمان سر بکف جا رہا اور اپنی لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر بے وطن ہو رہا تھا۔ جب یہ تحریک زوروں پر تھی تب سرکار انگریز کی مشینری حرکت میں آئی اور سینکڑوں کی تعداد میں انگریز کے ایجنٹ مسلمان، ان قافلوں میں شامل ہو گئے تاکہ انتشار پیدا کر سکیں۔ (امیر شریعت نمبر ص: ۶۸۲۵۴)

تواضع انکساری :

حضرت شاہ جی جتنے بڑے انسان تھے اتنا ہی وہ اپنے کو چھوٹا سمجھتے۔ انکساری کا ان پر اتنا غلبہ تھا کہ کبھی ممتاز جگہ بیٹھنا پسند نہیں فرمایا۔ لوگ سادات کو عام طور پر چار پائی پر بٹھاتے ہیں تو خود نیچے بیٹھ جایا کرتے ہیں۔ عوام کے لئے سادات کا احترام تو حسن اسلام کی نشانی ہے مگر سادات کو کیا کرنا چاہیے ان میں سب کو سب سے بڑے سید یعنی سید الکوین رضی اللہ عنہ کی پیروی ہی باعث عز و افتخار ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ہمراہ راستے پر چلتے تھے تو سب کے آگے ہو کر بلکہ کیف ماتفق (جیسے بھی ہو جائے) ان میں شامل ہو کر چلتے اور باوجود اس کے بطور معجزہ آپ سب سے نمایاں اور ممتاز نظر آتے۔ یہی حال حضرت شاہ جی کا تھا آپ تابع سنت تھے۔ سب کے برابر چلتے، سب کے ساتھ بیٹھتے اور سب سے مل کر کھانا کھاتے آپ امتیاز شان کو کبھی پسند نہ فرماتے۔ کوئی بھی آتا

اسے اپنے ساتھ چار پائی پر بٹھاتے دوست اور خدام ہچکچاتے تو آپ ازراہ مزاح فرماتے کہ بھائی میں کوئی اچھوت تو نہیں... مجبور ہو کر سب کو حکم کی تعمیل کرنی پڑتی۔

چھا بڑی فروش :

مولانا عبدالمجید انور صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شاہ جی سے شرکائے مجلس میں سے کسی نے حضرت مولانا بنوری صاحب کے درس قرآن کا ذکر کیا جو اسی صبح مدرسہ قاسم العلوم میں ہوا۔ شاہ جی فرمانے لگے: مجھے پتہ دیا ہوتا تو گرتا پڑتا حاضر ہو جاتا۔ آخر میں بھی تو چھا بڑی فروش ہوں، جب تک زندگی کی رمت باقی ہے یہ دھند باقی ہے، ان ہی حضرات کے ہاں سے مال حاصل کر کے اپنی چھا بڑی میں رکھ کر صدا لگالیتا ہوں۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۳)

کیا مزید ارساگ ہے :

مولوی غلام محمد صاحب مبلغ مجلس تحفظ ختم نبوت فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ خوشاب کے جلسہ میں حضرت شاہ صاحب تشریف لائے اور ایک غریب کارکن کی خواہش پر اس کے ہاں قیام کیا۔ جب صبح ناشتہ کا وقت تھا تو اسے بلا کر فرمایا: یار! مدت ہوئی رات کی باسی روٹی اور ساگ کا لطف نہیں لیا۔ آج وہی کھلاؤ، لطف آ جائے گا۔ میری بیٹی سے کہو ساگ بنا کر کھلائے۔ میزبان نے ایسا ہی کیا۔ جب کھانا آیا شاہ جی ہر لقمے پر تعریف فرماتے۔ فرماتے: کیا مزید ارساگ ہے، بھئی! مزا آ گیا، بڑی مدت کے بعد یہ نعمت حاصل ہوئی ہے۔ شاہ جی دعائیں دیتے رہے اور وہ دعائیں سن کر پھولا نہیں سماتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ شاہ جی نے اس کے حسب حال فرمائش کر کے اس کو زیر باری اور تکلیف سے بچا لیا۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۷)

انسان تو ہو :

مولانا نور الحسن شاہ صاحب بخاری مرحوم فرماتے ہیں کہ خیر المدارس جالندھر کے جلسہ میں حضرت شاہ جی شریک تھے۔ کھانے کے لئے دسترخوان پر بیٹھے تو سامنے ایک نوجوان بھنگی کو دیکھا، شاہ جی نے فرمایا: آؤ بھئی! کھانا کھا لو۔ اس نے عرض کیا جی میں تو بھنگی ہوں۔ شاہ جی نے درد بھرے لہجے میں فرمایا: ”انسان تو ہو“، بھوک تو لگتی ہے، یہ کہہ کر خود اٹھے، اس کے ہاتھ دھلا کر ساتھ بٹھا لیا۔ وہ بے چارا تھر تھر کانپتا تھا، اور کہتا جا رہا تھا کہ جی میں تو بھنگی ہوں۔ شاہ جی نے خود لقمہ توڑا، شوربے میں بھگو کر اس کے منہ میں دے دیا، اس کا کچھ حجاب دور ہوا تو شاہ جی نے ایک آلو اس کے منہ میں بھگو کر اس کے منہ میں ڈال دیا۔ اس نے جب آدھا آلودانتوں سے کاٹ لیا تو باقی آدھا شاہ جی نے خود کھا لیا۔ اس طرح اس نے پانی پیا تو اس کا بچہ ہوا پانی شاہ جی نے خود پی لیا۔ وقت گزر گیا وہ کھانے سے فارغ ہو کر غائب ہو گیا، اس پر رقت طاری تھی، وہ خوب رویا، اس کی کیفیت ہی بدل گئی، عصر کے وقت اپنی نوجوان بیوی جس کی گود میں ایک بچہ تھا، ساتھ لے کر آیا اور کہا شاہ جی! اللہ کے لئے ہمیں کلمہ پڑھا کر مسلمان کر لیجئے اور یوں میاں بیوی اسلام لے آئے۔ (بخاری کی باتیں ص: ۳۳)

نفس کا علاج :

امین گیلانی بیان کرتے ہیں :

شاہ جی کو مولانا غلام غوث ہزاروی نے بفقہ میں جلسہ کی دعوت دی۔ آخر جلسے کا دن آ پہنچا، مولانا غلام غوث ہزاروی نے کار بھیج دی کہ شاہ صاحب کو سفر میں آسانی رہے۔ مقامی حضرات نے ایک بس کرایہ پر حاصل کر لی، جس میں رضا کار اور مقامی

علماء بیٹھ گئے۔ جب روانگی کا وقت آیا تو شاہ جی مجھے (امین گیلانی) ساتھ لے کر باہر تشریف لائے، کار کا اگلا دروازہ کھول کر کہنے لگے، امین! تم بیٹھ جاؤ، میں نے عرض کیا شاہ جی میں پیچھے بیٹھوں گا، آپ آگے تشریف رکھیں۔ شاہ جی نے لہجہ بدل کر کہا: امین میں حکم دیتا ہوں۔ یہیں بیٹھو، میں تعمیل حکم کے لئے آگے بیٹھ گیا۔ پچھلی سیٹ پر تین علماء کرام بیٹھ گئے، جب میں بیٹھ گیا تو فرمایا: ذرا کان ادھر کرو، میں متوجہ ہوا، تو میرے کان میں آہستگی سے کہا، تم جاؤ میں ایک گھنٹہ بعد تنہا برفہ پہنچ جاؤں گا۔ مولانا غلام غوث پوچھیں تو انہیں یہی بات الگ کر کے بتا دینا۔ میں بھونچکا سا رہ گیا، ڈرائیور کو حکم دیا، چلو بھائی! اللہ کا نام لے کر انہیں لے جاؤ اور شاہ جی جھٹ مکان میں چلے گئے۔ بس والوں کو کچھ پتہ نہ چلا۔ میرے پیچھے جو علماء کرام بیٹھے تھے، انہوں نے مجھ سے دریافت کیا، میں نے کہہ دیا، برفہ چل کر بتاؤں گا۔ الغرض ہم برفہ پہنچے تو شہر سے ایک ڈیڑھ میل قبل سینکڑوں سرخ پوش احرار رضا کار دورویہ استقبال کے لئے بندوقوں، کلہاڑیوں اور تلواروں سے مزین کھڑے تھے۔ کار دیکھتے ہی انقلاب زندہ باد، مجلس احرار اسلام کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ ان دستوں نے ہوائی فائر داغے، مولانا ہزاروی خود استقبال کرنے والوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو تعجب سے پوچھا: امین! شاہ جی کہاں ہیں؟ میں اتر کر انہیں الگ لے گیا اور ان کا حکم سنا دیا۔ مولانا ہزاروی کا چہرہ سرخ ہو گیا، فرمایا: میں سمجھ گیا ہوں، اچھا آ لینے دو شاہ جی کو۔ ہم ایک بڑی حویلی میں جا کر اترے جہاں قیام و طعام کا انتظام تھا۔ میں نے اعلان کر دیا، شاہ جی راستے میں ہیں، ابھی تشریف لے آئیں گے۔ آپ یہیں انتظار کریں، ایک گھنٹہ مکمل نہ گزرا ہوگا کہ شاہ جی تنہا چمک دار کلہاڑی

تھامے چادر میں سراپا لپیٹے حویلی میں پہنچ گئے اور چادر اتار کر بلند آواز سے السلام علیکم کہا، مولانا ہزاروی آگے بڑھے اور اپنے غصے کو دبا کر عوام سے الگ لے جا کر کہنے لگے: میں جانتا ہوں آپ نے ایسا کیوں کیا؟ مگر میں نے یہ سب کچھ آپ کے نفس کو خوش کرنے کے لئے نہیں کیا تھا، میں نے دشمن انگریز کو جلانے کے لئے کیا تھا کہ ہم تمہارے باغی مجاہدوں کی اس طرح قدر کرتے ہیں۔ شاہ جی نے گردن جھکا کر کہا: مولانا معافی چاہتا ہوں، بس میں نے اپنے نفس کا علاج یہی زیادہ مناسب سمجھا تھا، پھر دونوں بزرگ گھل مل گئے۔ (ماخوذ بخاری کی باتیں ص: ۱۲۷ تا ۱۲۸)

جفاکشی اور دلیری :

اکثر علماء کے دورے بڑے شہروں میں ہوتے ہیں۔ لیڈروں کا تو کیا کہنا ان کے لئے تو تیار اسٹیج چاہئے جہاں کہ وہ موٹر سے اتر کر ایک عدد لیکچر جھاڑ دیں۔ بعض مبلغین کبھی کبھار دیہات میں بھی چلے جاتے ہیں، مگر حضرت شاہ صاحب سب سے نرالے تھے۔ ان کی جوانی اور زندگی کا قابل فخر زمانہ ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ، ملتان وغیرہ اضلاع کے خشک اور ریتلے میدانوں، گرم، ہواؤں اور گرد و غبار کے طوفانوں سے محبت میں گزرا۔ کبھی پیدل، کبھی گھوڑے اور کبھی اونٹ پر چلے جا رہے ہیں۔

ان کو بے بس مسلمانوں کی غربت کھائے جا رہی تھی۔ جو روایت و رسوم اور بدعات کے شکار ہونے کی وجہ سے مال و دولت کے ساتھ ناموس تک کو گروی رکھ دینے پر مجبور ہو جاتے۔

وہ جہاں جاتے۔ سطحی دورہ کر کے کبھی واپس نہ ہوتے نہ تقریریں بیچ کر کمائی کا حساب لگاتے۔ وہ ہر جگہ جم کر کام کرتے کہیں کہیں ڈیرہ ڈال دیتے اور تب نکلتے کہ

وہ علاقہ صاف ہو جاتا یا حق کی حامی جماعت بن جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جرأت و ہمت کا وہ جوہر عطا فرمایا تھا جو کم کسی کو نصیب ہوتا ہے، انگریزوں کے اقتدار کے زمانہ میں پرستار ان فرنگی کے غضبناک ہجوم کے اندر فریب خوردہ جو شیلے اور نادان مسلمانوں کی مخالفت کے طوفان میں گھس کر حق کہنا اور پھر سب کے دلوں کو فتح کر لینا شاہ جی پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا، کہیں کھانا دیر سے ملا۔ کہیں آرام کی جگہ نہیں۔ کہیں گرمی نے ستایا۔ اور کہیں روحانی اذیت پیش آئی۔ کبھی گرفتاری کا خطرہ لاحق ہوا اور کبھی جیل جانا پڑا کوئی بات ان کو راہ حق سے ہٹانہ سکی۔

قدر دانی :

حضرت شاہ جی میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ مظاہر فطرت کے آئینہ جمال قدرت کے جلوے دیکھتے اور ہر صاحب کمال کی قدر کرتے وہ فرعون مزاج فرنگی اور اس کے ایجنٹوں کے سامنے تیغ بے نیام تھے۔ تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں اور عاجز مخلوق کے لئے آنکھیں بچھاتے۔ کمال علم و کمال تقویٰ کی تعظیم میں ان کی کمر جھکی رہتی۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب قدس سرہ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ملفوظات یا کسی تحقیق کا ذکر آتا تو مجسمہ سکوت و حیرت بن جاتے، کیوں نہ ہو۔ ولی را ولی مے شناسد۔

حضرت شاہ جی خود مجاہد اور احواء سنت اور تردید شرک و بدعت کے علمبردار تھے۔ وہ ان جہاں علم کی بلندیوں سے واقف اور ان کے فیوض باطنی سے لذت آشنا تھے۔ بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان نے جس نصب العین کو سامنے

تذکرہ وسوانح سید عطاء اللہ شاہ بخاری ----- ﴿ ۷۷ ﴾

رکھ کر جدوجہد شروع کی تھی حضرت شاہ جی نے اس کو سرانجام دینے میں اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ اللہ تعالیٰ کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں اس قبر پر جس میں اللہ تعالیٰ کے یہ نیک بندے اللہ کا نام بلند کرتے کرتے جا بے اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کی پیروی نصیب کرے۔ (آمین)

علماء و صلحاء کا احترام :

الہ آباد (علاقہ بہاولپور) میں جلسہ ہو رہا ہے شاہ جی اپنی قیام گاہ میں معتقدین کی جھرمٹ میں بیٹھے ہیں۔ مجلس گرم ہے کہ اتنے میں جلسہ گاہ سے قرآن مجید پڑھنے کی آواز سنائی دی۔ مولوی عبدالحق صاحب احمد پوری تقریر فرما رہے تھے۔ شاہ جی آواز پہچان گئے اور حاضرین کو کہا ”میرے پاس بیٹھے کیا لوگے۔ جاؤ ریاست کا محدث بول رہا ہے۔ ان سے کچھ حاصل کر لو“۔

غالباً ۴۲ء کا ذکر ہے۔ پہلی راجن میں جلسہ ہو رہا تھا۔ رہائش گاہ کے اندرونی حصہ میں تشریف فرما تھے۔ کسی نے خبر دی کہ حضرت حافظ کریم بخش صاحب مرحوم بہاولپور گھلوں والے تشریف لارہے ہیں۔ آپ پان بنا رہے تھے۔ پان دان کھلا چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے مکان سے باہر آئے تو نہر کے کنارے حافظ صاحب مرحوم کا اونٹ بٹھایا جا رہا تھا جلدی سے وہیں پہنچ کر استقبال کیا۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ آپ نے اس قدر تکلیف کیوں کی۔ اس پر شاہ جی نے فرمایا ”میری جدوجہد آپ جیسے بزرگوں کی دعاؤں کا ہی تو نتیجہ ہے۔ اگر آپ کا احترام نہ کروں تو اور کس کا“۔ (بخاری کی باتیں ص: ۴۳)

تدبر و بصیرت اور مجسمہ بر علم و حکمت :

امین گیلانی لکھتے ہیں :

حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب اہلحدیث تھے، اگرچہ انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں حضرت علامہ انور شاہ صاحب سے پڑھا تھا، امرتسر میں مولانا ثناء اللہ اور ہم ایک ہی محلہ میں کڑہ بھائی سنت سنگھ میں رہتے تھے اور ان کے پوتوں سے میرا بہت دوستانہ تھا بلکہ ذکاء اللہ مرحوم جو مولانا کا دوسرا پوتا تھا وہ تو مجلس احرار کا رکن بھی تھا۔ اس لئے مولانا مجھ سے ذرا بے تکلف تھے اور ہمیشہ شفقت فرماتے، ایک دن میں نے مولانا سے کہا: میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی مسجد میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کراؤں، مسکرا کر فرمایا: امین! مجھے تو کوئی عذر نہیں مگر کیا شاہ جی میری مسجد میں تقریر کرنے کو تیار ہوں گے، میں نے بڑے اعتماد سے کہا کیوں نہیں، انہیں کیا عذر ہو سکتا ہے؟ مولانا نے فرمایا: ابھی پوچھ کر تو دیکھو تو میں شاہ جی کے پاس چلا گیا، اور کہا شاہ جی! آپ مولانا ثناء اللہ صاحب کی مسجد میں تقریر کریں گے، شاہ جی نے بھی میرے سوال پر ہنس کر فرمایا: کیا مولانا اپنی مسجد میں میری تقریر کی اجازت دے دیں گے۔ میں نے کہا کیوں نہیں؟ میری ان سے بات ہوئی تھی، انہیں تو کوئی عذر نہیں۔ شاہ جی نے کہا: اچھا اگر ایسا ہے تو مولانا سے دن اور وقت مقرر کر کے مجھے اطلاع دو، میں ضرور تقریر کروں گا۔ میں پھر مولانا کے پاس آیا اور ساری بات بتائی۔ مولانا نے فرمایا: یوں کرو فلاں تاریخ کو تاریخ یاد نہیں بس دو تین دن کا وقفہ دیا ہوگا۔ صبح جس وقت میں درس دیا کرتا ہوں میں درس دوں گا وہ آ کر تقریر فرمائیں، میں بھی سنوں گا۔ میں نے یہ بات شاہ جی سے کہہ دی، شاہ جی نے کہا ٹھیک ہے، تم اعلان کر دینا میں از خود وہاں

پہنچ جاؤں گا، میرا انتظار کرنا۔ غرض اس دن کافی ہجوم ہو گیا۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نے یہ کہہ کر آغاز کیا کہ جب تک شاہ جی نہیں آتے میں معمول کے مطابق درس دوں گا۔ جب شاہ جی آگئے میں درس بند کر دوں گا۔ ان کی تقریر ہوگی۔ مولانا نے دس پندرہ منٹ ہی درس دیا ہوگا کہ شاہ جی تشریف لے آئے اور مسجد میں داخل ہوتے ہی جھک کر فوراً جگہ ملی بیٹھ گئے۔ مولانا نے انہیں دیکھا تو درس بند کر دیا اور فرمایا: آئیے شاہ صاحب! آپ کا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ شاہ جی نے کھڑے ہو کر کہا حضرت! آپ درس جاری رکھیں، تاکہ میں بھی کچھ علم کے موتی سمیٹ لوں، پھر بعد میں میں کچھ بیان کر دوں گا، مولانا نہ مانے اور شاہ جی کو تقریر کے لئے کھڑا کر دیا۔ گھنٹہ بھر تقریر ہوئی، پھر جلسہ درخواست ہو گیا۔ اب مسجد کے اندر محراب کے پاس مولانا اور شاہ جی تھے میں تھا اور مولانا کے عقیدتمند تھے۔ اب اس نجی گفتگو میں یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ مولانا نے یہ کیوں فرمایا تھا کہ شاہ جی میری مسجد میں تقریر کریں گے؟ جب دونوں اکابر بیٹھے، رکی خیریت کے بعد مولانا نے فرمایا: شاہ جی! یہ تو بتائیں کہ میں نے ہمیشہ قادیانیوں کے خلاف کام کیا۔ تحریریں لکھیں، مناظرے کئے مقابلہ کیا، ساری زندگی اسی کام میں لگا رہا، آپ نے مجھے قادیان کانفرنس میں کیوں نہیں بلایا؟ مجھے اس بات کا افسوس ہے، آپ نے میری خدمت کا لحاظ نہ کیا اور اس قدر بے توجہی برتی۔ بات بڑی معقول تھی، میں نے بھی دل میں مولانا کو اس سوال پر برحق سمجھا اور خیال کیا دیکھیں شاہ جی کیا وجہ پیش کرتے ہیں؟ مگر شاہ جی کا یہ حال تھا کہ دستی رومال جو ان کے ہاتھ میں تھا، اسے دونوں ہاتھوں سے مسلتے رہے، اور گردن جھکا کر یہی کہتے رہے حضرت! اس بے توجہی پر بہت شرمندہ ہوں، بس کچھ صورت حال ہی ایسی تھی کہ میں معافی کا خواستگار ہوں اور پوری جماعت کی طرف سے اس کو تاہی پر معافی چاہتا ہوں، آپ ہمارے بزرگ ہیں

اس غلطی کو نظر انداز فرمائیں، آپ کی اس سلسلہ میں خدمات روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں، بس بھول ہو گئی، حضرت معاف فرمائیں، اس بار بار معافی کی التجا پر حضرت مولانا کے چہرہ پر کبیدگی کی جو سلوٹیں تھیں کھلتی گئیں اور آخر چہرہ پر طمانیت و سکون پھر انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ شاہ جی نے رخصت چاہی، دونوں بزرگ کشادہ پیشانی سے بغلگیر ہوئے اور شاہ جی واپس ہوئے۔

واپسی پر شاہ جی کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا اور میں نے کہا: شاہ جی! اصل راز کا مجھے اب پتہ چلا مگر واقعی مجلس احرار سے بڑی چوک ہو گئی کہ مولانا جیسے مشہور عالم شخص کو قادیان میں نہ بلایا۔ اب میرے اس سوال پر؟ شاہ جی نے فرمایا: امین! یہ بات نہ تھی کہ ہم مولانا کو بھول گئے تھے۔ اصل واقعہ اور ہے وہ کانفرنس محض تبلیغی کانفرنس نہ تھی، وہ ایک سخت امتحان کٹھن گھائی اور زندگی و موت کا مرحلہ تھا، قید و بند کی مصیبتیں بھی تھیں۔ لاشی چارج، زد و کوب کرنے کا امکان بھی تھا، گولی چل جانے کا خطرہ بھی لاحق تھا۔ قادیان میں کانفرنس تو دشمن کے قلعہ پر نہتوں کے حملہ کے مترادف تھا، وہاں میں نے صرف انہی حضرات کو دعوت دی تھی جو ان مراحل میں ہمارے آزمائے ہوئے تھے۔ مولانا عمر رسیدہ بھی تھے اور کبھی ان مراحل میں سے گزرے بھی نہیں تھے۔ ہمیں ان کے متعلق کوئی تجربہ نہیں تھا کہ کسی کڑی آزمائش سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں کہ نہیں بیشک مولانا کی قابلِ قدر خدمات اور مناظرانہ صلاحیتوں کا ہمیں اعتراف ہے مگر ہمارا راستہ خطرناک راستہ تھا، خدا نہ کرے اگر مولانا اس پر پورے نہ اتر سکتے تو یہ نہ صرف ہماری بلکہ تمام اہل حق کے لئے ندامت کا سبب بنتا، اس لئے احتیاط اسی میں دیکھی کہ مولانا کو ایسے موقع پر تکلیف نہ دی جائے، مگر ایسی بات میں انہیں منہ پر تو نہیں کہہ سکتا تھا، بزرگ ہیں، عالم دین ہیں، بہر حال ہمیں ان کا ادب

ملفوظ ہے، اس لئے معافی ہی مانگ کر ان کو راضی کر لیا۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۳۱ تا ۱۳۲)

شیخ پر آنچ نہ آنے پائے :

تقسیم سے قبل لاہور دہلی دروازہ کے باہر جمعیت علماء ہند کی عظیم الشان کانفرنس شروع تھی۔ تمام انتظامی امور احراری رضا کاروں کے سپرد تھے۔ حضرت شاہ جی بھی تشریف فرما تھے۔ جب حضرت مدنیؒ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے حضرت مدنیؒ کی تقریر کے آغاز ہی میں مخالفین ایک دم مخالفانہ نعرے لگاتے ہوئے اٹھے اور گروہ در گروہ اسٹیج کی طرف بڑھنے لگے۔ شاہ جیؒ نے یہ نقشہ دیکھا تو فوراً بپھر کر کھڑے ہو گئے، تھ میں کلہاڑی تھی، حضرت مدنیؒ کی حفاظت میں کبھی دائیں کبھی بائیں کھڑے ہو کر مخالفین کی حرکات کا اندازہ کرتے رہے اور پکار پکار کر انہیں شرارت سے باز رہنے کی تلقین کی، مگر فساد ہی تھے کہ جیسے فیصلہ کر کے آئے ہوئے تھے کہ کسی کی نہیں سنیں گے اور بنا کام کر کے جائیں گے۔ جب شاہ جیؒ نے یہ دیکھ لیا کہ شرارت پسند حضرت کے یہ ہوتے جارہے ہیں، تو بڑھ کر حضرت کے آگے سینہ سپر ہوئے اور مائیک پر ہایت پر جوش انداز میں فرمایا :

”احرار کے جانبا ز رضا کارو ! میں جان گیا ہوں کہ ان لوگوں کی

نیت ٹھیک نہیں، میں نے تمہیں آج کے دن کے لئے جمع کیا تھا،

دیکھنا شیخ پر آنچ نہ آنے پائے۔“

احراری جانبا ز پہلے ہی سے اشارے کے منتظر تھے، شاہ جی کا حکم پاتے ہی

رضا کاروں نے دلیری کے وہ جوہر دکھائے کہ دس منٹ میں شر پسند عناصر سے پنڈال

الی ہو گیا۔ حضرت مدنیؒ نے تقریر فرمائی، کسی کو شرارت کی جرأت نہ ہوئی۔

دیانتداری کا فیصلہ :

تقسیم سے قبل مولانا شبیر احمد عثمانی نے باقاعدہ مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان فرمایا تو شاہ جی نے ایک جلسے میں فرمایا :

”سنو! کوئی دل میں یہ خیال نہ کرے کہ حضرت نے تمام ساتھی علماء کو کسی خاص بنا پر چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ حضرت کا یہ دیانتداری کا فیصلہ ہے، اب ان کی رائے صحیح ہے یا دوسرے علماء کرام کی، یہ الگ بحث ہے، مگر جو شخص حضرت پر بدیانتی کا الزام لگائے گا، یا انہیں برا کہے گا میں اس کے منہ میں خاک جھونک دوں گا“۔ (بخاری کی باتیں، ص: ۷۷)

تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا :

بہاولپور میں مقیم تھے۔ مولوی جمیل الدین صاحب انسپکٹر مدارس عربیہ تشریف لائے اور بتایا کہ ان کے استاد محترم قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی مرحوم (والد مولوی عبدالرحیم معلم جامعہ عباسیہ) بہاولپور میں رہائش پذیر ہیں اور شاہ جی سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ لیکن صاحب فراش ہونے کے باعث قیام گاہ تک نہیں آسکتے۔ شاہ جی کے پاس وقت بہت تھوڑا تھا تاہم اسی وقت تیار ہو گئے اور کوچہ گل حسن میں قاری صاحب مرحوم کی فرودگاہ پر تشریف لے گئے۔ حضرت قاری صاحب مرحوم بہت کمزور تھے شاہ جی کو دیکھ کر ان کا چہرہ خوشی سے متمتا اٹھا۔ کافی دیر تک بھولی بسری باتیں یاد دلاتے رہے۔ اور شاہ جی پر دعاؤں کے گجرے نچھاور کرتے رہے۔ جب شاہ جی نے اجازت طلب کی تو قاری صاحب مرحوم نے پانچ روپے کا نوٹ سرہانے کے نیچے سے نکال کر شاہ جی کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا شاہ جی نے معذرت کی اور فرمایا کہ

آپ جیسے بزرگوں کی خدمت تو مجھے کرنی چاہیے۔ آپ کیوں تکلیف فرمائیں۔ لیکن قاری صاحب مرحوم مصرر ہے۔ اور اپنی بات منوا کے چھوڑی۔ ایک ساتھی نے جھٹ اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور پورے ادب و احترام کے ساتھ حضرت قاری صاحب مرحوم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جو انہوں نے قبول فرمایا۔ شاہ جی کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار ہویدا ہو گئے اور باہر آ کر فرمایا: ”تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔“

تقویٰ :

سید امین گیلانی فرماتے ہیں :

فالج کے پہلے حملہ کے بعد جب شاہ جی کی طبیعت کچھ سنبھل چکی تھی۔ میں ملتان خدمت میں حاضر ہوا تو چارپائی سے اتر کر فرش پر آ بیٹھے۔ اشعار سنتے رہے اور سناتے بھی رہے۔ پھر باتوں سے باتیں نکلتی رہیں۔ قرآن و حدیث، تاریخ و ادب، لطائف و ظرائف غرض محفل خوب جمی ہوئی تھی کہ اتنے میں ڈاکیہ آیا اور ڈاک دے گیا شاہ جی نے اپنے دوسرے فرزند مولانا سید عطاء الحسن بخاری سے کہا بیٹا تم پڑھ کر سناتے جاؤ بھائی عطاء الحسن نے جب ایک خط کے اس فقرہ کو ختم کیا کہ :

”آپ نے دریافت فرمایا ہے کہ یہ رقم کیسی ہے؟ یہ روپیہ زکوٰۃ کا ہے جس جگہ مناسب ہو دیدیں۔“

یہ فقرہ سن کر شاہ جی نے بے ساختہ کہا الحمد للہ الحمد للہ۔ میں کچھ چونکا کہ یہ زکوٰۃ کے روپے پر الحمد للہ کیسی؟ جب ڈاک سن کر فارغ ہوئے تو میں نے عرض کیا شاہ جی! یہ زکوٰۃ کے روپیہ پر الحمد للہ سمجھ میں نہیں آئی فرمایا کچھ دن ہوئے میرے نام ایک سو روپیہ کا منی آرڈر آیا تھا جس میں تفصیل کچھ نہ تھی کہ یہ روپیہ جماعت کے لئے ہے یا

میری ذات کے لئے ہے۔ پھر کچھ دوست مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے صدقات اور زکوٰۃ کا روپیہ بھی بھیج دیتے ہیں میں وہ روپیہ انہی حدود شرعی میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ مگر ان صاحب نے کچھ بھی تو نہ لکھا۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ زکوٰۃ تھی۔ پھر اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال کر صدری کی طرف اشارہ کر کے فرمایا وہ روپیہ میرے پاس محفوظ ہے اس لئے الحمد للہ کہا میرا ذہن فوراً اس طرف گیا کہ ساری عمر انگریز کی مشینری کانگریس اور سکھوں سے روپیہ لینے کا الزام شاہ جی پر لگاتی رہی۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اس روپے کا کسے علم تھا، جس کی شاہ جی نے اتنی تحقیق اور فکر کی ہو۔ (بخاری کی باتیں ص: ۶۲)

تصویر اور آواز :

۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ حضرت امیر شریعتؒ کی تصویر اخبارات میں شائع ہوئی۔ ممبئی کانگریس میں مس سروجنی نائیڈو کی تقریر سن رہے تھے کہ کیمرے کی آنکھ نے انہیں غافل پا کر فوٹو چوری کر لیا۔ اور پھر یہی تصویر متحدہ ہندوستان کے ہفتہ وار انگریزی اخبار ”ممبئی کرانیکل“ اور روزنامہ ”امرت بازار پتریکا“ میں شائع ہوئی۔ دوسری تصویر ”ڈڈم“ کے جیل خانہ میں کشمیر کے کیپٹن عبدالرشید کے ساتھ ان کے اصرار پر بنگالی نوجوانوں نے اتاری، جو ملاقات کے لئے آئے تھے۔

امیر شریعتؒ بذات خود تصویر کے خلاف تھے، اس کے باوجود ان کی تصویریں گاہے گاہے دیکھنے میں آئیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ان میں ان کی رضا شامل نہ تھی۔ ۱۹۳۵ء میں ملتان کے مشہور عکاس چودھری بشیر احمد نے چوک حسین آگاہی میں جب اپنا نگار خانہ ترتیب دیا تو کسی بہانے حضرت امیر شریعتؒ کو وہاں لے گیا۔ چوہدری بشیر احمد کے والد ڈاکٹر رحیم بخش مرحوم کی تصویر وہاں آویزاں تھی۔ مرحوم

اگرچہ حضرت امیر شریعتؒ کے مرید نہیں تھے، پھر بھی انہیں حضرت امیر شریعتؒ سے بڑی عقیدت تھی، حضرت امیر شریعتؒ کی نظر بے اختیار ان پر جا پڑی اور کچھ دیر تک تصویر کو دیکھتے رہے۔ اس موقع پر کیمرہ مین نے بڑی حکمت سے کیمرہ کو تصویر کی پناہ میں رکھ کر وقت کا تعین کر دیا تھا۔ اچانک ٹک کی آواز پر امیر شریعتؒ چونک پڑے، اور بڑی حیرت سے پوچھا ”یہ کیا؟“ آخر انہیں پتہ چل گیا کہ میری تصویر اتار لی گئی ہے۔ اس پر سخت ناراض ہوئے، اور فوٹو گرافر سے وعدہ لیا، یا تو اسے ضائع کر دینا یا عام نہ کرنا، لیکن اس کے باوجود یہ تصویر اخبار والوں کے ہاتھ آ گئی، اور یہ وہی تصویر ہے جو اخبارات میں عام شائع ہوتی رہتی ہے، اس پر حضرت امیر شریعتؒ جب کبھی فوٹو گرافر سے ملتے تو اسے ”میرے آذر“ کہہ کر پکارتے۔

۱۹۵۷ء میں روزنامہ ”آزاد“ کے لئے حضرت امیر شریعتؒ کی تصویر بنانی

چاہی، لیکن انہیں پتہ چل گیا اور اس قدر بگڑے کہ دو سال تک تصویر بنانے والے سے بات نہیں کی۔

اپنی تقریر پر استغفار :

۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء میں مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مسعود (موجودہ ایڈمنسٹریٹر

محکمہ اوقاف) کی خواہش پر مولانا مجاہد الحسنی نے ایک اجتماع میں ٹیپ ریکارڈ لگا دیا، تاکہ امیر شریعتؒ کی تقریر ریکارڈ کی جاسکے۔ اس جلسے کی صدارت بھی ڈپٹی کمشنر ہی کر رہے تھے اور ٹیپ ریکارڈ بھی انہی کا تھا۔ ان دنوں مسٹر مسعود شاید واحد آدمی تھے جن کے پاس یہ آلہ تھا۔ مسٹر مسعود باوجود سرکاری گزٹڈ آفیسر ہونے کے ہمیشہ کھدر پوش رہے اور ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ امیر شریعتؒ نے ہمیشہ ان سے محبت کی۔

تقریر کے دوسرے دن انہوں نے امیر شریعتؒ کو چائے پر بلایا اور دوسرے کمرے میں تقریر کا ریکارڈ لگایا۔ امیر شریعتؒ نے اپنی آواز پہچان لی اور بڑے حیران ہوئے، جب انہیں اس نئی ایجاد کا علم ہوا، تو اسے بڑا پسند کیا، اس پر گھر میں آ کر کہا:

”آج میں نے اپنی تقریر سنی ہے، میں بہت اچھا بول لیتا ہوں“

یہ کہہ کر استغفر اللہ پڑھا اور رونے لگ گئے۔

میری تصویر میرے افکار ہیں :

شورش کاشمیری رقم طراز ہیں :

”ایک دفعہ کسی فوٹو گرافر نے ان کی تصویر لینا چاہی تو چہرے پر رومال ڈال لیا اور اُسے ڈانٹ کر بٹھا دیا۔ کیا کرتے ہو میاں؟ میری تصویر بنا کر کیا کرو گے؟ میری تصویر میرے افکار ہیں، میرے خیالات کو اتار سکتے ہو تو دل کے فوکس میں اتار لو، یہ سب سے اچھی تصویر ہوگی۔ دنیا میں نہ سہی عاقبت میں کام آئے گی اور ہاں میری تصویر....؟“

میری تصویر میرا یہ بیٹا ہے :

بیٹا پاس بیٹھا ہوتا تو اس سے کہتے کھڑے ہو جاؤ شاہ جی۔ فوٹو گرافر سے مخاطب ہو کر.... میری تصویر میرا یہ بیٹا ہے، اس کو دیکھ لو۔ اور ہاں میری نظر سے دیکھنا۔ کتنی اچھی تصویر ہے۔

سیاست میں مقلد تھا شریعت میں نہیں :

شاہ جی کو مصوری اور عکاسی کی خلقی اور غیر خلقی بحثوں سے کوئی واسطہ نہ

تھا۔ وہ انہیں کٹ جتی سمجھتے کسی نے عرض کیا۔ فلاں فلاں بزرگ کی تصویر بن چکی ہے۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کی۔ جن سے شاہ جی کو خصوصی ارادت تھی۔ شاہ جی فرماتے تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں سیاست میں ان کا (مولانا آزاد کا) مقلد تھا شریعت میں نہیں۔ میرے لئے ان کا کوئی فعل حجت نہیں۔ بابو! میرے میاں مولانا علیؒ نے فوٹو کھینچوانے سے منع فرمایا ہے ان کے قول کے بعد سب اقوال ہیج ہیں۔ (سوانح افکار ص ۱۹)

چوک میں رکھ کر جوتے مارنا :

خان لیاقت علی خان مرحوم کے دور میں جب انتخابات میں کوئی مرزائی الیکشن میں کامیاب نہ ہو سکا بلکہ جتنے مرزائی امیدوار تھے، مجلس تحفظ ختم نبوت نے ان کے علقوں میں ایسے ڈیرے لگائے کہ سب کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ پھر مجلس کی طرف سے لاہور میں یوم تشکر منایا گیا۔ شاہ جی کی وہ تقریر بڑی معرکہ آراء تھی جب تقریر کر رہے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چہرہ کے گرد نور کا ہالہ ہے، کسی اخبار کے کیمرہ مین نے تصویر اتاری تو کیمرہ کے فلش کے چمکنے سے شاہ جی سمجھ گئے کہ اس نے تصویر اتاری ہے، جھٹ فرمایا : ”کر گئے اپنا کام“۔ پھر گرج کر عوام سے کہا :

”جب صبح کے اخبار میں میری تصویر چھپ کر آئے تو تمہیں خدا کی

قسم ہے چوک میں رکھ کر جوتے مارنا اس کسرنفی پر تمام مجمع حیران رہ

گیا“۔ (بخاری کی باتیں، ص: ۱۲۸)

غالباً اشارہ اس طرف تھا کہ فوٹو اور تصویر کا اہتمام بت پرستی اور شرک کا موہم

ہے۔ دوسرا اشارہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خطیب کی کوتاہی اور غفلت کے نتیجے میں میری

تصویر کھینچ گئی۔ لہذا اس کی توجیر نہیں بلکہ تحقیر کرنی چاہئے۔

اگر ہم دنیا میں عزت چاہتے ہیں، مال و دولت چاہتے ہیں، جائز شہرت چاہتے ہیں۔ خدا اور اس کی مخلوق کی رضا چاہتے ہیں تو ہمیں خلق خدا کی بھلائی کے کام کرنا ہوں گے۔ مسکینوں کی امداد کرنا ہوگی۔ عجز کا رویہ اختیار کرنا ہوگا تقویٰ اور خشیت الہی کو شکار بنانا ہوگا ہر بھلے اور اچھے کام پر دوام اختیار کرنا ہوگا تب کہیں جا کر گوہر مقصود ہاتھ آئے گا۔



باب چہارم

قرآن سے محبت، انگریزوں سے نفرت

سراپا علم و عمل

قرآن مجید سے امیر شریعتؒ کو بے پناہ محبت تھی۔ فرمایا کرتے دوستو! قرآن کریم کو جب سے پڑھا ہے کوئی اور کتاب پڑھنے کو دل نہیں کرتا۔ قرآن شریف خود بولتا ہے کہ میں محمدؐ پر اتارا گیا ہوں۔ ایسی ہستی اس کتاب کو لے کر آئی جو امانت دار ہے اللہ اللہ ایسی کتاب کی بلاغت کے صدقے جائیے جس کے چیلنج کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا۔ امیر شریعتؒ کے والد محترم ضیاء الدین صاحب قرآن مجید کے پختہ حافظ تھے۔ ان کی آغوش تربیت ہی میں شاہ جی نے چھوٹی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔

قاری عمر عاصمؒ سے تلمذ :

شاہ صاحب اٹھارہ سال کے پٹے میں تھے۔ محمد عمر عاصم نامی کویت کا ایک شخص جو سلطان عبدالحمید والی ترکی کے بچوں کو قرآن کریم پڑھانے پر مامور تھا۔

سلطان کی اس سے قدرے ناراضگی ہو گئی اور وہ ترکی چھوڑ کر ہندوستان کی سیاحت کے لئے نکل آیا۔ سیر و تفریح کے دوران جب وہ پٹنہ آیا تو یہاں کی آب و ہوا نے اسے متاثر کیا اور ایک مدت وہ یہیں رہا۔ قدرت نے اس کے گلے میں رس اور آواز میں سوز عنایت کیا تھا۔ وہ جب کبھی موج میں آ کر قرآن کریم پڑھتا تو غیر مسلم بھی مسجد کے گرد جمع ہو جاتے۔

شاہ جیؒ کو اخذ فن میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ اکثر محمد عمر عاصم کے لہجہ میں قرآن کریم پڑھتے۔ ایک دن شاہ جی ان کی نقل کر رہے تھے کہ ان کی نگاہ میں آگئے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور شاہ جیؒ کو فنِ قرأت سکھانے کے لئے اپنے تلمذ میں لے لیا۔ نتیجہً شاہ جی قرأت قرآن میں یکتا ہو گئے۔ قاری محمد عمر عاصم کچھ عرصہ بعد کویت لوٹ گئے۔ ایک زمانہ میں امرتسر کے مولوی عبداللہ کویت گئے تو قاری صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی۔ قاری صاحب نے ان سے پوچھا ایک نوجوان سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مجھ سے قرآن پڑھا کرتا تھا۔ اس سے واقف ہو؟ مولوی صاحب موصوف نے قاری عمر عاصم کو بتایا کہ وہ عطاء اللہ شاہ اب ملک گیر شہرت کا مالک ہے۔ پورا ہندوستان اس کا شیدائی ہے۔ قاری عمر عاصم یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔

(سوانح و افکار ص: ۴۵)

قرآن کا اعجاز :

شاہ جی فرمایا کرتے ہیں قرآن مجید کے علاوہ کوئی دوسری کتاب پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہوں۔ جو کچھ ہے قرآن و سنت اور فقہ میں ہے۔ جو کچھ اس کے باہر ہے وہ باطل ہے اور ایک باطل شے کے مطالعہ کے لئے میرے پاس وقت

نہیں ہے۔ آج دنیا قرآن کو چھوڑ کر دوسری کتابوں کی طرف نگاہ کر سکتی ہے تو میں کیوں نہ دوسری کتابوں سے روگردانی کر کے اپنی تمام تر توجہ قرآن پر مرکوز کروں۔ میں تو قرآن کا مبلغ ہوں۔ میری باتوں میں اگر تاثیر ہے تو صرف قرآن کی وجہ سے ہے۔ جو چیز مجھے قرآن سے الگ کر دے اُسے آگ لگا دوں۔

قرآن کریم کا اعجاز تھا کہ حضرت امیر شریعتؒ ماحول پر چھا جاتے تھے اور مومن و کافر دوست دشمن اور اپنے پرائے سب کے سب اعتراف حق سے گردنیں جھکا لیتے۔ آپ قرآن کریم کے ترجمہ کے لئے حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمہ کو اولیت دیتے اسی کو بیان فرماتے اسی کی تلقین کیا کرتے اور اس ترجمہ کی خوبی بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔

شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ قرآن :

شاہ صاحب کے ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ مفرد کا مفرد سے اور جمع کا جمع سے اور محاورات عرب کا ہندی محاوروں سے ترجمہ فرماتے اگر قرآن ہندوستان میں اور اردو زبان میں نازل ہوتا کم و بیش وہی زبان ہوتی جو شاہ عبدالقادر نے لکھی ہے۔“

قارئین کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ ولی اللہی خاندان کے لعل جہاں تاب تھے آپ نے قرآن کریم کا ترجمہ چالیس برس میں مکمل کیا اور غالباً روزے بھی مسلسل رکھتے تھے مشہور ہے کہ دلی کی جامع مسجد میں پتھر سے ٹیک لگا کر آپ ترجمہ لکھا کرتے تھے وہ پتھر بھی درمیان سے گھس گیا تھا (اللہ اکبر)

حضرت امیر شریعتؒ کی روح اور وجدان قرآن کریم میں رچ بس گیا تھا۔

بعض آیات کا ترجمہ تو ایسا بھی کرتے جو مکتوب و منقول نہ ہوتا مگر ماحول، واقعات اور طبقات کی مناسبت سے ایسا فٹ بیٹھتا کہ علماء بھی عیش عیش کراٹھتے اور داد و تحسین میں بے اختیار ہو جاتے۔

ایک مجلس میں جو علماء سے کچھا کھچ بھری ہوئی تھی۔ حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہ تشریف فرما تھے۔ گفتگو کے دوران اچانک حضرت شاہ صاحب نے علماء سے پوچھا کہ آپ لوگ ذی علم ہیں درس و تدریس آپ کا مشغل ہے۔

وَمَا دُعَوُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ - (مؤمن: ۵۰)

کا ترجمہ کیا کریں گے؟ تمام علماء نے وہی جو مکتوب و مروج ترجمہ ہے اسی کا اشارہ کیا ہے لیکن حضرت امیر شریعتؒ نے فرمایا: میرے نزدیک یہاں ”ما“ نافیہ ہے اور ترجمہ یوں ہوگا: ”نہیں پکارا کافروں کی مگر بھونک“۔

حضرت لاہوری قدس سرہ نے سن کر خوب داد دی۔

علماء خدا کی رحمت :

شاہ جیؒ کے صاحبزادے مولانا عطاء الحسن لکھتے ہیں :

غالباً سن ۱۹۵۶ء کی بات ہے کہ خیر المدارس کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد پر ملک بھر سے آئے ہوئے علماء حضرات شیخ الحدیث مولانا عبدالحق (اکوڑہ خٹک) حضرت مولانا محمد یوسف بنوری حضرت مولانا محمد عبداللہ رائے پوری اور دیگر اکابر علماء حضرت مولانا خیر محمد صاحب کی معیت میں حضرت امیر شریعتؒ کی عیادت کے لئے ان کے دولت کدہ پر تشریف لائے راقم الحروف (عطاء الحسن) بھی موجود تھا۔ حضرات کی خدمت پر مامور تھا۔ چائے لایا اور ماہر بھی چائے نوشی اور بیمار پرسی کے بعد واپسی کے لئے حضرات نے اجازت چاہی تو فرمایا ”میں کیسے کہوں کہ رحمت

میرے گھر سے چلی جائے آپ کا یوں تشریف لانا مجھنا کارہ پر اللہ کا کرم ہے اور جی تو یہ چاہتا ہے کہ آپ یونہی بیٹھے رہیں اور میں رحمتوں کی بارش میں لطف و کیف سردی پاتا رہوں۔“

محفل عشاق :

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق نے اکوڑہ خٹک واپس جانا تھا۔ انہوں نے بڑی معذرت کے ساتھ فرمایا: جی تو ہمارا بھی آپ سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا حضرت بنوری نے بھی بڑی عذر خواہی سے رخصت چاہی تو حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔ دعا فرمائیں جب دعا ہو چکی تو آپ نے فرمایا: وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ۔ اور ساتھ ہی ترجمہ یوں فرمادیا (پنجابی میں) (تے پوری پاسا ڈی نال نیکاں دے)

حضرت الاستاد مولانا خیر محمد نے اس ترجمہ کی اتنی داد دی کہ مجمع حیران ہو گیا۔ آپ اس قدر داد و تحسین کے عادی نہ تھے لیکن میں نے دیکھا کہ مولانا کا چہرہ تمٹما اٹھا اور خوشی سے باچھیں تک کھل گئیں اور آپ بار بار فرماتے ماشاء اللہ ماشاء اللہ اور فرماتے ”اس سے بہتر لفظی ترجمہ اور ہو نہیں سکتا ماشاء اللہ یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔“ اس پر حضرت امیر شریعت نے فرمایا کہ اس ترجمہ سے غلام احمد قادیانی کی توفی کی رگ بھی کٹ جاتی ہے کہ توفی کا معنی موت نہیں یوں ہی اس نے کھینچ تان کر توفی کو مردوں پر فٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس پر پھر حضرت مولانا اور تمام علماء نے خوب داد دی اور یوں یہ محفل عشاق امید فردا پر برخواست ہوئی..... ع اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبا لیکر

حضرت رائے پوری کی شہادت :

حضرت امیر شریعت کی تلاوت قرآن اور بیان و تبیان قرآن کی تعریف مرشد

احرار حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ ضریحہ سے خود راقم نے یوں سنی۔
جس کا مفہوم یوں ہے :

”اجی ہمارے حضرت شاہ صاحب جیسا کون ہوگا ایسے جذبوں اور عمل والا
شخص تو ہم نے دیکھا ہی کم ہے آپ آیت من آیات اللہ تھے۔“

”اگر شاہ صاحب چاہتے تو دنیا میں بادشاہی کرتے لیکن آپ نے تو حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں قرآن اور فقر اختیاری کو زینتِ دنیا اور تفاخر پر ہمیشہ ترجیح دی
ہمارے شاہ صاحب بے مثال انسان ہیں۔ آپ نے قرآن کی خدمت سے وہ مقام
حاصل کیا جو بڑے بڑوں کے نصیب نہ ہوا۔ ان کی باتیں تو عطا اللہی ہوتی ہیں۔“

(امیر شریعت نمبر ص: ۲۷۲)

گل و بلبل :

جانبا زمرزا بیان کرتے ہیں :

حضرت امیر شریعتؒ اور احرار گل و بلبل کی طرح لازم و ملزوم ہیں شاہ جی کا
ذکر خیر احرار کے ذکر کے بغیر ادھورا اور احرار کا ذکر شاہ جی کے بغیر بیکار محض ہے۔ آپ
نے چونکہ اپنی ملی زندگی مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم پر ہی بتادی اور اسی پلیٹ فارم
سے آپ نے دشمنِ دین و ایمان فرنگی سامراج، اس کے خود کاشتہ پودے مرزائیت اور
فرنگی کے ٹوڈیوں کو پورے ہندوستان میں لکارا اور ان کی دنیاوی حیثیت کو لتاڑا اور بیچ
چوراہے میں انہیں پچھاڑا۔ پیرانِ تسمہ پا اور علماء سوء کے بیچ در بیچ بدرنگ عماموں کے
بیچ و خم کھولے ان کی قبائے زور کو تار تار کیا اور ان کی گدیوں کی چولیس ڈھیلی کر دیں آپ
رمایا کرتے تھے۔

مجھے قرآن کے سوا کچھ نہیں آتا :

”علماء کرام، پیران عظام ! میں نے قرآن کی ایک آیت پڑھی تو اس نے مجھے چین سے نہ بیٹھنے دیا میں اللہ کے سب سے بڑے دشمن سے لڑ گیا اور اپنی زندگی کے حسین گیارہ سال جیل میں گزار دیئے زندگی سفر میں کٹ گئی۔ لاکھوں انسانوں کے دل سے فرنگی کا خوف دور کیا لیکن قربان جاؤں تمہارے ہاضمہ کے آپ پورا قرآن کریم اور لاکھوں احادیث ہضم کر گئے مگر بس سے مس نہ ہوئے“

ان زخم خوردہ لوگوں کے حاشیہ نشین شاہ صاحب کے تابڑ توڑ عوامی حملوں سے بہت مضطرب ہوئے تو ایک ”کرنٹے“ نے کہا عطاء اللہ شاہ کو قرآن کے سوا کیا آتا ہے تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا۔

”ہاں بھائی واقعی مجھے قرآن کے سوا کچھ نہیں آتا۔ الحمد للہ، الحمد للہ، ثم الحمد للہ! کہ مجھے قرآن کے سوا کچھ نہیں آتا۔ میری دعا ہے کہ قرآن کے سوا مجھے کچھ بھی نہ آئے۔ لیکن یہ صاحب جو مجھے طعنہ دیتے ہیں ان کا یہ عالم ہے کہ خود انہیں قرآن ہی نہیں آتا۔ ایک دفعہ لاہور دفتر احرار میں چند نوجوان آئے اور انہوں نے قرآن اور دیگر کتابوں کے موازنہ کی گفتگو کی تو آپ نے فرمایا :

”میاں تم قرآن کریم کو الہامی کتاب مان کر نہ پڑھو عربی ادب عالیہ کی کتاب سمجھ کر ہی پڑھ لو تو تمہاری روح پاک ہو جائے گی۔“

حضرت امیر شریعتؒ کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ آپ نے ”یونیورسٹائزڈ“ طبقہ سے مخاطب ہو کر فرمایا :

”بابو لوگو! قرآن کریم ہماری طرح نہ سہی اقبال کی طرح پڑھ لو! دیکھو اقبال

نے قرآن ڈوب کر پڑھا تو تہذیب فرنگ پرہلہ بول دیا۔

قرآن سے محبت انگریز سے نفرت :

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں دنیا میں ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور وہ ہے قرآن۔ اور مجھے صرف ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے انگریز۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں نے میرے ان دو جذبوں میں بلا کی شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ محبت اور نفرت کے یہ دو زاویے ایسے ہیں کہ جن دماغوں میں ان کا سودا ہوان کے لئے پابہ زنجیر ہندوستان میں جیل خانہ زندگی کے سفر کا ایک ایسا موڑ ہے۔ جہاں کبھی طلب کے خیال سے رکنا پڑتا ہے کبھی فرض کی کشاکش لے آتی ہے اور کبھی جستجوئے منزل کا تقاضا پہنچا دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب جیل خانے کی ”آبرو“ پر بوالہوسوں نے پیش دستی شروع کی ہوئی ہے۔ اور ع جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

زمانہ تحریک خلافت کی یادیں :

لیکن ۲۱ء کے تحریک خلافت کے زمانہ قید پر جب غور کرتا ہوں تو نگاہوں میں ایک تصویری کھینچ جاتی ہے۔ میانوالی ڈسٹرکٹ جیل میں احباب کی ایک یادگار بزم، سب اہل ذوق، اہل نظر، اہل دل اور اہل علم جمع تھے۔ مولانا احمد سعید دہلوی حدیث پڑھایا کرتے۔ عبدالمجید سالک دربار اکبری کا سبق دیتے، مولوی لقاء اللہ کی نئی تلی باتیں گفتگو میں رس پیدا کرتیں۔ صوفی اقبال پانی پتی کے ”اشقلے“ خدا کی پناہ! عبداللہ چوڑی والے کی ٹکسالی گالیاں تبرک کی طرح تقسیم ہوتیں اور آصف علی کھلتے تو پھولوں کے تختے بچھ جاتے۔ جی خوش کرنے کے لئے مشاعروں کا اہتمام ہوتا۔ کبھی

سالک صدر ہوتا کبھی آصف اور کبھی..... ع
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند
اختر علی نے ایک دفعہ معرکہ کی غزل سنائی۔ سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میرا ماتھا
ٹھٹکا کچھ یاد سا آ گیا۔ میں نے اختر سے کہا۔ میان مقطع کہو۔ وہ کسی قدر جھینپا میں نے
کہا تو لو پھر مجھ سے سنو مقطع یہ تھا.....

جو مے کشی سے ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو

امیر مسجد جامع میں آج امام نہیں

(حیات امیر شریعت ص: ۷۸)

لعنت بر پدر فرنگ :

شورش کاشمیری بیان کرتے ہیں :

ایک دفعہ میں نے ان کے بچوں کے متعلق عرض کیا۔ شاہ جی! انہیں انگریزی
پڑھائیے۔ انگریزی مدرسوں میں بھیجئے اور ممکن ہو تو وکیل بنائیے۔ آئندہ معاشرے کی
باگ ڈور قانون دانوں کے ہاتھ میں ہے۔ بس اس پر بگڑ گئے۔ تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ
انہیں زندہ دفنادو۔ لعنت بر پدر فرنگ۔

فرنگی بابا :

میاں یہ سب کچھ میں نے بھی پڑھا ہے تم فرنگی بابا کو نہیں جانتے اس نے
روحیں قتل کر دی ہیں، روہیں۔ اسلام اٹھ گیا مسلمان رہ گئے۔ ہائے اکبر کس وقت یاد آیا
ہے.....

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

میرا ایک ہی دشمن ہے انگریز :

فرمایا۔ یہ فیصلہ تو آپ کیجئے کہ میری کنٹری بیوشن (انگلش سپیل) کیا ہے میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہن سے انگریز کو نکال پھینکا ہے میں نے کلکتہ سے خیبر تک اور سرینگر سے راس کماری تک دوڑ لگائی ہے وہاں پہنچا ہوں جہاں دھرتی پانی نہیں دیتی۔ ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ غیر ملکی طاقت سے گلو خلاصی حاصل ہو۔ اس ملک سے انگریز نکلیں، نکلیں کیا، نکالے جائیں۔ تب دیکھا جائے گا کہ آزادی کے خطوط کیا ہوں گے؟ آپ تو نکاح سے پہلے چھو ہارے باٹنا چاہتے ہیں۔ پھر میں کوئی دستوری نہیں، سپاہی ہوں۔ تمام عمر انگریز سے لڑتا رہا اور لڑتا رہوں گا۔ اگر اس مہم میں سور بھی میری مدد کریں تو میں ان کا منہ چوم لوں گا۔ میں تو ان چونٹیوں کو شکر کھلانے کے لئے تیار ہوں جو صاحب بہادر کو کاٹ کھائیں خدا کی قسم! میرا ایک ہی دشمن ہے۔ انگریز۔ اس ظالم نے نہ صرف مسلمان ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی بلکہ ہمیں غلام رکھا۔ مسلمانوں میں جعلی نبی پیدا کئے۔ پھر اس خود کاشتہ پودے کی آبیاری کی اور اب اس کو چھیتے بچے کی طرح پال رہا ہے۔ (سوانح و افکار ص ۲۲-۲۷)

میرا ملک چھوڑ کر تشریف لے جائیے :

یہ ۱۹۳۰ء کا اواخر ہے شاہ جی جیل میں ہیں۔ ایک اعلیٰ انگریز حاکم معائنے کے لئے آتا ہے۔ اور امیر شریعت سے مخاطب ہوتا ہے۔
کہئے کیا حال ہے آپ کا؟
اللہ کا شکر ہے۔ بے نیازانہ جواب ملتا ہے۔

کوئی سوال؟ با اختیار حاکم دوبارہ پوچھتا ہے۔

میں صرف اللہ سے سوال کرتا ہوں۔

نہیں میرا مطلب ہے کہ کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔

شاہ جی سراٹھا کر پورے وقار اور متانت سے جواب دیتے ہیں۔

جی ہاں! آپ میرا ملک چھوڑ کر تشریف لے جائیے۔

حاکم خاموش ہو کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

انگریز اور مرزائی :

ایک محفل میں شاہ جی نے فرمایا: ”میری دوستی اور دشمنی صرف ایک ہی دفعہ

ہوتی ہے“۔ اس پر ایک شعر پڑھا.....

دل نیست کبوتر کہ پر و باز نشیند

از گوشہ باے کہ پریدیم پریدیم

بس اسے کنارہ کشی سمجھئے یاد دشمنی۔ میری طرف سے صرف اتنا ہوتا ہے الحمد للہ

کہ میں نے آج تک نہ کسی کے متعلق برا سوچا ہے اور نہ ہی برا کیا ہے۔ ہاں انگریز اور

مرزائی کے متعلق جہاں تک بس چلا برا سوچا اور کیا بھی۔

اس پر مولانا یاسین نے کہا یہ تو پھر ضد ہے۔ امیر شریعتؒ نے پھر فرمایا :

”جاہل! یہ ضد نہیں ایمان ہے حدیث میں کیا پڑھا ہے... کہ مومن کو دو مرتبہ

ایک ہی سوراخ سے ڈسا نہیں جاسکتا“۔ (حیات امیر شریعت ص ۲۳۲)

اب یہ ٹوپی نہیں اترے گی :

ایک دفعہ شاہ جی نے ڈم ڈم جیل کا قصہ سنایا کہ انگریز کے خلاف تحریک میں

ڈم ڈم جیل میں بہت سے قومی رضا کار بھی تھے اور حضرت مدنیؒ بھی تھے مگر ہم اکٹھے نہ تھے۔ حضرت مدنیؒ مجھ سے الگ دوسرے احاطہ میں بند تھے۔ ایک روز میں نے اڑتی اڑتی یہ خبر سنی کہ ”انسپکٹر جیل خانہ جات آیا ہے اس کا نام سمن تھا (یہ انگریز آخر کار بنگال میں انقلاب پسندوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا) اور جن رضا کاروں کے سر پر گاندھی ٹوپی دیکھتا ہے اسے وہ خود اتار کر پاؤں میں مسل دیتا ہے۔ شاہ جی فرمانے لگے، اس خبر سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا، اچھا اگر میری طرف آ گیا تو اس کی خیر نہیں اور میں نے سوچ لیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا اگر شرافت سے پیش آیا تو شرافت سے جواب دوں گا، اگر اس نے میری ٹوپی پر ہاتھ بڑھایا تو میں بھی اسے گرا کر شہ رگ ایسی کاٹوں گا کہ بیچ نہ سکے۔ شاہ جی نے فرمایا: آخر وہ وقت آ گیا، میں احاطہ میں ٹہل رہا تھا کہ احاطہ کا دروازہ کھلا ”انسپکٹر جیل خانہ جات“ داروغہ جیل جو ہندو تھا اور چند جیل وارڈن دیکھے کہ میری طرف آرہے ہیں۔ اس انگریز نے آتے ہی کہا، یہ ٹوپی اتار دو، میں نے بے باکی سے جواب دیا نہیں اتاروں گا۔ وہ غصے میں آگے بڑھا اور ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میری ٹوپی اتارے میں نے پہلے ہی پینترا جمایا ہوا تھا۔ (اس موقع پر شاہ جی نے اٹھ کر وہ نقشہ عملاً ظاہر فرمایا) فوراً دایاں ہاتھ اس کے دائیں ہاتھ کی کلانی پر ڈال کر ایسا جھٹکا دیا کہ اس کے حواس خطا ہو گئے اور یکدم نرمی اختیار کر لی۔ ادھر داروغہ جیل نے بیچ بچاؤ کر دیا۔

شاہ جی فرمانے لگے : اگر وہ اب بھی باز نہ آتا تو میرا پکا ارادہ یہی تھا کہ میرے پاس اور تو کچھ ہے ہی نہیں اس کی شہ رگ دانتوں سے کاٹ دوں گا، مگر وہ میرے تیور پہچان کر یکدم نرمی اختیار کر گیا، اور کہنے لگا کہ آپ کو اس ٹوپی کا احترام

کیوں ہے؟ یہ تو گاندھی جو ایک ہندو ہے اس کی ٹوپی ہے۔ شاہ جی نے کہا یہ غلط ہے یہ اجمل کیپ ہے اسے حامد کیپ بھی کہتے ہیں۔ امر وہ مراد آباد اور یوپی کے بہت مقامات میں اس کو اکثر مسلمان شرفاء پہنتے ہیں۔ اس نے کہا بہر حال آپ یہ ٹوپی میرے کہنے پر اتار دیں۔ میں نے جیل میں سب کی ٹوپیاں اتروادی ہیں۔

شاہ جی! فرمانے لگے میں نے کہا مگر یہ ٹوپی تمہارے کہنے سے نہیں اتاروں گا جب تک تن پر گردن موجود ہے ٹوپی سر سے نہیں اترے گی۔ اس نے کہا: اگر میرے کہنے پر نہیں اتاریں گے تو اور کس کا حکم مانیں گے۔ میں نے کہا: ہاں! حکم دینے والا اس جیل میں ایک ہی شخص ہے وہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ہیں، اگر وہ حکم دیں کہ ٹوپی اتار دو تو فوراً اتار دوں گا۔

شاہ جی فرماتے ہیں ادھر حضرت شیخ کو بھی تمام کیفیت کا پتہ لگ چکا تھا۔ حضرت نے سر سے پگڑی اتار کر اس کے شملے کو پھاڑ کر جلدی جلدی دو چار ٹانگے بھرے، ادھر سے یہ انگریز پہنچا، ادھر حضرت نے ٹوپی بنا کر سر اقدس پر رکھ لی۔ اس انگریز نے جب حضرت سے یہ سوال کیا تو حضرت نے فرمایا: میں نے ہمیشہ پگڑی ہی باندھی ہے مگر جب مجھے پتہ چلا کہ تم نے جیل میں ٹوپیاں اتارنے کی مہم شروع کی ہوئی ہے تو پگڑی سے کپڑا کاٹ کر ٹوپی بنا کر سر پر رکھ لی ہے۔ یہ ٹوپی بیشک اسلام کا نشان نہیں، لیکن جب تم اسے دیکھ کر چڑتے ہو، اور جیل کے رضا کاروں سے تمہاری زیادتی کا علم ہوا تو میں نے تمہیں چڑانا اور رضا کاروں کے ساتھ ہمنوائی اور ہمدردی کرنا ضروری سمجھا۔ اب یہ ٹوپی نہیں اترے گی نہ کسی کو اتارنے کے لئے کہوں گا۔ بالآخر وہ انگریز نا کام و نامراد بڑا بڑا ہوا چلا گیا۔ (بخاری کی باتیں ص ۳۶۵۳۴)

کسی اور ڈبے میں جاؤ :

بھائی عطاء المؤمن بخاری نے راقم الحروف (امین گیلانی) کو یہ واقعہ سنایا جو انہوں نے اپنے والد گرامی قدر (شاہ صاحبؒ) سے خود سنا تھا۔ شاہ جی نے فرمایا:

متحدہ ہندوستان میں ایک دفعہ کہیں جا رہا تھا۔ اپنا سامان گاڑی کے ایک ڈبے میں رکھ کر کسی ضرورت کے لئے پلیٹ فارم پر آیا تو دیکھا کہ ایک چھوٹے سے ڈبے میں صرف دو انگریز نوجوان دروازے میں کھڑے ہیں جو مسافر اس ڈبے پر سوار ہونے لگتا ہے وہ اسے دھکے دے کر اور ٹھوکریں مار کر بھگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کسی اور ڈبے میں جاؤ۔ یہ صورت دیکھ کر مجھے بہت طیش آیا کہ یہ ہندوستانیوں کو اس قدر ذلیل سمجھتے ہیں۔ اگرچہ میرا سامان دوسرے ڈبے میں تھا مگر میں نے سوچ لیا کہ ان کو ان کی فرعونیت کا مزا چکھانا چاہئے۔ گاڑی نے وِسل دے دیا اور بعض مسافر ابھی جگہ نہ ملنے کے باعث پریشانی میں بھاگ دوڑ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے دو تین مسافروں کو جب گاڑی نے حرکت کی اس ڈبے میں دھکیل دیا اور خود بھی چھلانگ لگا کر داخل ہو گیا۔ قبل اس کے کہ وہ گورے کوئی حرکت کرتے میں نے دونوں کے منہ پر زناٹے کے دو دو تھپڑ رسید کر دیئے اور ایک کو اٹھا کر ایک کونے میں پھینک کر دو اور جڑ دیں۔ دوسرا خود بخود ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا، اور پھر دونوں ایسے دبکے جیسے ڈبے میں موجود ہی نہیں ہیں۔ اگلے اسٹیشن پر جب کچھ لوگ اور اس ڈبے میں سوار ہو گئے تو میں اتر کر اپنے سامان کے پاس چلا گیا اور پورے سفر میں دھیان رکھا مگر وہ گورے اب سکون سے سفر کر رہے تھے۔

دوستوں کے لئے معمرہ :

راقم الحروف (امین گیلانی) نے یہ واقعہ خود بھی شاہ جی سے سنا اور بڑھے شاہ کو بھی دیکھا ہے، اور اس واقعہ سے امرتسر کے اکثر احباب آگاہ ہیں۔

شاہ جی خیر الدین کی مسجد میں جمعہ پڑھنے یا پڑھانے جاتے۔ جب وہ دروازے پر پہنچتے تو خان بہادر دروازے پر کھڑے ہوتے اور جھک جھک کر سلام کرتے۔ شاہ صاحب نے سلام کا جواب کبھی نہ دیا۔ چپ چاپ اندر چلے جاتے، شاہ صاحب کا انداز تھا کہ وہ اپنے قاتلوں کو بھی بخش دیتے تھے۔ ان جیسے عفو درگزر کے عادی اور ہنستے بولتے شخص کا رویہ دوستوں کے لئے معمرہ تھا۔ خان بہادر نے اس روش کے باوجود سلام کرنا ترک نہ کیا۔ شاہ جی نے بھی قبول کے لئے کبھی نہ ہاتھ ہلایا نہ زبان اور نہ اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔

ایک دن نیاز مندوں میں سے ایک نے سوال کیا۔ شاہ جی! خان بہادر صاحب آپ کو سلام کرتے ہیں۔ آپ جواب نہیں دیتے، وجہ کیا ہے؟ فرمایا کوئی بات نہیں، کبھی گھر میں ہوں تو پوچھ لینا، بات آئی گئی ہوگی۔ کچھ دن بعد گھر میں تنہا تشریف فرماتے، کسی طرح خان بہادر کا ذکر چھڑ گیا تو واقعہ بھی یاد آ گیا۔ فرمایا: کوئی بات نہیں۔ میں اس شخص کا دوست ہی نہیں ہو سکتا جسے انگریز دوست رکھتا ہو، یا جو انگریز کو دوست سمجھتا ہے۔ اصرار پر واقعہ بیان کیا کہ امرتسر کے مارشل لاء میں نیشنل بینک کے فرنگی منیجر کو مشتعل ہجوم میں سے کسی شخص نے چھت سے گرا کر ہلاک کر دیا۔ پولیس نے بہتیرا تلاش کیا لیکن مجرم کا سراغ نہ ملا۔ مقتول کی بیوی نے ملزموں کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے انعامی اشتہار نکالا کہ جو شخص ملزم کا پتہ دے گا، اس کو

اتنے ہزار روپے نقد انعام دیا جائے گا۔ ڈپٹی کمشنر نے نجی طور پر بعض معززین سے یہ بھی کہا کہ ان کی وفاداری کا امتحان ہے، اگر انہوں نے مجرم کو پکڑوانے میں مدد کی تو موجودہ انعام کے علاوہ خطاب بھی دیا جائے اور آزریری مجسٹریٹی بھی۔

بڑھیا جھانسنے میں آگئی :

مجرم نہ ملا ان خان بہادر صاحب جو اس وقت تک خان بہادر نہ تھے، محض علاقائی تھانیدار کے معاون ہی تھے، اپنے محلے کی ایک غریب الحال بیوہ کے پاس گئے، جس کا ایک ہی نوجوان بچہ تھا۔ اس سے کہو تم اپنے بچے سے کہو کہ وہ پولیس میں بیان دے دے کہ میں نے بینک کے منیجر کو کوٹھے سے گرایا ہے۔ تم سے حلفاً وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے بچہ کو دو ماہ کے اندر اندر رہا کرالوں گا، ورنہ حکومت سختی پر تلی ہوئی ہے۔ تمہارے بچے کا نام لیا جا رہا ہے۔ پولیس نے پکڑ لیا تو رہائی ناممکن ہے۔ وہ جھوٹے گواہ ڈال کر بھی پھانسی پر لٹکوا دے گی۔ بڑھیا جھانسنے میں آگئی، نوجوان بھی بے پڑھا لکھا اور بیمار ولاغر تھا۔ فریب میں پھنس گیا۔ خان بہادر نے قرآن مجید پر حلف اٹھایا کہ دو ماہ تک ضرور ہی رہا کرادوں گا۔ غرض نوجوان مذکور نے خان بہادر کی مخبری پر اپنے آپ کو پولیس کے حوالہ کر دیا، پھر جیسا کہ اسے کہا گیا تھا، اس نے اعتراف بھی کر لیا۔ مقدمہ چلا، چٹ منگنی پٹ بیاہ موت کی سزا ہوگئی جو اسے آخر کار تختہ دار پر لے گئی۔ بڑھیا نے خان بہادر کا دامن پکڑا۔ خان بہادر اثنائے مقدمہ سے لے کر سزائے موت کے اعلان تک یہی کہتا رہا کہ فکر نہ کرو تمہارا بیٹا رہا ہو جائیگا۔ یہ صرف قانون کی کارروائی ہے۔ گورنر صاحب نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے، شور نہ کرو، وہ رہا ہو جائے گا، ضرور گھر آئے گا، میں لے کر آؤں گا۔ بڑھیا ان طفل تسلیوں پر چلتی رہی۔ آخر ایک

دن بیٹا پھانسی پا کر گھر آ گیا۔

خان بہادر صاحب پھانسی کے دن تک یہی تسلیاں دیتے رہے کہ فکر نہ کرو، تمہارا بیٹا ضرور گھر آئے گا اور بیٹا آ گیا۔ بڑھیا نے بیٹے کی لاش دیکھی تو سر پٹ لیا، چلا اٹھی، ہا ہا کار مچ گئی تب افشائے راز سے بھی کچھ نہ بنتا تھا۔

خان صاحب تصویر عبرت بن گئے :

خان بہادر صاحب انعام و خطاب پا گئے۔ آنریری مجسٹریٹ مل گئی۔ جائیداد بھی ہاتھ آ گئی۔ غرض سرکاری دوائر میں ان کا طوطی بولنے لگا، لیکن اس بڑھیا کا بیٹا واپس نہ آیا۔ البتہ ایک دن ماں خود اس کے پاس پہنچ گئی۔ قدرت کا غائبانہ ہاتھ کام کرتا رہا۔ مکافات نے بہت دنوں کا چکر کاٹا، خان بہادر کا ایک نوجوان بیٹا اوباش لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ آنریری مجسٹریٹ کو ایک ڈپٹی کمشنر کی ناراضی نے ہضم کر لیا کارخانہ کو آگ لگ گئی، خود کی ٹانگ ٹوٹی اور تصویر عبرت ہو کر موت کی گود میں چلا گیا۔

شاہ جی نے کہا : جب یہ شخص میرے سامنے آتا تو اس کی ضمیر میں اسی کانٹے کی چھن ہوتی ہے۔ خدا کا خوف نہیں۔ میرے سامنے اس بچے کی تصویر آ جاتی ہے، جیسے وہ اس کی گردن مارنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا رہا ہو، اور میں منہ پھیر لیتا ہوں، کیونکہ مجھے اس کی جھریوں میں اس کی ماں کے آنسوؤں کی تہیں جمع ہوتی نظر آتی ہیں اور وہ بال کھولے چلا رہی ہے.....

ڈر اس کی سخت گیری سے بُرا ہے احتساب اس کا

یہ واقعہ سنا کر شاہ جی کا پنپنے لگے کہ اس دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے اور جب انگریزوں کے لئے غریبوں کے بچے کٹوانے والے ہمیں غدار کہتے ہیں تو فطرت بھی

سرکوبی کے لئے ہاتھ اٹھالیتی ہے۔ (بخاری کی باتیں ص: ۷۰۳۶۸)

یہ وظیفہ پہلے کیوں نہ بتا دیا؟

ایک روز گھر میں نشست جمی ہوئی تھی، باتوں میں سے باتیں نکل رہی تھیں، فرمایا (پاکستان بننے سے پہلے) میں بس میں کسی گاؤں تقریر کرنے جا رہا تھا۔ راستے میں بس ایک جگہ ٹھہری تو پھر سٹارٹ نہیں ہوتی تھی، کنڈکٹر نے نوجوان مسافروں سے کہا وہ اتر کر دھکا لگا دیں تاکہ بس سٹارٹ ہو جائے، آٹھ دس جوان اترے دھکا لگایا مگر وہ سٹارٹ ہونے کا نام نہیں لیتی تھی، وہ بے چارے دھکے لگا لگا کر ہانپ گئے۔ مسافر بھی پریشان تھے کہ کیا ہوگا؟ میں اچانک اتر اور ان نوجوانوں سے کہا کہ تم میرے ساتھ مل کر یہ نعرہ لگاؤ لعنت بر پد فرنگ اور پھر مل کر دھکا لگاتے ہیں، چنانچہ ہم نے لعنت بر پد فرنگ کہہ کر دھکا لگایا تو بس سٹارٹ ہو گئی، اور سب مسافر خوش ہو کر کہنے لگے، آپ نے یہ وظیفہ پہلے کیوں نہ بتا دیا۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۶۳)

نوکری چھڑوانے والا پیر:

ایک عقیدت مند حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ کہیں ملازمت کا امیدوار تھا۔ اس نے اپنی آمد کا مقصد عرض کیا اور ایک آفیسر کے نام سفارشی مکتوب کی خواہش کا اظہار کیا۔ جو اباشاہ صاحب نے فرمایا:

”بھائی! میں تو نوکریاں چھڑوانے والا پیر ہوں، اگر ملازمت کے لئے سفارش کی ضرورت ہے تو کسی سجادہ نشین یا کسی مخدوم یا کسی بڑے لیڈر کے پاس جاؤ، ہماری آشنا نوازی کا یہ عالم ہے کہ اگر آپ کہیں ملازم ہوں اور آپ کے اعلیٰ افسر کو معلوم ہو جائے کہ یہ عطاء اللہ کا ملنے والا ہے، تو فوراً آپ پر کوئی آفت پڑے گی، اور

آپ ملازمت سے سبکدوش ہو کر آرام سے بیٹھے رہیں گے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میرا بھانجا فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس کی والدہ کو ملنے کے لئے گیا جو میری پھوپھی زاد بہن تھی اور اپنے بیٹے کے غم میں رو رہی تھی، میں نے اسے کہا دیکھو بہن! اگر تیرا بیٹا ہفتے کے اندر واپس آوے تو میرا کیا انعام؟ کچھ انعام طے پا گیا، میں نے اس روز اس کو ایک خط لکھا وہ اس وقت بنگال کی کسی چھاؤنی میں تھا۔

”عزیزم آپ بڑی مناسب جگہ پہنچ گئے ہیں، اپنے کام کی رفتار سے مجھے مطلع کرتے رہنا وغیرہ وغیرہ“۔

نیچے میں نے اپنے دستخط کئے (سید عطاء اللہ شاہ بخاری)

خط سنسر ہو کر اس یونٹ کے انگریز افسر کو پہنچا، اس نے فوراً میرے بھانجے کو بلایا اور پوچھا کون ہے عطاء اللہ شاہ۔ اس نے بتایا تو کرنل نے اسے واپس بلکہ اس کا سامان وغیرہ منگوا کر فوراً ہی چھاؤنی سے نکل جانے کا حکم دیا۔

اس کے بعد سفارشی مکتوب لینے والے کو فرمایا : بھائی! ہمارا نام تو اس کام کے لئے ہے، اگر کہیں ملازم ہو جاؤ تو پھر میری خدمات حاضر ہیں.....

اے ہم نفساں ! آتشم از من بگر یزید

ہر کس کہ شود ہمرہ من دشمن خویش است

(بخاری باتیں ص: ۹۵)

آپ جیسے محسن کو کیسے بھول جاتا؟

شاہ جی شیخوپورہ تشریف لائے ہوئے تھے کہ سید امیر شاہ صاحب ریٹائرڈ

سب انسپکٹر پولیس جو ریاست ”لوہارو“ کے باشندے تھے اور پاکستان کے قیام کے بعد شیخوپورہ میں رہائش اختیار کر چکے تھے، تشریف لے آئے، شاہ جی اٹھ کر تپاک سے ملے۔ انہوں نے پوچھا شاہ صاحب آپ نے مجھے پہچان لیا۔ شاہ جی نے فرمایا اوہو آپ نے مجھے احسان فراموش سمجھا کہ آپ جیسے محسن کو بھول جاتا جس نے میرے لئے اتنی مصیبت اٹھائی، پھر شاہ جی نے ان کے سامنے یہ داستان سنائی، فرمایا :

”جب قادیان کانفرنس کی تقریر پر جی ڈی کھوسلہ کی عدالت میں پہلی ہی پیشی ہوئی، تو کارروائی سننے کے لئے بے پناہ ہجوم تھا۔ یہ بہ حیثیت سب انسپکٹر انتظام درست کرنے پر بمبے گارڈ کے مامور تھے۔ ادھر میں نے بطور گواہ صفائی مرزا محمود کو بھی عدالت میں بلوایا ہوا تھا۔ عدالت نے مرزا محمود کو بیٹھنے کے لئے کرسی دی، میں نے احتجاج کیا کہ خلاف معمول و آئین اسے عدالت کے اندر کرسی کیوں دی گئی۔ مختصراً یہ کہ عدالت کو مجبور کر دیا گیا، کرسی اٹھائی گئی اور اسے باقاعدہ کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا۔ اس پہلی کامیابی پر ہی مجمع خوشی سے اچھل پڑا اور نعرہ ہائے تکبیر گونجنے لگے۔ ہمارے تھانیدار صاحب آخر مسلمان تھے۔ پھر سید بھی کیا ہوا اگرچہ سرکاری ملازم تھے اور وردی پہنی ہوئی تھی۔ یہ بھی اتنے خوش ہوئے کہ اپنے اس وقت کے منصب اور مقام کو بھول گئے۔ جس وقت میں عدالت کے دروازے کے باہر کھڑا۔ اس کامیابی پر پرامن رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔ تو یہ مجمع کو چیرتے ہوئے آئے اور مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ فرطِ محبت سے میرے ہاتھ چوم لئے، وہاں پولیس پر بھی نگران پولیس موجود تھی، فوراً اطلاع ہو گئی کہ متعینہ سب انسپکٹر نے یہ حرکت کی ہے۔ ایس پی صاحب نے فوراً طلب کر لیا کہ حاضر ہو کر جواب دو۔ اب تھانیدار صاحب کو خیال آیا کہ اوہو کام تو

بگڑ گیا، مگر حواس قابو میں رکھے اور لکھ کر جواب دیا۔ میں اس وقت اہم ڈیوٹی پر ہوں، فارغ ہو کر حاضر ہو جاؤں گا۔

گورنمنٹ کے باغی سے مصافحہ :

ایس پی نے دوسرے سب انسپکٹر کی ڈیوٹی لگا دی اور انہیں کہا فوراً حاضر ہو جاؤ۔ قہر درویش برجان درویش حاضر ہو گئے۔ اس نے پوچھا کہ آپ نے سرکاری ڈیوٹی پر ہوتے ہوئے ایسا کام کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ سرکاری ڈیوٹی میں تو میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اتنے ہجوم اور پھر مشتعل ہجوم کو قابو میں رکھا، اگر شاہ صاحب سے میں نے مصافحہ اور معانقہ کیا تو وہ اس حیثیت سے کہ وہ ایک مسلمان عالم اور سید ہیں اور ہر مسلمان کو ہر عالم اور سادات سے عقیدت ہونا لازمی ہے۔ اس میں مجھ پر گورنمنٹ کے ساتھ کسی قسم کی غداری کا الزام نہیں آتا، مگر یہ عذر مسموع نہ ہوا، اور صاحب بہادر نے پیٹی اُتروالی اور باقاعدہ کارروائی شروع ہو گئی۔ یہ حضرت ہم سے ملے کہ شاہ جی آپ کی محبت نے تو ہمیں بے کار کر دیا۔ شاہ جی نے ہنس کر فرمایا: مگر ہم بھی وفادار تھے وہ گر بتائے کہ خدا نے کامیاب کر دیا۔ جب افسرانِ بالا کے ہاں پھر پیشی ہوئی اور انہوں نے کہا کہ آپ نے گورنمنٹ کے ایک باغی سے برسر عام باوردی ہو کر اور ڈیوٹی کے وقت اس جرم کا ارتکاب کیوں کیا تو ہمارے تھانیدار صاحب نے چپکے سے ایک تصویر نکال کر میز پر رکھ دی، وہ تصویر اس وقت اُتاری گئی تھی جب لندن میں دربار کے اندر خود شہنشاہِ برطانیہ مہاتما گاندھی سے ہاتھ ملا رہے ہیں، یہ تصویر دیکھ کر انہوں نے سوال کیا، آپ کا مطلب؟ انہوں نے کہا کہ حضور اگر خود شہنشاہِ برطانیہ ہندوستان کے سب سے بڑے باغی کے ساتھ انہیں اپنے دربار میں بلا کر ہاتھ ملا سکتے ہیں اور

در بارِ عالیہ میں کرسی دے سکتے ہیں، تو میں بحیثیت ایک ادنیٰ ملازم ہونے کے بخاری صاحب سے انہیں عالم دین اور سید سمجھ کر اور ساتھ ہی مشتعل عوام کے دل قابو میں لینے کے لئے تاکہ انتظامی امور سے اچھی طرح عہدہ براہو سکیں، مصافحہ اور معانقہ کر کے کیسے مجرم ہو گیا۔ اس دلیل سے انگریز افسران ششدر رہ گئے اور معمولی ہدایت کر کے عہدہ پر بحال کر دیا۔ (ماخوذ از بخاری کی باتیں ص: ۷۷ تا ۷۶)

ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے دوستی اور دشمنی خدا کے لئے کی اس کا ایمان کامل ہے۔ شاہ جی کی دوستی اور دشمنی بھی خدا کے لئے تھی۔ انگریز سے ان کو کوئی ذاتی پر خاش نہ تھی اور قرآن سے دوستی اور محبت بھی اس لئے تھی کہ قرآن خدا کا کلام ہے دوست اور دشمن سفرِ حیات کا لازمہ ہیں دوستوں کے انتخاب میں احتیاط کرنی چاہیے اور یہ دوستی خالص اللہ کے دین کی سر بلندی کے لئے ہو۔ مولانا آزاد فرماتے تھے دوستوں کے انتخاب میں احتیاط کرو، بھیڑ جمع نہ کرو، ہر شخص دوستی کا اہل نہیں ہوتا، لیکن دوست نہ ہو تو زندگی اجاڑ محسوس ہوتی ہے۔



باب پنجم

اخلاص و للہیت، زہد و استغناء

اور اصول پسندی

دین اگر اخلاص کا نام ہے، للہیت کا نام ہے، اللہ کی رضا طلبی کا نام ہے، ایثار اور قربانی کا نام ہے اور زہد و استغناء کا نام ہے تو اس مفہوم کی رو سے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بہت بڑے دیندار بزرگ تھے۔ ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، ان کو دیکھ کر اخلاص یاد آتا تھا، ان کو دیکھ کر تقویٰ و خشیت کا مفہوم سمجھ میں آتا تھا۔ شاہ جی فقرِ غیور اور زہد و استغناء کا پیکرِ مجسم تھے۔ فقر و استغناء یہ نہیں کہ خانقاہ بنا کر درویش کہلائیں یا شیخ ہو جائیں اور مریدوں پر ظاہر کریں کہ وہ علائقِ دنیا سے بے نیاز ہیں۔ اس دنیا کو بدلنا، اس کے علائق سے لڑنا اور دل کا غنا حاصل کرنا ہی صحیح استغناء ہے۔

حدیث شریف میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”غنی ہونا تو دل کا ہے، جس کا دل غنی ہے، وہ اصل غنی ہے، اس کی نظروں میں دنیا و ما فیہا نہیں جیتی“۔ اللہ تعالیٰ نے شاہ جیؒ کو قلبی غنا عطا فرمایا تھا جس کی وجہ سے وہ ساری دنیا سے مستغنی تھے، نہ صاحب

جائیداد تھے نہ موٹر اور بنگلہ کے مالک، لیکن امیروں سے بڑھ کر امیر تھے۔

شاہ جیؒ کے کثیر التعداد مرید تھے۔ وفادار دوستوں کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ شاید وہ باید، بعض بڑے بڑے نواب اور زمیندار بھی خدام میں شامل تھے۔ مگر کیا مجال کہ شاہ جیؒ نے کسی کے سامنے اپنی حاجت پیش کی ہو، البتہ جو شخص از خود خدمت کرتا اس کو رو نہ فرماتے۔

کھوٹے مرید :

ایک بار ایبٹ آباد میں دوستوں کے حلقہ میں فرمایا کہ ایک مرید نے سولہ (۱۶) روپے کا ہدیہ پیش کیا میں نے لے لیا۔ جب دیکھا تو سب کے سب کھوٹے تھے۔ فرمایا ایسے کھوٹے مرید بھی ہوتے ہیں۔

تم پیسے بتاؤ میں قیمتی بات بتاؤں گا :

بابو بشیر احمد صاحب چوہان (لاہور) نے بتایا کہ میں شاہ جیؒ کی عیادت کے لئے ملتان گیا۔ حسب عادت خوشی سے ملے، چائے پلائی، کچھ دیر کے بعد میں نے عرض کیا اچھا شاہ جیؒ! میں ذرا گھوم پھر آؤں، کچھ اشیاء خرید لوں۔ فرمایا: بازار جا رہے ہو تو میرے لئے ایک جوڑا جراب لیتے آنا، ذرا مضبوط ہو، میں بہت خوش ہوا کہ زندگی میں پہلی دفعہ آج شاہ جیؒ نے فرمائش کی۔ واپسی پر میں نے جرابیں لا کر پیش کر دیں۔ شاہ جیؒ نے پسند فرمائیں، پوچھا کتنے کی آئی ہیں۔ میں نے عرض کیا حضرت! آپ پیسے رہنے دیں، لیکن شاہ صاحب مصر ہوئے اور فرمایا: تم پیسے بتاؤ، میں تمہیں ایک قیمتی بات بتاؤں گا۔ میں نے ناچار قیمت بتادی، آپ نے وہ قیمت میری جیب میں ڈال کر فرمایا: اب سنو! جس شخص کے پاس کوئی ہدیہ لائے اور وہ شخص ہدیہ رکھ کر پھر اس کی

قیمت اسے ادا کرے، وہ بھی بڑا کمینہ ہے اور جو شخص کسی سے کہہ کر اپنے لئے کوئی چیز منگوائے اور پھر اس کی قیمت ادا نہ کرے وہ بھی بڑا کمینہ ہے۔ (بخاری کی باتیں ص ۱۶)

ایصالِ ثواب یوں ہوتا ہے :

مولانا محمد شریف صاحب بہاولپوری بیان کرتے ہیں کہ (گھلواں) بہاولپور کے ایک بڑے زمیندار حاجی پیر بخش صاحب جو نو جوانی میں شاہ صاحب کے مرید ہو چکے تھے، ان کی والدہ صاحبہ فوت ہوئیں تو غالباً تیسرے روز حضرت شاہ صاحب تعزیت کے لئے تشریف لے گئے۔ اس وقت وہاں علاقہ کے مقتدر زمیندار حاجی چٹھن صاحب وغیرہ بھی موجود تھے۔ شاہ جی نے فاتحہ کہی، دُعا بے مغفرت کی، بعد ازاں انہوں نے اپنے رواج کے مطابق کہ ہمارے مرشد آئے ہیں۔ کئی جوڑے پارچات اور قریباً چار سیر چاندی کے زیورات شاہ جی کی نذر کئے۔ جب وہ ڈھیر سامنے پڑا تھا تو شاہ جی نے ان سے پوچھا، یہاں ”گھلواں“ میں کوئی بیوہ یتیم مسکین نہیں ہے۔ انہوں نے عرض کیا کیوں نہیں، فرمایا: جن جن کا علم ہے انہیں بلوالو۔ ایک گھنٹے کے بعد کچھ عورتیں اور بچے آگئے۔ شاہ جی وہ پارچات اور زیورات اٹھا اٹھا کر دیتے جاتے اور ساتھ ساتھ فرماتے جاتے یہ ان کا حق ہے۔ ایصالِ ثواب یوں ہوتا ہے۔ سب زمیندار حیران دیکھتے رہے اور لینے والے دُعا میں دیتے چلے گئے۔ (بخاری کی باتیں ص ۲۳)

فقیر کا ڈیرہ :

سائیں محمد حیات پسروری نے بتایا کہ غالباً ۱۹۵۰ء میں ایبٹ آباد میں جلسہ تھا، میں بھی شاہ جی کے ہمراہ تھا، جب ایبٹ آباد پہنچے تو شہر کے متعدد علماء احباب استقبال کے لئے آئے۔ شاہ جی سب سے ملے، سامان کار میں رکھوا دیا، اتنے میں ہجوم

کو چیرتے ہوئے ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا سادہ سا شخص شاہ جی سے السلام علیکم کہہ کر لپٹ گیا اور کہا شاہ جی! آپ جیل کے غریب ساتھی کو چھوڑ کر کار میں جا رہے ہیں۔ وہ دیکھئے سرائے میں میری کٹیا نزدیک ہے۔ شاہ جی نے پھر اسے سینے سے لگا لیا اور فرمایا نہیں، اب تو ہم تمہارے ہی مہمان ہوں گے اور ساتھیوں سے فرمایا، میرا سامان کار سے اتار کر ان کے سرائے میں لے چلو، اب فقیر کا ڈیرہ فقیر ہی کے پاس رہے گا۔ غرض شاہ جی کے قیام تک وہ سرائے خواص و عوام کی مرجع بنی رہی۔

(بخاری کی باتیں ص: ۲۵)

چوری کا مال خود ہی رکھو :

مولانا عبدالرحمن میانوی فرماتے ہیں، میں نے شاہ جی سے جب ایک روپا ہار لیا کہ جب مجھے کوئی تقریر کر رہا تھا اور مہاراجہ صاحب نے اسے کوئی ٹکڑا لگا کر دیا ہے، جب تک روپے ہوتے ہیں، سفر کرتا ہوں نہیں ہوتے تو بس کر دیتا ہوں۔ ایک سفر میں میرے جی میں آیا کہ آج شاہ صاحب کو آزماتیں۔ شاہ جی نے سفر میں وضو کے لئے کوٹ اتار کر رکھا تو میں نے دس دس کے دونوٹ کھسکائے، سفر ختم ہو گیا مگر شاہ جی نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ اب مجھے شرم آئے کہ نوٹ واپس کروں گا تو شاہ جی کہیں گے کہ تم نے یہ کیا حرکت کی، کچھ عرصہ میں خاموش رہا، بالآخر ایک روز شاہ صاحب کے مکان پر ملتان میں جی کڑا کر کے وہ دونوں نوٹ شاہ جی کی طرف بڑھا دیئے۔ فرمایا یہ کیسے ہیں؟ میں نے بات گول کرنے کے لئے صرف اتنا کہا کہ یہ آپ رکھ لیں۔ شاہ جی نے اصرار سے پوچھا کہ حضرت سخی سرور صاحب! بتائیں تو سہی یہ روپے کیوں دیئے جا رہے ہیں۔ میں نے مجبوراً سارا قصہ کہہ سنایا، منس کر فرمایا: میانوی

تو ہمیں کب تک آزما تا رہے گا اور مذاق سے فرمایا: اب یہ چوری کا مال خود ہی رکھو میں نہیں لیتا اور نہیں لئے۔ (بخاری کی باتیں ص: ۴۰)

پروردگار کی گدا نوازیاں :

رفیق احمد صاحب (میاں چنوں) بتاتے ہیں کہ :

ہم تین ساتھی شاہ جی کی خدمت میں ملتان گئے۔ دوپہر کا وقت تھا، پہنچے تو شاہ جی اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی کھانا کھا رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد شاہ جی نے پوچھا کھانا کھاؤ گے؟ میں نے عرض کیا ضرور کھائیں گے۔ شاہ جی خود اندر تشریف لے گئے، چند منٹ گزرے تھے کہ ایک آدمی دروازے پر ٹھہرا اور بھٹا ہوا مٹا لے کر

آگے۔ قاضی نے فرمایا: (قاضی صاحب نے فرمایا: کھانا کھاؤ گے؟ میں نے عرض کیا ضرور کھائیں گے۔ شاہ جی خود اندر تشریف لے گئے، چند منٹ گزرے تھے کہ ایک آدمی دروازے پر ٹھہرا اور بھٹا ہوا مٹا لے کر

سامان خوردنی سامنے دیکھ کر کھڑے کھڑے نہایت عاجزی سے کہنے لگے اے اللہ! ہمیں تو ہمیشہ اس نافرمان کی لاج رکھ لیتا ہے۔ مجھ جیسے گنہگار پر تیرے یہ کرم اے اللہ! میں تو فقط گندگی کا ڈھیر ہوں جس پر تیرے یہ احسان ہیں۔ عجیب کیفیت میں دیر تک کھڑے اپنی عاجزی اور اللہ کے شکر کا اظہار کرتے رہے۔ ہم کھانے میں مشغول ہو گئے، تو فرمایا: اب سناؤں اصل بات میں جب کھانا لینے کے لئے اندر گیا تو اندر سے صاف جواب ملا کہ اب تو کچھ ہے نہیں کہ مہمانوں کو کھلا سکیں۔ پریشان ہو کر جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ دیکھوں دکان سے بھی آسکتا ہے کہ نہیں اتنے میں قاضی! تو نے آواز دے دی، جب دیکھا تو پروردگار نے خود بندوبست کر دیا تھا، یہ اس کی گدا نوازیاں ہیں۔ (بخاری کی باتیں ص: ۴۷)

غیبی فتوحات اور شاہ جی کی نیاز مندیاں :

ایک دفعہ راقم الحروف (امین گیلانی) ملتان گیا، دفتر مجلس ختم نبوت میں قیام کیا۔ علی الصبح ناشتہ سے فارغ ہو کر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ چارپائی پر تشریف فرما تھے، اٹھ کر ملے، پھر فرش پر ہی نشست جمالی۔ فرمایا: بہت اچھا ہوا تم آگے، کچھ وقت اچھا گزرے گا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ تھوڑی دیر کے بعد کچھ اور لوگ بھی آئے۔ برادر م عطاء الحسن بخاری نے مجھ سے کہا: بھائی جان! اب تو کچھ سنا دو۔ شاہ جی نے مسکرا کر فرمایا: بھائی! اسی خاطر تو میں اس کی طبیعت کو تیار کر رہا تھا، تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ ہاں گیلانی! کوئی غزل ہو جائے۔ خیر میں تعمیل ارشاد میں کافی دیر تک غزلیں سناتا رہا۔ شاہ جی دل کھول کر داد دیتے رہے اور خود بھی از دو فارسی اور عربی کے اشعار موقع و مناسبت سے ارشاد فرماتے رہے۔ اسی دھن میں کافی وقت گذر گیا۔ بھائی عطاء الحسن بخاری کو کسی کام کے لئے کچھری جانا تھا، وہ اٹھ کر چلے گئے۔ شاہ جی نے معاً فرمایا: بھائی گیلانی! تم اچھے آئے (گھڑی دیکھ کر) گیارہ بجنے کو آگئے اور میں نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا، نہ تمہیں ہی پوچھا۔ یہ کہہ کر اندر آواز دی، ایک بچہ آیا (گلی کے اکثر بچے اماں جی سے قرآن پاک پڑھنے گھر آتے ہیں، اس سے فرمایا بیٹا! اندر جا کر کہو، کہ آج ہمیں کچھ ناشتہ کے لئے نہیں ملا۔ ہم نے مانگا نہیں تو انہوں نے بھیجا بھی نہیں۔ دیکھنا کہہ دینا شیخوپورہ سے گیلانی آئے ہوئے ہیں۔ بچہ تھوڑی دیر کے بعد چائے لے کر آ گیا۔ شاہ جی نے کپڑا اٹھایا تو صرف چائے تھی۔ کھانے کو ساتھ کچھ نہیں تھا۔ فرمایا: بیٹا! کھانے کو کچھ نہیں۔ بچہ چلا گیا اور واپس آ کر جواب دیا کہ کھانے کو تو کچھ موجود ہی نہیں۔ فرمایا: بیٹا! ان سے کہورات

کا تھوڑا سا باسی ٹکڑا ہو تو وہی بھجوادیں۔ لڑکا پھر خالی ہاتھ آیا اور کہا وہ بھی نہیں ہے۔ اب شاہ جی نے اچھا بھائی کہہ کر قہوہ پیالی میں انڈینا ہی تھا کہ اچانک ایک بوڑھا شخص میلے اور پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے وارد ہوئے۔ ہاتھ میں ایک کپڑے میں کچھ لپٹا ہوا تھا، وہ آتے ہی شاہ جی کے حوالے کر دیا۔ شاہ جی نے کھولا تو کھجوریں تھیں، سامنے رکھ لیں، پھر ریش مبارک کو ہاتھ میں پکڑا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا: کھاؤ کتے کھا۔ اتنی جلدی مایوس ہو جاتا ہے، اگر اندر کا دروازہ بند ہو گیا تھا باہر کا تو کھلا تھا۔ شاہ جی کے اس انداز کو دیکھ کر میرے بھی آنسو نکل پڑے، پھر کچھ کھجوریں رکھ کر باقی اندر بھجوادیں۔ شاہ جی نے بابا سے پوچھا سائیں چائے پیو گے، انہوں نے ملتانی زبان میں کہا ضرور پیوں گا۔ شاہ جی نے چائے بنا کر دی، وہ پی رہے تھے اتنے میں کھجوروں والا کپڑا اندر سے خالی ہو کر آ گیا۔ شاہ نے کپڑا لے کر اس کے چاروں کونوں کو ٹٹولا، پھر بابا سے مخاطب ہو کر پوچھا آج کچھ نہیں تھا۔ بابا نے کہا کیوں کچھ چاہئے فرمایا نہیں۔ میں نے اس لئے پوچھ لیا کہ کہیں آپ پھر خفا نہ ہو جائیں۔ بابا لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔ بابے نے چائے پی لی اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا، اور کہا لو اب میں جاتا ہوں۔ شاہ جی نے کہا دعا کیجئے تو وہ بابا شاہ جی کی پشت کی طرف ہو کر کہنے لگے کہ ہاں ہاں ضرور، پھر اپنی ملتانی زبان میں ہی کہا، رسول اللہ کے دربار میں عرض کروں گا۔ میں یہ تمام کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جب بابا جی چلے گئے تو میں نے عرض کیا، شاہ جی یہ رازداری کی باتیں کیا تھیں۔ آپ نے رومال کو ٹٹول کر کیا پوچھا تھا۔ فرمایا: چند دن ہوئے یہ بابا اسی طرح میرے لئے کچھ لائے تھے، میں نے وہ چیز رکھ لی اور رومال واپس کر دیا، تو رومال لے کر ناراضی کے لہجہ میں کہا یہ کیوں نہیں رکھے۔ میں نے دیکھا تو اس کے کونے میں کچھ بندھا ہوا تھا۔ میں نے

رومال نے کرکھولا تو ساڑھے تین آنے تھے، وہ بھی میں نے رکھ لئے، پھر اندر کی واسکٹ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: وہ اب بھی میرے پاس موجود ہیں۔ پہلے بھی کچھ پیسے بابا لوگوں کے دیئے ہوئے رکھے ہوئے ہیں۔ میں وہ خرچ نہیں کرتا۔ اس لئے میں نے آج رومال کے کونے دیکھ لئے تھے، اور مزید پوچھ بھی لیا تھا کہ کہیں پھر ناراض نہ ہو۔ میں نے مزید پوچھا کہ یہ بابا جی ہیں کون؟ فرمایا: گیلانی بھائی! یہ بابا لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، ان کا اتہ پتہ کسے معلوم، بس مجھ پر مہربان ہیں، کبھی کبھی اس طرح زیارت ہو جاتی ہے۔

جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان سے کہہ دیتا ہوں :

تقسیم کے بعد ایک دفعہ شیخوپورہ تشریف لائے۔ ایک جگہ صبح چائے کی دعوت تھی۔ میں مولانا محمد علی صاحب جالندھری، ماسٹر تاج الدین صاحب انصاری، مولانا غلام غوث ہزاروی بھی موجود تھے۔ ملک محمد انور صاحب ایڈووکیٹ جو کچھ عرصہ گورنر پنجاب کے مشیر اعلیٰ رہ چکے ہیں، وہ بھی اچانک آگئے اور شاہ جی سے کہا کہ حضرت! میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ جی سمجھ گئے کہ یہ کچھ سیاسی جوڑ توڑ کی بات کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ ملک صاحب خان ممدوٹ کی پارٹی کے معروف رکن تھے اور ان دنوں میاں ممتاز دولتانہ اور خان ممدوٹ میں بُری طرح چل رہی تھی۔ اس لئے شاہ جی نے گریز کرتے ہوئے فرمایا: ملک صاحب اگر کوئی مسئلہ پوچھنا ہے تو مولانا غلام غوث اور مولانا محمد علی جیسے علماء بیٹھے ہیں۔ ان سے پوچھ لیجئے، اگر کوئی سیاسی بات ہے تو ہمارے صدر ماسٹر تاج الدین انصاری بیٹھے ہوئے ہیں ان سے لیجئے، میں نہ تو عالم ہوں نہ لیڈر۔ ملک صاحب نے اصرار فرمایا کہ جناب میں کچھ آپ ہی سے عرض کرنا

چاہتا ہوں اور کچھ آپ کا نظریہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ جی نے فرمایا فقیر کا نظریہ وہی ہے جو رات سٹیج پر بیان کر چکا ہوں۔

ملک صاحب چونکہ مزاج شناس نہ تھے ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا کہ شاہ صاحب! سٹیج کی بات کچھ اور ہوتی ہے۔ میں کچھ حقیقتا بات کرنا چاہتا ہوں۔ ملک صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ شاہ جی کا چہرہ غیرت سے سرخ ہو گیا اور فوراً فرمایا: ملک صاحب! خدا نہ کرے میں بھی کوئی وکیل بنوں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ۔ ان لوگوں پر خدا کی پھٹکار ہے جو دل میں کچھ رکھتے ہیں اور زبان سے کچھ کہتے ہیں۔ میرے دل میں جو کچھ ہوتا ہے وہی زبان سے کہہ دیتا ہوں۔ یہی میرے میاں صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ ملک صاحب بیچارے پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اس حال میں دیکھ کر ماسٹر تاج الدین صاحب انصاری نے انہیں اپنی طرف مخاطب کر لیا۔ (بخاری کی باتیں ص: ۶۳)

بھئی اپنی ضرورت پر خرچ کر لینا :

ایک دفعہ مکان پر چند احباب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک عقیدتمند آیا، کچھ دیر بیٹھا، جاتے دفعہ مصافحہ کرتے ہوئے کچھ رقم تھما دی۔ شاہ جی نے فوراً مٹھی کھول دی، فرمایا: بھئی! یہ اپنی ضرورت پر خرچ کر لینا۔ اس نے بہت اصرار کیا، مگر شاہ جی نہ مانے، وہ بے چارہ افسردہ ہو کر واپس ہوا۔ عرض کیا شاہ جی آپ نذرانہ قبول فرمائیے، فرمایا: میرے کون سے کارخانے چلتے ہیں، مگر میں دینے والے کی حیثیت دیکھ لیتا ہوں۔ ان لوگوں میں رسم ہے کہ پیر کے پاس خالی نہ جائیں، چاہے گھر کا برتن بیچ دیں، پیر کو نذرانہ ضرور دیتے ہیں، دینے والا محبت سے دے اور مناسب دے تو قبول کر لیتا ہوں رفتہ رفتہ بات تو کل پر آگئی۔

فرشتہ یا انسان :

اس ضمن میں شاہ جی نے فرمایا کہ :

ایک دفعہ امرتسر میں پچیش سے در بستر تھا، محض کچھڑی اور دہی کسی وقت کھا لیتا، ایک روز شام کے قریب گھر سے اطلاع ملی کہ آٹا ختم ہے۔ میں نے کہا صبر کرو حسب معمول شام کو ایک ہمسایہ عورت جو عقیدت اور محبت کے باعث آ کر گھر کا کام کاج کر جاتی تھی، وہ آئی اور سیدھا جا کر آٹے کے مٹکے کا ڈھکنا اٹھایا کہ (بی بی) کو آٹا گوندھ کر دے تو مٹکا خالی تھا۔ پوچھا بی بی جی! آٹا تو ہے نہیں۔ (بی بی) نے کہہ دیا: ”ہاں! اس وقت آٹا گوندھنے کی ضرورت نہیں رہنے دو ضرورت ہوگی تو دیکھا جائے گا۔“ وہ عورت سمجھدار تھی، سمجھ گئی، خاموشی سے چلی گئی اور ضرورت کے مطابق گھر سے آٹا گوندھ کر روٹیاں پکا کر لے آئی۔ بہر حال رات گزر گئی۔ صبح نماز سے فارغ ہو کر چار پائی پر ہی پڑا ہوا تھا کہ منہ اندھیرے ہی کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے پوچھا کون ہے؟ تو کوئی جواب نہ ملا، میں چونکہ کئی دن سے پچیش کا مریض تھا، اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا، مگر مجبوراً اٹھنا پڑا، اور طبیعت پر گراں گذرا کہ یہ کون ہے؟ میری آواز کا جواب ہی نہیں دیتا۔ جب دروازہ کھولا تو ایک نوجوان تھڑے پر ایک پوری بوری آٹے کی رکھے کھڑا ہے۔ سلام علیکم وعلیکم السلام کے بعد میں نے اُسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور پوچھا تو فرشتہ ہے یا انسان؟ وہ ہنس پڑا اور کہا شاہ جی! ہوں تو انسان ہی، میں نے کہا یہ اندھیرے میں کیا سو جھی کہ آٹے کی بوری اٹھالائے، تمہیں کسی نے کہا تھا؟ اس نے کہا شاہ جی! میں آپ کا ادنیٰ عقیدتمند ہوں، میں نے فلاں بازار میں نئی آٹا پیسنے کی چکی لگائی ہے۔ میں نے منت مانی ہوئی تھی کہ سب سے پہلی ایک بوری

گندم شاہ جی کی نذر کروں گا۔ رات چکی نصب کی تھی، جب کام مکمل ہو گیا تو اسی وقت آپ کے لئے آٹا پیش کر رکھ لیا تھا اور اب لے آیا ہوں، پھر فرمایا: وہ ہمیشہ اس نافرمان اور ناکارہ کی آبرورکھ لیتا ہے۔ یہ محض اس کا فضل و کرم ہے ورنہ میں اس لائق کہاں ہوں۔ (بخاری کی باتیں ص: ۷۳)

یاروں نے ”کوٹھے“ سے ”کوٹھی“ بنالی :

روزنامہ نوائے وقت کے مشہور کالم نگار جناب عطاء الحق صاحب قاسمی کے والد گرامی مولانا سید بہاؤ الحق صاحب قاسمی کا وقت کے جید علماء اور مجلس احرار الاسلام کے زعماء میں شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنا پہلا رہائشی مکان فروخت کرنا چاہا۔ میرے والد گرامی سید نصیر الدین گیلانی نے شاہ صاحب کو وہ مکان خریدنے پر آمادہ کرنا چاہا تو شاہ صاحب نے عذر کیا کہ میرے پاس رقم نہیں، غالباً دو ڈھائی ہزار روپے مالیت کا مکان تھا۔ میرے والد صاحب نے کہا کہ آپ کا مکان کرائے کا ہے اور آپ اکثر جیل میں رہتے ہیں اور اہل و عیال کرایہ ادا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، بہتر ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ کڑوا گھونٹ حلق سے اُتار لیں۔ تاکہ بچے بے فکر ہو کر اپنے گھر میں رہ سکیں، خیر انہوں نے شاہ صاحب کو قائل کر لیا اور مولانا کا مکان شاہ صاحب نے خرید لیا۔ انگریز کے ایجنٹوں کو موقع ہاتھ لگا۔

سرکاری روزناموں میں خبر آ گئی کہ عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک شاندار کوٹھی خرید لی ہے، کچھ دنوں کے بعد مسجد خیر الدین ہال بازار امرتسر میں جلسہ ہوا، تو دوران تقریر شاہ صاحب کی نظر والد صاحب پر پڑ گئی، ہنس کر فرمایا: بھائی نصیر الدین! آپ نے میری بیوی کا زیور بکوا کر مقروض کر کے جو کوٹھا لے کر دیا تھا، دیکھ لیا یاروں نے اسے

مغربی مصنوعات سے اجتناب :

شاہ جی ہمیشہ ہی موٹا جھوٹا پہنتے، گھر میں بھی یہی حال تھا فقر و استغناء کی سچی تصویر تھی۔ مغربی تہذیب کے خفی و جلی اثرات کا سایہ بھی ان سے میلوں دور رہتا۔ میں نے ان کے گھر میں مغربی مصنوعات مغربی تصورات اور مغربی نظریات کا گزرتک نہیں پایا۔ ان کی فرنگ دشمنی اور یورپ بیزاری کا یہ عالم تھا کہ بس میں ہوتا تو اپنے گھر میں بجلی اور پنکھا بھی نہ لگواتے۔ ان دو چیزوں کے سوا میں نے ان کے ہاں کبھی کوئی یورپی چیز نہ دیکھی۔ ریڈیو کے وہ اتنے مخالف تھے کہ سینکڑوں مرید تھے جنہوں نے ریڈیو سیٹ پیش کرنا چاہا۔ مگر جھنجلا کر انکار فرما دیا اور فرمایا: گھر میں استاد جی لانا چاہتے ہو؟

صبح و شام دور وٹیاں مل جاتی ہیں :

شاہ جی ایک مرتبہ بہاولپور پہنچے نواب بہاولپور کو معلوم ہوا تو اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ڈیرہ نواب صاحب سے شاہ جی کے پاس بھیجا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ شاہ جی نے جواب دیا! فقیر بادشاہوں کے دربار میں نہیں جایا کرتے۔ پھر ہنس کر کہا ”اب تو میں یوں بھی اس ریاست میں مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا ہوں۔ یہ معزز میزبان کا کام ہے کہ مہمان کی عزت افزائی میں پیش قدمی کرے“۔ سیکرٹری واپس چلا گیا۔ اگلے دن نواب صاحب بنفس نفیس ملنے آئے اور دس ہزار روپے بطور نذرانہ پیش کئے۔ لیکن شاہ جی نے نہایت بے نیازی سے یہ رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا جواب تھا ”فقیر کو اللہ کے فضل و کرم سے صبح و شام دور وٹیاں مل جاتی ہیں اس سے زیادہ کی خواہش نہیں“۔

صدر سکندر مرزا کی خواہش :

جانبا ز مرزا لکھتے ہیں: ۹ مئی ۱۹۵۸ء کو صدر پاکستان میجر جنرل سکندر مرزا ملتان آئے تو انہوں نے امیر شریعت سے ملاقات کی خواہش کی۔ اس ملاقات کے مہتمم شیعہ رہنما مظفر علی شمسی تھے، جب امیر شریعت کو اس کی اطلاع ہوئی کہ گیلانیوں کی دعوت کے موقع پر صدر مملکت مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور جب شمسی صاحب امیر شریعت کو لینے آئے تو امیر شریعت نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا!

شمسی! تم میرے عزیز ہو میں تمہارا حکم ٹال نہیں سکتا لیکن یہ سوچ لو کہ تم دونوں کی پوزیشن کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔ سکندر مرزا ملک کے صدر ہیں اگر وہ فقیر کے جھونپڑے میں آئیں تو یہ ان کی حیثیت کے خلاف ہے اور اگر میں انہیں ملنے جاؤں تو عمر بھر کی کمائی برباد کر بیٹھوں گا۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ میری طرف سے معذرت کر دو۔

(حیات امیر شریعت ص ۴۲۹)

لندن آنے کی دعوت :

ضابطہ حیات کی طرح اصولِ آدمی بھی ایک آئین ہے۔ جسے انسان احساس کے سانچے میں ڈھالتا ہے، اگر یہ سانچہ ٹوٹ جائے تو آدمیت داغ دار ہو جاتی ہے۔

۱۹۵۸ء کے آخر میں انٹرنیشنل تبلیغی مشن لندن کے سیکرٹری راؤ شیر علی نے حضرت امیر شریعت اور حضرت مولانا لاہوری کو لندن آنے کی دعوت دی، اور اس کے لئے تمام امکانی سہولتیں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا، یہاں تک کہ خود انجمن کے افراد بھی لندن سے دونوں حضرات کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن حضرت امیر شریعت نے ان حضرات کی درخواست کے جواب میں فرمایا :

”بھائی! اول تو میں اپنی صحت کے پیش نظر اس سفر کے قابل نہیں ہوں۔ اگر ہوتا بھی تو جس (انگریز) نے ڈیڑھ سو برس میرے ملک کو غلام رکھا، اس کا خون چوسا، اور جاتی دفعہ فتنہ و فساد کا ایسا تخم چھوڑ گیا کہ برصغیر پاک و ہند کے انسانوں کے مابین کبھی امن قائم ہو ہی نہیں سکتا۔

دوسرا میں نے اپنی زندگی کے قریباً چالیس (۴۰) برس ان کی مخالفت کی ہے اس بنا پر میرا ضمیر اس ملک میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔“
اس پر جب ان لوگوں نے مزید اصرار کیا، تو فرمایا :
”بھائی! میں اصول کا آدمی ہوں، اور اسی اصول پر زندگی کے چالیس برس گزارے ہیں۔“

حضرت لاہوریؒ کو جب امیر شریعتؒ کی اس رائے اور فیصلے کا علم ہوا، تو انہوں نے بھی اسی قسم کا جواب دیا۔ (حیات امیر شریعت ص: ۴۳۹)
حضرت امیر شریعتؒ کی شخصیت و کردار، سوانح و خدمات، اوصاف و کمالات، اخلاص و للہیت، زہد و استغناء، صبر و تحمل، عفو و درگزر اور آثار و افکار کے حوالہ سے جتنا بھی تحریری کام کیا گیا ہے وہ اس جامع الصفات شخصیت کی ہمہ جہتی خدمات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ شاہ جی کے کردار و عمل سے بھرپور زندگی کے ہر پہلو کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے کئی دفتر درکار ہیں۔ ان ابواب میں تو شاہ جی کی زندگی کے اہم پہلو کے اجمالی خاکے اور ان کی ایمان افروز زندگی کا ایک عکس جمیل پیش کیا گیا ہے، تاکہ ہم بھی اس زہد و تقویٰ کی زندگی کو اپنا شعار بنا کر دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو جائیں.....

ع شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات



باب ششم

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اتباع سنت

فاتح کون و مکان ہے جذبہ عشق رسولؐ
 کچھ نہیں ہوتا یہاں بے گرمی سوزِ بلاؐ
 رب کائنات کی اس دھرتی پر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ایسی ہستی ہے
 جس سے محبت، والہیت، عقیدت و ارنگی اور عشق عین ایمان ہے۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم
 نعمت بھی ہے اور قوت بھی، دولت بھی ہے اور حشمت بھی، شوکت بھی ہے اور صولت
 بھی، عشق محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم غیرت بھی ہے اور حمیت بھی۔

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ عشق و محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی
 اپنی مثال آپ تھے عشق رسول میں اُن کا دل آب آب رہتا تھا، ذکر رسول آیا اور ان کی
 آنکھوں کے کٹورے لبالب بھر گئے یہ منظر کئی ساتھیوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ خود
 بھی نظم اور نثر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کیا کرتے تھے۔ اُن کے نعتیہ اشعار ان کے
 جذبات کی عکاسی کرتے ہیں جب وہ اپنی نعت کے یہ اشعار پڑھتے تو اُن کی آنکھوں میں
 آنسو بھراتے.....

مقام و مہبط قرآن و انبیاء گروید
 بہ مشتمل خاک بنام چہ رتبہ خاک است
 یتیم مکہ محمد کہ آبروئے خدا است
 کیسکہ خاک رہش نیست بر سرش خاک است
 چمن چمن گل و نسریں ز عکس رخ ریزد
 سب سب گل خنداں زراہ مے چکدش

(سوانح الالہام ص: ۱۳۲)

اور نبی کے باغیوں کو تنبیہ ملاحظہ ہو

حذر ز خاک نشینے شکستہ دل ریش
 کہ صد زراہ جہنم و آہ می چکدش

(سوانح الالہام ص: ۷۹)

قرآن و محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لزوم اور شان و عظمت دیکھنے امیر شریعت نے کیسے بیان

فرمایا

لولاک ذرۃ ز جہاں محمد است
 سبحان من یراہ چہ شان محمد است
 نازد بنام پاک محمد کلام پاک
 نازم باں کلام کہ جان محمد است

(سوانح الالہام ص: ۷۲)

محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم :

محبت رسول ہر مومن کے ایمان کی اساس اور بنیاد ہے۔ مگر آپ کے قلب

اقدس میں محبت رسول ﷺ کا جو بحرنا پیدا کنار متلاطم تھا۔ اس کی نظیر اسلاف میں تو مل سکے گی لیکن موجودہ دور میں ڈھونڈنے سے مشکل ہی سے ملے گی۔ جذبہ محبت رسول ﷺ کا دل میں اس قدر وفور تھا کہ جہاں بھی نبی کریم ﷺ کا ذکر خیر آ گیا آپ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اور جب بھی عزت و ناموس مصطفیٰ ﷺ کو خطرہ لاحق ہوا آپ اپنے آپ کو بھول کر میدان جہاد میں اتر آئے اور بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہ کیا۔

مرزائیت سے آپ کو جو دلی نفرت تھی۔ اور آپ نے اپنی ساری زندگی خصوصاً استقلال وطن کے بعد ترویج مرزائیت کے لئے وقف فرمادی تھی۔ اس کا باعث اور موجب بھی یہی جذبہ محبت رسول ﷺ تھا۔ حضور ﷺ کے بعد اس کے زوہبی رہنے والے کو حضور ﷺ کی توہین سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے انہیں اپنے لئے زون نبوت کے خلاف ساری عمر جہاد میں گزار دی۔ انہوں نے عالم پیری میں ضعف و نقاہت اور مرض و علالت کے باوجود تحریک ختم نبوت کی قیادت فرماتے ہوئے جیل گئے اور سال بھر سے زیادہ مدت تک قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی اور صبر و ثبات سے برداشت کیں۔ رحمہ اللہ رحمةً واسعةً۔

تبلیغ دین سے شغف و انہماک :

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد ابلاغ و تبلیغ دین ہے۔ حضور ﷺ سے سچی عقیدت اور صحیح محبت یہی ہے کہ آپ کے نصب العین کی خدمت و تکمیل کے لئے ہر ممکن سعی کی جائے۔ چنانچہ اس محافظ ناموس رسول ﷺ کی حیات مقدسہ حضور ﷺ کے اس پاک مشن کی خدمت میں گزر گئی۔

آپ کو تبلیغ دین اور اشاعت اسلام سے جو شغف و انہماک تھا اور آپ کا قلب اقدس جس طرح آٹھوں پہر جذبہ تبلیغ کے لئے مضطرب اور بے قرار رہتا تھا۔ اس کی نظیر تلاش و تجسس کے باوجود نہیں مل سکتی۔ فرنگی اقتدار کی مخالفت اور استخلاص وطن کے لئے بلاشبہ آپ نے زریں کارنامے انجام دیئے۔ لیکن یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ کا اوڑھنا بچھونا تبلیغ دین تھی۔ آپ فطرتاً مبلغ تھے اور قدرت نے آپ کو پیدا ہی تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے کیا تھا۔

معاملہ عقل و خرد کا نہیں عشق کا ہے :

شاہ جی اکثر فرمایا کرتے تھے : ”خدا کی عبادت، رسول کی اطاعت اور انگریز سے بغاوت“ یہ میرا ایمان ہے اور رہے گا۔ خدا معبود ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب اور انگریز مغضوب خدا کو جو جی چاہے کہو اس کا محاسبہ وہ خود کرے گا۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوچ لینا یہ عقل و خرد کا کام نہیں ہے یہ عشق کا ہے۔ عشق پر زور نہیں ہوتا نہ اپنے پر اختیار۔ یہ نہیں سوچا جائے گا کہ قانون کیا کہتا ہے۔ پھر جو ہونا ہوگا ہو جائے گا اور جو ہوگا دیکھا جائے گا..... ع باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی کی سعادت :

غازی سلطان محمود صاحب (شیخوپورہ) اپنے علاقہ کے مشہور احراری کارکن تھے۔ انہوں نے قریباً ہر ملکی اور مذہبی تحریک میں حصہ لیا اور عمر کا بیشتر حصہ جیلوں میں گزار دیا۔

وہ فرماتے ہیں کہ ایک زمانہ ہوا میں نے ایک رات ایک طویل خواب دیکھا

جس میں آنحضور ﷺ کی زیارت ہوئی۔ اجمالاً وہ خواب یوں تھا جیسے ایک وسیع جگہ پر آنحضور ﷺ دائیں کروٹ پر لیٹے ہوئے ہیں۔ چہرہ اقدس قبلہ کی طرف ہے۔ حضور علیہ السلام کے سامنے اس زمانہ کے کئی سوعلماء کھڑے ہیں۔ پہلی صف کی درمیان سے حضرت مدنیؒ نکل کر حضور ﷺ کے قریب جا کر دو زانو بیٹھ جاتے ہیں۔ باقی سب علماء اپنی اپنی جگہ باادب کھڑے ہیں اور حضرت مدنیؒ سے کچھ باتیں کر رہے ہیں اور حضور ﷺ کے پاؤں مبارک کی طرف ایک صاحب فوجی وردی پہنے لیٹ کر حضور ﷺ کا تلوہ زبان سے چاٹ رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے دوسرا پاؤں اس شخص کے سر پر رکھا ہوا ہے۔ وہ ایک کیف و مستی کے عالم میں حضور ﷺ کے قدم مبارک چاٹ رہے ہیں اور حضور ﷺ مسکرا مسکرا دیکھتے ہیں۔ میں غور سے دیکھتا ہوں تاکہ پہچانوں یہ خوش قسمت کون ہے؟ تو چہرہ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ہیں۔ مختصر یہ کہ غازی صاحب کہتے ہیں، صبح میں نے یہ خواب من و عن لکھ کر شاہ جیؒ کو امر تسریح بھیج دیا اور میں خواب کے اس کیف اور سرور میں کچھ ایسا کھویا ہوا تھا کہ شاہ جی کا خواب میں جو منظر تھا اس کو یوں لکھ گیا کہ آنحضور ﷺ کا ایک پاؤں آپ کے سر پر تھا اور دوسرا پاؤں آپ کے کتے کی طرح چاٹ رہے تھے۔

وہی خواب اب زبانی سناؤ :

کافی دن گزر گئے تو ایک جلسہ میں تقریر کے بعد شاہ جی سے ملاقات ہوئی، کچھ اور لوگ بھی شاہ صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جب مجھے دیکھا تو حسب دستور بڑی محبت سے ملے، پھر فرمایا: وہی خواب اب زبانی سناؤ۔ میں نے سنایا تو جب آپ کے ذکر تک آیا تو میں نے کہا کہ آپ آنحضور ﷺ کا پاؤں مبارک چاٹ رہے

تھے۔ میری طرف دیکھ کر پوچھا کس طرح؟ میں نے کہا: ”زبان سے“ فرمایا: نہیں جیسا خط میں لکھا تھا ویسے بتاؤ تو مجھے یاد آ گیا کہ خط میں تو میں نے تشبیہ کسی اور طرح لکھی تھی، لیکن اب منہ پر مجھے شرم آتی تھی، لیکن شاہ جی نے باصرار مجھے کہلوا یا کہ آپ حضور ﷺ کا پاؤں کتے کی طرح چاٹ رہے تھے، سن کو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پھر خود ہی یہ فقرہ بار بار دہراتے رہے۔ (بخاری کی باتیں ص: ۲۷، ۲۸)

لگتی ہیں گالیاں بھی تیرے منہ سے کیا بھلی

قربان تیرے پھر مجھے کہہ دے اسی طرح

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ایک پیر صاحب کے مرید حج

پر جا رہے تھے، پیر نے عرض کیا، حضور اقدس ﷺ کی بارگاہ میں میرا سلام پیش کرنا۔

سلام پیش کیا حضور ﷺ مرید کو خواب میں آئے اور فرمایا: اپنے بدعتی پیر سے میرا

بھی سلام کہنا۔ پیر کو ان الفاظ کی خواب میں اطلاع کر دی گئی۔ مرید نے واپس آ کر

عرض کیا: حضور ﷺ نے خواب میں آپ کو سلام کہے ہیں، پیر نے کہا جو حضور ﷺ نے

فرمایا اسی طرح کہو۔ چنانچہ مرید نے کہا حضور ﷺ نے فرمایا: اپنے بدعتی پیر سے میرا

سلام کہنا.....

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے

عشق است ہزار بدگمانی :

حضرت علامہ دوست محمد قریشیؒ فرماتے ہیں، ایک مرتبہ راجن پور میں شاہ

جی کی تقریر تھی، شاہ جی نے تقریر کرتے ہوئے آنحضور ﷺ کے زمانہ شباب سے قبل کا

ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے عوام کو سمجھانے کے لئے فرمایا: حضور ﷺ جب ابھی سن

بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔ ابھی جوانی میں قدم نہیں رکھا تھا، اپنی پنجابی میں یوں سمجھو، حضور ابھی ”چھوہر“ تھے، منڈے ہی تھے خیر تقریر ختم ہوگئی۔

جب تقریر کے بعد شاہ جی قیام پر پہنچے نصف رات ہو چکی تھی، کچھ لوگ شاہ جی کے ساتھ قیام گاہ پر آگئے۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: شاہ جی! ماشاء اللہ تقریر تو خوب ہوئی، مگر ایک بات آپ نے غلط کی ہے، شاہ جی نے پوچھا کیا: اُس شخص نے کہا آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ”منڈا“ کہا۔

ہمارے ہاں لفظ ”منڈا“ اچھے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ یہاں تو آزاد و عیاش کو عموماً منڈا کہتے ہیں۔ شاہ جی نے سنا تو تڑپ اٹھے۔ فرمایا: اچھا آپ نے مجھے وہیں کیوں نہ ٹوک دیا۔ استغفر اللہ استغفر اللہ یہ بہت بُرا ہوا۔ ہمارے ہاں تو منڈا لڑکے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مجھے کیا خبر تھی میری توبہ۔ شاہ جی کی طبیعت نہایت افسردہ اور پریشان ہوگئی۔ وہ لوگ آخر اٹھ کر چلے گئے۔ میرا قیام بھی حضرت شاہ صاحب کے ساتھ ہی تھا۔ تمام رات شاہ جی بے چین رہے۔ کبھی لیٹ جاتے، کبھی اٹھ بیٹھتے اور بار بار فرماتے الہی میری توبہ، اللہ تو جانتا ہے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین نہیں کی۔ جب اسی بے چینی میں کافی وقت گزر گیا تو میں نے عرض کی، شاہ جی! آپ اطمینان رکھیں، اللہ تعالیٰ دلوں کی باتیں جانتے ہیں۔ خدا نہ کرے آپ کی نیت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی نہیں تھی۔ آپ اب آرام فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائیں، شاہ جی نے فرمایا: مولانا! یہ ٹھیک ہے، مگر مجھے چین نہیں آتا۔ مجھے کیا خبر تھی یہاں اس لفظ کا مفہوم ہی کچھ اور ہے۔ میں نے بہت تسلی دینے کی کوشش کی مگر شاہ صاحب رات بھر تڑپتے اور لوٹتے رہے اور بار بار آہیں بھرتے اور استغفار کرتے رہے، صبح ہوئی تو میزبان آئے۔ ان سے فرمایا: آج پھر میری تقریر کا اعلان کر دو۔

لوگو! گواہ رہو میں نے تو ہین نہیں کی :

تقریر کا اعلان ہو گیا۔ شاہ جی جب تقریر فرمانے کے لئے چلے تو ہاتھ میں معمولی اور ناکارہ سی لکڑی کا ایک ٹکڑا لے لیا۔ اسی طرح اسٹیج پر تشریف لے گئے اور لکڑی میز پر رکھ دی۔ میں حیران تھا کہ شاہ جی نے یہ لکڑی کیوں ساتھ رکھی ہے۔ بہر حال تقریر فرمائی اور تقریر فرماتے ہوئے رات والے لفظ پر آگئے کہ رات میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لڑکپن سمجھانے کے لئے جس لفظ کا استعمال کیا، ہمارے ہاں اس کے معنی یہی ہیں، پھر وہ لکڑی ہاتھ میں لے کر فرمایا: آپ کے قصبہ میں اس کو کیا کہتے ہیں؟ لوگوں نے بتایا: پھر فرمایا کہ یہاں سے دور فلاں جگہ ہے وہاں کے لوگ آئے ہوں گے، ہاتھ اٹھائیں، پھر ان سے پوچھا آپ اس کو کیا کہتے ہیں، انہوں نے کچھ اور ہی نام بتایا۔ اسی طرح کئی علاقوں اور قصبوں کے آدمیوں سے پوچھا، تو اس مجمع میں اس لکڑی کے پانچ چھ نام لئے گئے، پھر آپ نے سمجھایا کہ اسی طرح میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لڑکپن کو کئی زبانوں میں سمجھانا چاہا تھا، اگر سمجھاتے ہوئے ایک لفظ کے معنی آپ کے ہاں ”ناشائستہ سے“ ہیں تو میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا، میں نے صرف آپ کو سمجھانے کی خاطر کیا تھا۔ آپ اس لفظ کے معنی وہی لیں جو میری مراد تھی، ورنہ عطاء اللہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی تو بہ ہے تو بہ ہے۔ اس وقت شاہ صاحب پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی، گرج کر فرمایا: لوگو! گواہ رہو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو ہین نہیں کی، پھر آسمان کی طرف منہ کر کے فرمایا: یہ الفاظ ایسی کیفیت میں دہرائے کہ تمام مجمع چیخنے لگا، شاہ جی کے رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے اور مجمع کے روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۰۶)

اگر معراج کی رات میں ہوتا؟

ایک مرتبہ شاہ صاحب نے کسی مجلس میں فرمایا: نبی کریم ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے تو آپ کے دائیں بائیں اوپر نیچے نوریوں کی بارات تھی تاکہ اس مجلس میں ابلیس کا دخل نہ ہو۔ اس طرح چلتے چلتے ہر آسمان پر فرشتے رکتے گئے۔ حتیٰ کہ ساتویں ”آسماں پر سدرة المنتہی“ کے قریب جبرائیل بھی رُک گئے، اب نبی ﷺ نے کہا: جبرائیل آگے؟ فرمایا: حضور ﷺ! یہ میری انتہا ہے۔ پتہ چلا کہ جہاں نوریوں کی انتہا ہے، وہاں سے آمنہ کے لعل بشر کی ابتداء ہے۔ تو فرمایا شاہ صاحب نے کہ جبرائیل نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اگر میں ہوتا تو ساتھ جاتا۔ میرا ایمان ہے کہ جہاں رحمت ہو وہاں عذاب کا کیا کام اور جس کے ساتھ رحمت اللعالمین ہوں اس کے پر جلنے کا پھر کیا خدشہ اور ویسے بھی فرمانِ خداوندی ہے: **وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ**۔ (التوبة)۔ ترجمہ: اللہ کو یہ مناسب نہیں کہ جن میں آپ ہوں ان کو عذاب ہو۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۵۳)

یہ نعلین سر پر رکھنے کے قابل ہیں:

مولانا سید محمد طیب ہمدانی (قصور) فرماتے ہیں کہ ہمارا ایک بھائی گونگا تھا۔ اس لئے ہم نے اسے کوئی ہنر سکھانا چاہا تو اس نے ”جو تا سازی“ کے فن کو پسند کیا اور اس میں خوب مہارت حاصل کر لی۔ اس نے ایک دفعہ آنحضور ﷺ کے نعلین مبارک کی تصویر دیکھی تو مجھ سے کہا کہ میں سرکارِ دو عالم ﷺ کے نعلین کی طرح نعلین بنا سکتا ہوں، پھر ایک روز وہ اسی نقشہ کے مطابق نعلین بنا کر لے آیا، اور مجھے پہنا دیئے اور بہت خوش

تذکرہ وسوانح سید عطاء اللہ شاہ بخاری ----- ﴿ ۱۳۴ ﴾

ہوا کچھ روز کے بعد حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قصور تشریف لائے تو ہمارے ہاں قیام فرمایا۔

اسی دوران انہیں غسل خانہ جانے کی ضرورت پڑی تو میں نے وہی جوتے ان کے آگے کر دیئے۔ جوتے دیکھتے ہی ٹھٹھک گئے اور فرمایا: ہمدانی یہ تو بالکل میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین مبارک کے نقشہ کے مطابق ہیں۔ میں نے ساری بات بتادی، فوراً جھکے اور نعلین اٹھائے، فرمایا: ظالم یہ نعلین پاؤں میں پہننے کے لئے نہیں یہ کہہ کر وہ نعلین اپنے سر پر رکھ لئے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بار بار کہتے جا رہے تھے، یہ سر پر رکھنے کے قابل ہیں۔

پھر غسل نہانہ میں جا کر ان جوتوں کو اپنے ہاتھوں سے خوب دھو کر صاف کیا، ان پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی، کہنے لگے ہمدانی! یہ جوتے مجھے دے دو۔ میں نے عرض کیا ضرور شاہ جی! بلکہ یہ تو مجھ پر احسان ہوگا۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۵۴)

عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم :

ابتدا میں شاہ جی کو روحانی فیض اپنے والد ماجد قدس سرہ کی نظر التفات اور خاص توجہ سے ملا۔ شاہ جی نے ایک روز فرمایا تھا۔ جب وہ چلتے تو درخت اور دیواریں انہیں پیچھے ہٹتی ہوئی معلوم ہوتیں اور بھی روحانی کمالات کا تذکرہ کیا۔ شاہ جی کی ساری زندگی تقویٰ، پرہیزگاری، درویشی اور توکل پر گزری، اللہ تعالیٰ نے ظاہری حسن و جمال کے ساتھ حسن سیرت سے بھی نوازا تھا۔ ان کی طبیعت دنیا کی طرف کبھی زاغب نہ ہوئی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر خواہش سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ان کو اگر دھن تھی تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام زندگی جو ابدی نجات کا ذریعہ ہے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک

پہنچادیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے ہزاروں تقریریں کیں۔ حضور اکرم ﷺ کے لاکھوں شیدائیوں کو حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ناموس اور تحفظ ختم نبوت پر جہاد باللسان کیا۔ حضرت سید محمد انور شاہ کاشمیری نے جس مشن کے لئے آپ کا انتخاب کیا تھا اس کو تمام عمر بطریق احسن پورا کیا۔ شاہ جی نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہم نے انگریزوں کے خلاف اس وقت علم بغاوت بلند کیا جب مائیں اپنے بچوں کو انگریز کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ اس حق گوئی و جذبہ حریت کی پاداش میں انہیں بارہا جیل جانا پڑا۔ مقدمات چلے۔ مگر انہوں نے ہزاروں کے مجمع میں انگریز کے خلاف تقاریر کیں.....

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

شاہ جی سے لاکھوں انسانوں کو بے پناہ عقیدت تھی۔ شاہ جی کا نام ان کے دل کی دھڑکنوں میں بس گیا تھا۔ شاہ جی کے لئے ہزاروں دلوں سے دعائیں نکلتی تھیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آ گیا جو شاہ جی کی زبانی سنا تھا۔

لدھارام کی گواہی :

لدھارام حکومت کا رپورٹر تھا سر سکندر حیات کی حکومت نے شاہ جی کی تقریر کے متن کو مسخ کرا کے لدھارام سے نئی رپورٹ لکھوائی یہ بہت بڑا مقدمہ تھا۔ اس مقدمے میں شاہ جی کو بڑی سے بڑی سزا دی جاسکتی تھی۔ آخری پیشی کے وقت لدھا رام نے شاہ جی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ لدھارام کا مردہ ضمیر جاگ اٹھا۔ اس نے برسر عدالت حقیقت کا انکشاف کر دیا اور عدالت میں بیان دیا کہ شاہ جی کی تقریر کے

متن کو مسخ کر کے اس سے دوبارہ یہ رپورٹ تیار کرائی گئی ہے۔ جو الزامات شاہ جی پر لگائے گئے ہیں وہ بے بنیاد، فرضی اور بعید از حقیقت ہیں۔ اس طرح شاہ جی تختہ دار تک پہنچ کر واپس آ گئے۔ (مقدمہ سے باعزت بری کر دیئے گئے) یہ ان دعاؤں کا نتیجہ تھا جو لاکھوں انسانوں نے بارگاہ رب العزت میں کے تھیں۔ (حیات امیر شریعت ص: ۲۳۳)

ضعیفہ کی دعائیں :

شاہ جی نے فرمایا میں ایک جلسے میں تقریر کر کے سٹیج سے نیچے اترتا تو ایک ضعیفہ لاٹھی سے ٹیک لگائے راستے میں کھڑی تھی۔ جو نہی میں اس کے پاس سے گزرا اس نے میرا نام لیکر مجھے پکارا۔ میرے قدم یکدم رک گئے۔ میں اس عقیفہ ضعیفہ کے قریب گیا۔ ادب سے سلام کیا۔ بڑھیا کہنے لگی عطاء اللہ شاہ تیرا نام ہے۔ ادب سے کہا کہ اس گنہگار ہی کو عطاء اللہ کہتے ہیں۔ بے شمار دعائیں دیں کہنے لگی کہ اس بوڑھی جان کے ساتھ سینکڑوں نفل پڑھ کر تیرے لئے دعائیں کی ہیں کہ اے خدا اس نے تیرے حبیب کے ناموس کے لئے سردھڑ کی بازی لگادی ہے یہ حق کے لئے لڑ رہا ہے۔ اس کو سلامت رکھنا۔ اس کو دشمنوں پر فتح نصیب کرنا۔ بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شاہ جی نے فرمایا کہ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا جو اس وقت مجھ پر طاری ہوئی۔ یہ حضور اکرم ﷺ کے کرم کے انداز ہیں۔

شاہ جی کی صحبتیں :

امین گیلانی راوی ہیں :

شاہ جی کی صحبتوں کا ایک ایک لمحہ علم و ادب کے چراغ روشن کرتا رہا۔ شعر و ادب کی محفلیں منعقد ہوئیں۔ مذہب کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوئے۔

سیاست کے عروج و زوال کی داستانیں سنیں، بزرگوں کی روحانی درجات کے واقعات نے ذہن میں اجالا کیا۔ علمائے کرام کے تقویٰ، پرہیزگاری، ان کے علمی مقامات اور ان کی بے نفسی و خدا ترسی کے بہت سے قصے سنے۔ ملتان کے دو سال کے قیام کے دوران دل و نظر کی تربیت کے بے شمار مواقع میسر آئے۔

خالصہ کالج میں داڑھی رکھنا آسان ہے :

کالج کے نوجوان طبقہ سے شاہ جی بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ پروفیسر صاحبان کالج کے طلباء اور نوجوان اکثر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ شاہ جی کی تبلیغ کا انداز منفرد تھا وہ نوجوانوں پر کفر کے فتوے لگانے، انہیں مذہب سے دور رکھنے کے حق میں نہ تھے۔ نوجوان شاہ جی کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے۔ حالات حاضرہ پر باتیں ہوتیں۔ سیاست زیر بحث آتی۔ ملکی معاملات پر تبادلہ خیال ہوتا۔

ایک روز اسلامیہ کالج کے چند طلباء شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ شاہ جی! کالج کا ماحول ہی ایسا ہوتا ہے جہاں داڑھی رکھنا بہت مشکل ہے۔ شاہ جی نے داڑھی رکھنے کے جواز میں نہ کوئی حدیث پڑھی اور نہ ہی کلام پاک کی کسی آیت کی تلاوت کی۔ فرمایا! آپ نے ٹھیک فرمایا: ”خالصہ کالج (سکھوں کا کالج) میں داڑھی رکھنا آسان ہے اسلامیہ کالج میں واقعی بہت مشکل ہے“ اس جواب سے ان کے چہرے زرد پڑ گئے۔ انتہائی شرمندہ ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شاہ جی ایسا جواب دیں گے۔ (بخاری کی باتیں ص: ۸۹)

مسلک کی پابندی :

کون نہیں جانتا کہ شاہ جی اہلسنت و الجماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اور تادم

آخر اسی مذہب پر قائم رہے۔ ائمہ اربعہ میں جب بھی کسی کا نام آیا تو آپ نے کمال عقیدت اور احترام سے ذکر کیا۔ لیکن تقلید حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی کرتے تھے۔ اور بالخصوص اپنے امام کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ آپ نے جو مسلک اختیار کیا تھا اس پر کس حد تک پابند تھے۔ چند ایک واقعات اس سلسلہ میں جو مشاہدہ میں آئے ان کا ذکر خالی از منفعت نہ ہوگا۔

بہاولپور میں قیام تھا۔ نماز ظہر کے وقت محلہ کی مسجد میں تشریف لے گئے۔ جب جماعت کھڑی ہونے لگی اور امامت کے لئے ہر مقتدی کی نگاہ حضرت شاہ جی کی طرف اٹھی تو آپ نے دریافت کیا کہ امام نہیں ہے؟ جو اباً امام صاحب نے شاہ جی کی خدمت میں نماز پڑھانے کی استدعا کی جس پر شاہ جی نے اپنے سفر کا حوالہ دیتے ہوئے معذرت کی۔ اس پر محلے کے ایک معتبر بزرگ نے کہا کہ دو رکعت بقیہ ہم خود پڑھ لیں گے شاہ جی نے مصلے پر تشریف لے جا کر امامت سے قبل مقتدیوں کو مخاطب کر کے دریافت فرمایا کہ اچھا بتائیے آپ دو رکعت میں کیا پڑھیں گے؟ اس پر جلدی سے ایک معمر اور تعلیم یافتہ بزرگ نے جواب دیا کہ الحمد پڑھ لیں گے اور حسب دستور نماز پوری کریں گے اس پر آپ نے پوچھا کہ کس امام کے مقلد ہیں۔ سبھی نے بیک زبان جواب دیا کہ ہم حنفی ہیں۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا ”اگر آپ حنفی المذہب ہیں تو خوب یاد رکھیں کہ اس مسئلہ میں حضرت امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ مسافر امام کے پیچھے مقیم مقتدیوں کی آخری دو رکعت بھی امام کی اقتداء میں سمجھی جائے گی اور انہیں ان دو رکعتوں میں بھی وہی کچھ پڑھنا ہوگا جو امام کے اقتداء میں پڑھا کرتے ہیں۔ اس لئے آپ لوگ بجائے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے خاموشی کے ساتھ انداز قرأت کے وقت کے اندازے کے برابر قیام کر کے رکوع میں چلے جائیں گے۔“

سنت کا اہتمام :

بہاولپور میں شاہ جی ارشد صاحب کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ سات آٹھ آدمی نماز پڑھنے والے موجود تھے۔ اس لئے جماعت کے لئے استدعا کی گئی۔ سب لوگوں نے وضو کر لیا صف بندی ہو گئی اور شاہ جی مصلے کی طرف بڑھے تو کسی نے اقامت کہنی شروع کر دی۔ آپ نے روک کر دریافت فرمایا کہا اذان کہہ دی؟ عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا کہ :

”ترکِ سنت کو عادت نہ بناؤ بلکہ بھولی بسری سنتوں کو زندہ کر کے اپنا گھر بہشت میں بنا لو۔ اذان کہنا سنت ہے۔ اس لئے پہلے اذان کہہ دو۔“

چنانچہ پہلے اذان کہی گئی اور پھر جماعت کھڑی ہوئی۔

جامع مسجد بہاولپور میں مجلس حزب اللہ کے زیر اہتمام مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی مرحوم اور شاہ جی کی تقاریر کا پروگرام تھا۔ خطبہ جمعہ شاہ جی نے اپنے مخصوص زوردار انداز میں پڑھا۔ بعد نماز تقریر کے دوران فرمایا۔ ”میں نے خطبہ کے دوران میں دیکھا کہ بعض لوگوں نے دو خطبوں کے درمیان ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی جہاں تک فقہ حنفی کا تعلق ہے، دو خطبوں کے درمیان دعا کی اجازت نہیں ہے۔ خطبہ دو رکعت فرض کا قائم مقام ہے۔ اور اس کو خاموشی سے سننے کا حکم ہے (نماز کے وقت صفوں میں چھوٹے چھوٹے بچے موجود تھے) اچھی طرح سمجھ لو کہ نابالغوں کے لئے علیحدہ صف بندی کا تاکید حکم ہے۔ نابالغوں کا بالغوں کی صف میں نماز ادا کرنا تنقیص جماعت کا موجب ہے۔ علماء کرام موجود ہیں اگر میں کوئی غلط بات کہوں تو

ٹوک دیں۔ (امیر شریعت نمبر ص: ۵۱۰ تا ۵۰۸)

بیٹی کی سنت کے مطابق شادی :

جاننا مرزا لکھتے ہیں :

امیر شریعت نے اپنی عزیز بیٹی کو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر میں لپیٹ کر گھر سے رخصت کیا۔ انصاف کلاتھ ہاؤس (فیصل آباد) کے مالک شیخ گلزار کا بیان ہے کہ ”شاہ جی اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں کراچی آئے اور کہا تمہاری ہمیشہ کی شادی کے لئے کپڑا خریدنا ہے۔ بازار چلو۔ میں ہزار روپیہ جیب میں ڈال کر شاہ جی کے ساتھ ہولیا۔ جب پانچ سو سے کچھ کم کا کپڑا خرید چکے تو کہا بس بیٹا۔ میں نے عرض کیا حضرت! یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ جواب میں کہا بیٹا میری گرہ (جیب) اس قدر اجازت دیتی ہے۔ اس پر میں نے عرض کیا۔ حضرت پیسے بہت ہیں۔

آنسو کے زیورات :

فرمایا : نہیں میرے عزیز ! میں تمہیں اپنے ساتھ اس لئے نہیں لایا کہ تمہارے پیسے بہت ہیں۔ بلکہ مجھے اس کپڑے کی پہچان نہیں اور دوسرا تمہارے ساتھ ہونے سے کچھ رعایت ہوگئی ہے۔ چنانچہ شاہ جی نے تمام رقم اپنی گرہ سے ادا کی۔

رسم نکاح مخدوم و محترم حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری نے ادا فرمائی اور اس طرح مارچ کے آخر یا اپریل ۱۹۵۲ء کے شروع میں امیر شریعت نے اپنے جگر گوشے کو آنسوؤں کے زیورات سے آراستہ کر کے گھر سے رخصت کیا۔

(حیات امیر شریعت ص ۲۳۹)

بعد از مرگ احتساب :

القاسم اکیڈمی کے رکن محمد شفیق عالم کشمیری نے ایک واقعہ بیان کیا کہ :

گزشتہ سال احقر کو سب انجینئر الطاف اکبر بلوچ اور چند ساتھیوں کی معیت میں حضرت امیر شریعتؒ کے مزار اقدس پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ چار دیواری کے اندر داخلہ کے لئے ایک گیٹ لگا ہوا تھا جو مقفل تھا سامنے فٹ پاتھ پر ایک حجام چٹائی ڈالے اپنے کام میں مصروف تھا ہمیں مسافر سمجھ کر پاس آیا اور تالا کھولنے لگا ہمارے استفسار پر بتایا کہ میں حضرت امیر شریعتؒ کا دیرینہ خدمت گار ہوں اور کافی عرصہ حضرت کی خدمت میں رہا اب ان کی زیارت کے لئے آنے جانے والوں کی خدمت کر کے روحانی تسکین حاصل کرتا ہوں۔ کہا کہ شاہ جی نے مجھے خواب میں متنبہ کیا کہ اگر لوگوں کی شیو (داڑھی منڈانا) بند نہیں کرو گے تو آئندہ میری قبر پہ مت آنا۔ اس دن سے میں نے شیو بنانا بند کر دیا ہے۔ اب صرف سر کے بال درست کرتا ہوں۔ وہ حجام آج بھی بخاری صاحب کے مزار اقدس کے سامنے بیٹھا نظر آتا ہے.....

جس زمیں پر ہو عطاء اللہ کا نقش قدم

ذره ذره اس زمیں کا آسماں پیدا کرے

علم دین سے قلبی وابستگی :

آپ کی کتاب زندگی فضائل و مناقب کا ایک درخشاں باب ہے ”علم دین سے قلبی وابستگی“۔ جہاں آج بڑے بڑے دیندار علماء کے بچے دینی علم سے بے بہرہ

اور کالج کی فضاؤں میں پلتے نظر آتے ہیں۔ وہاں حضرتؒ نے اپنے کسی بچے کو سکول اور کالج میں نہیں جانے دیا۔ سب کو مکتب ہی میں بٹھایا۔ سب سے پہلے اللہ کا قرآن پڑھایا۔ قرآن کریم کا حافظ بنایا اور علم دین ہی پڑھایا۔ اس زمانے میں اور تہذیب و ترقی کے اس دور میں حضرت کا علم دین سے یہ دلی ربط و تعلق اور قلبی وابستگی اگر غور و تعمق سے دیکھا جائے تو بہت ہی بڑی بات۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماشاء اللہ آپ کے چاروں فرزند ان گرامی قرآن کریم کے حافظ ہوئے۔ دین کے عالم ہوئے اور اپنے عظیم والد کے جانشین اور علوم و معارف کے وارث و امین بنے۔

اولاد کی تربیت :

حضرتؒ نے اپنی اولاد کی تربیت میں کتنی دلچسپی لی اور اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔ اس کا علم مجھے تو حضرت کے وصال کے دن ہوا۔ جب دیکھا کہ اس حادثہ کبریٰ سے ہزاروں آنکھیں اشکبار ہیں۔ اور ہزاروں دل سوگوار ہیں مگر ایک ابو ذر بخاری ہیں کہ صبر و ضبط کا پیکر نظر آ رہے ہیں۔ تجھیز و تکفین کی نگرانی خود کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ صحیح اسلامی احکام کی تعمیل میں حضرت کا جنازہ بھی خود پڑھاتے ہیں۔

ایک بیٹے کے لئے اپنے باپ کی نماز جنازہ پڑھانا کوئی معمولی کام نہیں بڑے دل گردے کا کام ہے پھر نہ کوئی اضطراب ہے نہ پریشانی۔ آواز میں نہ پستی ہے نہ انحطاط۔

حضرت امیر شریعتؒ کی نگاہ میں علماء کا مقام :

۱۳۷۲ھ، ۱۹۵۲ء میں قصبہ قائم پور ضلع بہاولپور میں ”معراج النبی“ صلی اللہ علیہ وسلم

کے موضوع پر احرار اسلام کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ جس کی سرپرستی اور صدارت حاصل پور اور قائم پور کی معروف شخصیت حضرت سید محمد عبداللہ شاہ صاحب فرما رہے تھے۔ سٹیج پر باوقار مذہبی رہنما اور علماء کرام اور کارکنان موجود تھے۔ حضرت شاہ جی اپنے پاکیزہ خطاب کو خطبہ مسنونہ سے شروع فرما چکے تھے کہ سٹیج کے پیچھے مفتی غلام قادر صاحب تشریف لائے۔ شاہ جی اپنے خطاب ہی میں مفتی صاحب کو معانقہ و مصافحہ سے ملے اور قریباً پندرہ منٹ (۱۵) تک تمام علماء اور خصوصاً مفتی صاحب کی تعریف کرتے رہے۔ مفتی صاحب کے لئے فرمانے لگے کہ ”دیکھو یہ مولوی مجھ سے قد میں چھوٹا ہے اور عمر میں بھی کم ہے۔ لیکن اس کا علم مجھ سے کہیں زیادہ ہے“ اور کسر نفسی کی حد کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ ”اگر میں کافی وقت علم کے حصول میں صرف کروں تو مفتی غلام قادر صاحب کے پایہ تک نہیں پہنچ سکتا“۔ اور ساتھ ہی مفتی غلام قادر صاحب کے لئے دعا فرمائی۔ قدر افزائی کی یہ صفت شاہ جی کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ودیعت فرمائی تھی کہ جہاں شاہ جی تشریف لے جاتے وہاں کے مقامی علماء کے عزت و شان بنا کر آتے تھے۔ اور یہی سنت ہے انبیاء علیہ السلام کی۔ ہر پیغمبر تشریف لا کر پہلے اپنے سے قبل یا ہم زمانہ نبی کی تعریف و تصدیق کرتا۔ جیسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے اپنے زمانہ میں رحمت دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشخبری دیتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لانے کے بعد جملہ انبیاء علیہم السلام کی تصدیق فرماتے ہوئے امت کو تعلیم دی کہ ہم تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام کو برحق سمجھتے ہیں۔ اور سب صحف و کتب سماویہ کو سچا مانتے ہیں۔ جیسے فرمایا گیا۔

آمنت باللہ و ملائکتہ و کتبہ و رسلہ۔

حضرت رائے پوری اور شاہ جی :

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری، بزرگان رائے پور کے پاکباز وارث تھے۔ آپ ولایت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے اور برصغیر کے بیشتر علماء حق ان کے دستِ حق پرست پر بیعت تھے۔ جن میں حضرت امیر شریعت۔ شیخ حسام الدین۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا محمد علی جالندھری۔ مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی۔ مولانا عزیز الرحمن لدھیانوی ایسے اکابر شامل تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی روحانی منزلت اور مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بزرگان دیوبند بالخصوص حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت قاری محمد طیب، بزرگان سہارنپور، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا، حضرت مولانا خلیل احمد، بزرگان جمعیت، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مولانا عتیق الرحمن... اجتماعی طور پر حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کے عقیدت مند تھے۔ اور اپنی دینی و سیاسی جدوجہد میں انہیں اپنا سرپرست تسلیم کرتے تھے۔ فی الحقیقت حضرت شاہ عبدالقادر کاروان علماء حق کی جدوجہد حریت کے امام تھے۔ اور تمام بزرگوں کو اپنے قیمتی مشوروں اور دعاؤں سے نوازا کرتے تھے۔

گو حضرت امیر شریعت حضرت رائے پوری کے مرید تھے۔ مگر حضرت رائے پوری ان کو بڑا اہم مقام دیتے تھے۔ اور امیر شریعت کے ساتھ انہیں خصوصی محبت اور لگاؤ تھا۔ حضرت امیر شریعت فرمایا کرتے تھے کہ جدوجہد آزادی میں کئی ایسے مشکل مقام آئے جہاں زندگی اور موت میں بہت تھوڑا فاصلہ رہ جاتا تھا۔ مگر حضرت رائے پوری کی خاص روحانی توجہ سے وہ مرحلے بہ آسانی طے ہو جاتے۔ شاہ صاحب کو جب

کبھی فرصت ملتی تو وہ حضرت کی خدمت میں رائے پور تشریف لے جاتے۔ اور ان کے فیضان نظر سے مستفید ہوتے رہتے۔

جب ۱۹۶۰ء میں حضرت رائے پوری بیماری کی حالت میں بغرض علاج لاہور تشریف لائے۔ تو شاہ جی بھی ملتان سے لاہور پہنچ گئے۔ اور شب و روز حضرت رائے پوری کی خدمت میں رہنے لگے۔ حضرت رائے پوری اکثر انہیں دعا کے لئے کہتے اور شاہ جی نظریں جھکا لیتے۔ میں ان دنوں لائل پور تعینات تھا۔ ایک دن قاضی جی (قاضی احسان احمد شجاع آبادی) بھاگے بھاگے آئے۔ فرمانے لگے لاہور چلنا ہے۔ حضرت رائے پوری کی حالت تشویشناک ہے۔ ہم بذریعہ کار لاہور پہنچے۔ حضرت کا قیام ڈیوس روڈ کے قریب اپنے ایک عقیدت مند حاجی عبدالمتمین کے ہاں تھا۔ ہم وہاں پہنچے۔ حضرت چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اور مشتاقان دید کا ہجوم ارد گرد موجود تھا۔ اندر ایک کمرے میں شاہ جی اور شیخ حسام الدین بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ساتھ کے کمروں میں آغا شورش کاشمیری، ماسٹر تاج الدین، جناب عبدالوحید وزیر مغربی پاکستان، سابق جنرل حق نواز، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا عبید اللہ انور، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا عزیز الرحمن لدھیانوی اور وہلی سے آئے ہوئے کچھ بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔

مسلمانوں کا اصل دشمن :

مختلف الخیال فرقوں کے اختلافات اور تنازعات کے سلسلہ میں حضرت شاہ

صاحب نے فرمایا کہ :

”شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، چشتی، سہروردی وغیرہ کی جنگ رقابت اور محبت کی

جنگ ہے۔ ہر فرقہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کا جانشین ثابت کرنا چاہتا ہے۔ مگر فرقہ مرزائیہ سرے سے رسول اللہ ﷺ کی نبوت ہی کو مٹانے کے درپے ہے۔

فرمایا! اس لئے ہمیں اپنے اصل دشمن کو پہچاننا چاہیے اور دشمن کے خلاف تمام مکاتب فکر کے مسلمانوں کو متحدہ جدوجہد میں شریک ہونا چاہیے تاکہ انگریز کے اس خودکاشتہ پودے کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا جاسکے۔ (مختصر سوانح از غازی خان ص: ۱۰۵)



باب ہفتم

مسئلہ ختم نبوت سے والہانہ عقیدت
اور فرق باطلہ کا تعاقب

انسان پیدا بہت ہوتے ہیں لیکن انسان بنتے بہت کم ہیں اور ان میں بھی ایسے انسان بہت تھوڑے ہوتے ہیں جو ماحول، حالات اور غالب نظام زندگی کے پرزور دھارے کے خلاف ایک اعلیٰ نصب العین قبول کر کے زمانے کا رخ بدل دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں.....

ناز کیا اس پہ کہ بدلا ہے زمانے نے تجھے

مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

حضرت امیر شریعتؑ انسانوں کی اس تلیل تعداد میں سے تھے جو حق کو مظلوم

دیکھ کر اپنی ساری حیثیت اور ہستی کے ساتھ اس کی پشت پناہی کے لئے اٹھ کھڑے

ہوتے ہیں۔ امیر شریعتؑ اللہ کے دین کی حمایت، رسول اللہ کی محبت اور مسئلہ ختم نبوت

کے تحفظ میں ایک برہنہ تلوار تھے۔ مجھے ان کی جتنی کتاب زندگی دیکھنے کا موقع ملا میں

نے انہیں ناموس رسالت، تحفظ ختم نبوت اور رد قادیانیت میں اس طرح غرق پایا کہ ان کے ہاں اور کسی چیز کو بھی مقصد کے آگے کوئی اہمیت حاصل نہ تھی وہ بیوی بچے اور دوست و احباب رکھتے تھے لیکن تحفظ ختم نبوت کے نصب العین کے مقابلے میں بیوی بچوں اور دوست و احباب کو پرکاش کے برابر حیثیت بھی نہیں دیتے تھے۔ ختم نبوت کا مسئلہ ۱۹۷۴ء میں حل ہو گیا تھا لیکن اس کو منطقی انجام تک پہنچانے میں امیر شریعتؒ کا سب سے زیادہ کردار ہے۔ آپ نے عوام و خواص میں مرزائیت کو گالی بنا دیا۔ آپ کو سوائے ختم نبوت کے کچھ کام نہیں تھا کچھ یاد نہ تھا۔ حتیٰ کہ آپ نے انتہائی ضعف کی حالت میں چار پائی پر لیٹے لیٹے اس مشن کی خاطر تقریریں کیں۔ یہ حضرت امیر شریعتؒ کی لگائی ہوئی آگ تھی جس میں انگریز کا خود کاشتہ پودا مرزا غلام احمد قادیانی اپنی ذریت خبیثہ سمیت جل کر راکھ ہو گیا۔

شاہ جی فرمایا کرتے: میں نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں ٹائم بم رکھ دیا ہے جو اپنے وقت پر پھٹے گا اور مرزائیت کے قلعے کو تہس نہس کر دے گا۔ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید کے تحت شاہ جی کے قول کی اللہ نے لاج رکھی اور ان کا مشن پورا ہو کر رہا۔

اندھیرے چھٹ کے رہیں گے کہ اب نگارِ سحر
ہمارے خواب کی تعبیر بن کے آئی ہے

محافظِ ختم نبوت :

شاہ جی مرحوم کی زندگی کا اہم و اقدم مقصد ختم نبوت تھا۔ جس پر ہمیں تازیت قائم رہنے کا عہد کرنا ہے۔ امیر شریعت مرحوم کہا کرتے تھے کہ ہماری نماز، حج، روزہ، زکوٰۃ، شریعت، طریقت، حقیقت، تہذیب، معاشرت، تمدن، اخلاق،

مذہب غرض یہ کہ مکمل دین اسلام حضور ﷺ کی ختم المرسلین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ یہ عقیدے کی بات ہے کہ اگر کوئی شخص پوری زندگی لا الہ الا اللہ کہتا رہے تو وہ مسلمان نہیں کہلائے گا جب تک محمد رسول اللہ ﷺ نہ کہے اور حضور کا اتباع نہ کرے۔

موت کا ذائقہ ہر انسان کو چکھنا ہے۔ اس سے ولی، غوث، قطب، اور نبیوں کو مفر نہیں ہے۔ مگر قابل غور نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ تدفین کے بعد بعض کی قبر جنت کا باغیچہ بن جاتی ہے اور بعض کی قبر جہنم کا گڑھا۔ حضرت امیر شریعتؒ کی پوری زندگی مجاہدانہ گزری ہے۔ ان کی کیا تعریف کی جائے وہ ہماری تعریف سے بے نیاز تھے۔ اور ہیں۔ شاہ جی کی زندگی میں ایک شخص نے سٹیج پر آ کر ان کی تعریف کرنا شروع کر دی تو شاہ جی نے اٹھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گویا وہ اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ آج بھی شاہ جی مرحوم کی اس قدر تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔ جتنی کہ ان کے کردار کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے۔ تمام کا تمام دین حضور ﷺ کی ختم المرسلین سے وابستہ ہے۔ ان کی نبوت کو الگ کر دیا جائے تو باقی کچھ نہیں رہتا۔ لہذا میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں شاہ جی کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جس پر چلتے ہوئے انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

امیر شریعتؒ کا اعزاز :

جاناب مرزا قسطنطنیہ :

امیر شریعتؒ خود امیر شریعت نہیں بن گئے تھے۔ اور نہ ہی چند آدمیوں نے بیٹھ کر انہیں یہ خطاب دے دیا تھا۔ دراصل واقعہ یوں ہے کہ محدث العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری آخری بار لاہور تشریف لائے تو قریباً پانچ صد علماء کا اجتماع ہوا۔

انجمن خدام الدین کا جلسہ تھا۔ اس اجتماع میں علم و فضل کے مالک بڑے بڑے جید علماء اور اکابر موجود تھے۔ جن میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی ایسی ہستیاں بھی شامل تھیں۔ وہاں علامہ انور شاہ نے فرمایا کہ :

”ہم نے جہاد باللسان کرنا ہے۔ کسی کو امیر بنانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ اس وقت شریعت کی حفاظت کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاری نہایت ہی موزوں ہیں اور شاہ جی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اجتماع علماء کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اور کہا کہ میں سب سے اول بیعت کرتا ہوں اور عطاء اللہ شاہ صاحب کو امیر شریعت منتخب کرتا ہوں۔ اس وقت سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کو امیر شریعت کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا۔“

(حیات امیر شریعت ص: ۱۳۱)

پانچ صد سالہ تاریخ کی نادر مثال :

ناموس رسول اللہ ﷺ کا سوال اور بخاری کی زبان۔ آپ اندازہ فرمائیے کیا عالم ہوگا۔ شاہ جی فرماتے تھے کہ حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والی زبان نہ رہے گی یا سننے والے کان نہ رہیں گے۔

حضرت امیر شریعت مرحوم علماء کرام کے محبوب، مزدوروں کے حامی، غریبوں کے دوست، ختم نبوت کے محافظ، صحابہ کرام کے مداح اور بزرگان دین کے قبیح تھے۔ شاہ جی نے تحریک ختم نبوت کے دوران تمام دینی جماعتوں اور مختلف مکاتب فکر کے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ یہ آپ کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ جس کی گزشتہ

پانچ صد سالہ تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت کی حقیقت :

امیر شریعت فرماتے ہیں: ستم دیکھئے یہ لوگ کس قدر بے بصیرت ہیں، کتنے عاقبت نااندیش ہیں کہ لباس نبوت کس کے بدن پر مزین کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ جسے گڑ اور کلوخ میں تمیز نہیں، جسے جوٹا پہننے کا سلیقہ نہیں، دایاں بائیں میں اور بائیں دائیں میں، گڑ سے استنجا کیا جا رہا ہے اور مٹی کھائی جا رہی ہے۔

دیکھا! میاں صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر ہاتھ ڈالا تو خدائے غیور نے عقل ہی سلب کر لی اور مخلوط الحواس بنا دیا۔ تصویر کا ایک رخ تو یہ ہے کہ مرزا غلام قادیانی میں یہ کمزوریاں اور عیوب تھے۔ اس کے نقوش میں توازن نہ تھا، قد و قامت میں تناسب نہ تھا، اخلاق کا جنازہ تھا کرلیٹر کی موت تھا، سچ کبھی بولتا نہ تھا، معاملات کا درست نہ تھا، بات کا پکا نہ تھا، بزدل اور ٹوڈی تھا، تقریر و تحریر ایسی ہے کہ پڑھ کر متلی ہونے لگتی ہے لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر اس میں کوئی کمزوری بھی نہ ہوتی وہ مجسمہ حسن ہوتا، قویٰ میں تناسب ہوتا، چھاتی ۴۵ انچ ہوتی، کمر ایسی کہ سی آئی ڈی کو بھی پتہ نہ چلتا، بہادر بھی ہوتا، مرد میدان ہوتا، کرلیٹر کا آفتاب ہوتا، خاندان کا ماہتاب ہوتا، شاعر ہوتا، فردوسی وقت ہوتا، ابوالفضل اس کا پانی بھرتا، خیام اس کی چاکری کرتا، غالب اس کا وظیفہ خوار ہوتا، انگریزی کا شیکسپیر اور اردو کا ابوالکلام ہوتا، پھر نبوت کا دعویٰ کرتا تو پھر کیا ہم اسے نبی مان لیتے؟ (بخاری کی باتیں ص: ۱۵۶)

تاریخ امامت و رسالت :

میں تو کہتا ہوں کہ اگر خواجہ غریب نواز اجمیریؒ، سید عبدالقادر جیلانیؒ، امام

ابو حنیفہؒ، امام بخاریؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، ابن تیمیہؒ، غزالیؒ، حسن بصریؒ بھی نبوت کا دعویٰ کرتے تو کیا ہم انہیں نبی مان لیتے؟ علیؓ دعویٰ کرتے کہ جسے تلوار حق نے دی اور بیٹی نبی نے دی، سیدنا ابو بکر صدیقؓ، سیدنا عمر فاروقؓ، اور سیدنا عثمان غنیؓ بھی دعویٰ کرتے تو کیا بخاری انہیں نبی مان لیتا؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کائنات میں کوئی انسان ایسا نہیں جو تخت نبوت پر سج سکے اور تاج امامت و رسالت جس کے سر پر ناز کر سکے وہ ایک ہی ہے جس کے دم قدم سے کائنات میں نبوت سرفراز ہوئی۔

(بخاری کی باتیں ص: ۱۵۷)

مرزائیت کے خلاف فتویٰ :

غیر ملکی دور اقتدار کو اپنی زندگی کے لئے جن افراد یا جماعتوں کا سہارا لینا پڑا ان میں آریہ سماج اور قادیانی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء کے دوران ہندو مسلم کشیدگی نے متحدہ قومیت کا جو حلیہ بگاڑا۔ یورپین سیاست گروں نے اس بساط پر کس کس طرح اور کون کون سے مہرے آگے بڑھائے۔ ہنوز اس مقدمے کا ایک اہم گواہ باقی ہے جس کے بغیر یہ روند ادنا مکمل رہے گی اور شاہ جیؒ کی جدوجہد میں ان کے اس کردار کی تعمیر بھی ادھوری سمجھی جائے گی۔

آریہ سماج جب شدھی کی تحریک میں سرگرم تھے، انہی دنوں مرزائیوں نے بعض ایسی کتب شائع کیں جن میں آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کی زندگی پر رکیک حملے کئے جس کے جواب میں آریہ سماج نے قادیانیوں کے بجائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو ہدف تنقید بنایا۔ آریہ سماج اور قادیانیوں کی ان مقابلے کی عبارتوں نے طرفین میں جلتی پرتیل چھڑکا اور حالات بد سے بدتر ہو گئے۔

آخر ہندوستان کے علماء نے حکومت سے آریہ سماج کی کتب کی ضبطی کا مطالبہ کیا تو ساتھ ہی مرزائیوں کی کتب کا از سر نو مطالعہ کر کے حسب ذیل فتویٰ دیا :

”مرزا غلام احمد قادیانی نے علی الاعلان دعویٰ نبوت کیا اور دیگر انبیاء کرام کی توہین کی ہے۔ نیز بعض کو گالیاں دیں اور بعض ایسے دعوے کیے کہ جن کی بنا پر وہ خود کافر ہو کر مرا اور اسی طرح اس کے ماننے والے بھی کافر اور مرتد ہیں۔ لہذا ان (مرزائیوں) سے ہر قسم کا قطع تعلق کیا جائے، خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی۔“

(امر تر ۱۹۲۵ء رسالہ ”الفیض“ ایڈیٹر مولانا محمد داؤد پسر مولانا نور احمد)

اس پر شاہ جی کے علاوہ اڑھائی سو سے زائد علماء نے دستخط کیے، جن میں علمائے فرنگی محل، علمائے دیوبند، علمائے بریلوی قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ شاہ جی نے مرزائیت کے خلاف اپنے دلی احساسات کو کھلم کھلا اُجاگر کر کے مرزائیوں کو بھی اپنے دشمنوں کی صف میں شامل کر لیا۔

مرزائیت کے پینے کے وسائل :

جانبا ز مرزا بیان کرتے ہیں :

۱۸۵۷ء کے بعد غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے دائمی استحکام کے لئے ہندوستان کی مختلف اقوام میں منافرت کا جو بیج بویا، اس کے برگ و بار میں مرزائیت ایک ایسی تحریک ثابت ہوئی کہ نہ صرف اسلام کے بنیادی ستون ہی متزلزل ہوئے بلکہ ہندوستان کی غیر ملکی غلامی کی عمر بھی طویل ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے انگریزی راج کا اقتدار جڑ پکڑتا گیا، اسی رفتار سے مرزائیت کو پینے کے وسائل میسر آتے رہے۔

قادیان میں تحریک ختم نبوت کے دفتر کا قیام :

اپنی بنیاد کے دو سال بعد مجلس احرار نے اس تحریک کے مقابلے کے لئے قادیان میں اپنا دفتر قائم کیا۔ زعمائے احرار کے نزدیک غلامی سے آزادی تک کا راستہ مرزائیت کی موت کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ جڑ کاٹنے سے پیشتر درخت کے تنے اور شاخیں کاٹنا ضروری ہوتی ہیں۔

۱۹۲۰ء میں امیر شریعت نے مرزا بشیر الدین محمود کو لکارا تھا۔ اس وقت ان کی یہ لکارا انفرادی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن ۱۹۳۱ء میں مجلس احرار نے جب مرزائیت کا محاسبہ کیا تو امیر شریعت کے لاکھوں مرید اور ہزاروں رضا کاروں کی فعال جماعت ان کی پشت پناہ تھی۔

بیماری کو بھول گئے :

امیر شریعت کی صحت کی خرابی کی وجہ سے ان کے ذاتی معالج (حکیم عطاء اللہ خان) انہیں کسی قسم کے سفر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لیکن توہین خاتم الانبیاء کے باعث امیر شریعت اپنی بیماری کو بھول چکے تھے۔ تحریک راجپال کے بعد یہ دوسرا موقعہ تھا کہ امیر شریعت مرزائیت کے خلاف اس قدر جذباتی ہو گئے تھے کہ اس سے پیشتر انہیں کبھی اتنا تشدد نہیں دیکھا گیا تھا۔

”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ کے آگے ”لابی بعدی“ کا جملہ ہر مجمع میں کہتے اور عوام کو تائید کرتے کہ :

”مقام نبوت ایسے خطرناک موڑ پر آن پہنچا ہے، اگر آج اس کی

حفاظت نہ کی گئی، تو قیامت کے دن ہم سب کی بخششوں کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔

یہ فقرہ کہتے ہوئے امیر شریعت کی حالت غیر ہو جایا کرتی تھی، وہ آپ سے باہر ہو کر غصہ میں کانپنے لگتے۔

یوم احتجاج :

مرزائیت کے خلاف تحریک ہنوز تیز نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ امیر شریعت نے مغربی پاکستان کو اپنی تقریروں سے اس قدر مشتعل کر دیا تھا کہ تحریک کا سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ تاہم ایسی بات نہیں تھی کہ حالات کے بگڑنے کا امکان ہو۔ ۱۷۔ ۱۸ مئی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک کراچی میں چودھری سر ظفر اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان نے مرزائیوں کے سالانہ اجتماع میں وزیر اعظم پاکستان کے منع کرنے کے باوجود تقریر کی، جس نے حالات کو زیادہ خراب کر دیا۔ لیکن امیر شریعت کی تقریروں نے حالات کو سنبھالا دیتے ہوئے تشدد کی طرف سے رخ موڑ کر محض احتجاجی کر دیا۔

انہی دنوں ملتان شہر کے ایک تھانہ (کپ) کے سب انسپکٹر غلام مصطفیٰ نے (جس کے متعلق لوگوں کی رائے تھی کہ یہ مرزائی ہے) ۱۸ جولائی کو عوام کے ایک جلوس پر لاشی چارج کیا تھا، عوام نے تھانہ کے سامنے جمع ہو کر اس کے خلاف احتجاج کیا، تو اس مجمع پر بلا وارننگ گولی چلا دی گئی۔ دس منٹ تک ستر راؤنڈ چلائے گئے، جس کے نتیجے میں چھ مسلمان شہید ہوئے اور زخمیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اس خونی واردات کے خلاف سارے پاکستان میں یوم احتجاج منایا گیا۔

شہدا کو خراج عقیدت :

۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو شہدائے ملتان کو شاہ جی نے حسب ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی :

أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ - وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِينَ -

ترجمہ: کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ محض ایمان لانے سے ہی نجات حاصل کر لیں گے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی۔ حالانکہ وہ تمام لوگ آزمائے جا چکے ہیں، جو ان سے پہلے گزرے ہیں اور ان لوگوں کو جو کاذب و مفتری ہیں:-

(آپ نے صدیق اکبرؓ کے زمانہ خلافت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا)

”جب مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام کے بنیادی عقیدہ کو گزند پہنچانے کی ناپاک کوشش کی تو حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کاذب و مفتری سے کسی قسم کا مناظرہ کر کے دعویٰ نبوت کے جواز میں دلیل طلب نہیں کی۔ اگر کیا تو یہ کہ سات ہزار سے زائد حافظ قرآن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، ناموس رسالت اور تاج و تخت ختم نبوت پر قربان کر دیے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی متاع دین و ایمان کو ایک عیار اور مٹکار کی دست برد سے بچالیا۔ اور آئندہ کے لئے ملت اسلامیہ کو سبق دیا کہ جو شخص اس قسم کی ناپاک کوشش کرے، اس کے لئے اسلام اور ملت اسلامیہ کا فیصلہ کیا ہے؟

جذبہ قربانی کو سلام :

ملتان کے غیور اور صاحب ایمان مسلمانوں نے بھی اس دور پر آشوب میں

جبکہ کفر و ارتداد کی سیاہ گھٹاؤں نے ایمان و یقین کو پریشان کر رکھا ہے اسلام کی لاج رکھ لی، اور اپنے جگر گوشوں کو شمع رسالت پر پروانہ وار نثار کر کے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان آج بھی فخر و عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کی خاطر گولیوں کی بارش میں مسکرا سکتا ہے.....

مرتبہ شہیدِ ناز کا گر جان جائے

قربان جانے والے کے قربان جائے

خدا کی نعمتیں نچھاور ہوں تم پر شہیدانِ ناموس رسالت، سلام ہو تم پر اے ختم

المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و آبرو پر قربان ہونے والو، مبارک ہیں ان کے والدین کہ ان کے نذرانے سرکار رسالت مآب میں شرف قبولیت حاصل کر گئے۔

یوں تو اس دنیا میں ہزاروں بچے جنم لیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ہزاروں

کلیاں کھلتی ہیں اور بادِ سموم کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر مر جھا جاتی ہیں۔ مگر وہ موت جو

حق اور راستی کی راہ میں آئے، حیاتِ جا دو اں بن کر آتی ہیں.....

جو موت آئے تو زندگی بن کے آئے

قضا کی نرالی ادا چاہتا ہوں

مجلس عمل کا قیام :

صدر مملکت بننے کی خواہش میں ملک غلام محمد گورنر جنرل، خواجہ ناظم الدین کی

کیبنٹ میں اپنا اثر بڑھا رہے تھے، اور اس میں وہ اچھے خاصے کامیاب رہے۔ کیبنٹ

کے پارلیمانی اختیارات آہستہ آہستہ گورنر جنرل کے ہاتھ میں آ گئے اور فیصلوں کی تمام تر

ذمہ داری گورنر جنرل کے قبضے میں چلی گئی۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی اس باہم کھینچا

تانی نے مرزائیت کے خلاف تحریک کو زیادہ ہوا دی۔

پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کی نواب افتخار حسین آف مہوٹ سے اندرون خانہ چل رہی تھی۔ نواب مہوٹ نے سرحد کے عبدالقیوم خان سے دولتانہ کے خلاف سمجھوتہ کر لیا تھا۔ دوسری طرف دولتانہ مرکزی حیثیت حاصل کرنے کی غرض سے خواجہ ناظم الدین کے خلاف ابھرتی ہوئی مسلمان ایچی ٹیشن کو ارادتا نظر انداز کر رہے تھے۔

یہ تھا پس منظر جس نے عوام میں یہ تاثر دیا کہ مرزائیت کے خلاف تحریک دولتانہ کی پیداوار ہے۔ حالانکہ دولتانہ مرکز سے اور نواب مہوٹ سے اپنا سیاسی انتقام لے رہے تھے۔

ایسے حالات میں مرزائیوں کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں نے عوام کو موقعہ دیا کہ وہ حکومت سے مرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کریں۔ جہانگیر پارک میں ظفر اللہ خاں کی تقریر کے بعد کراچی میں ۲ جون ۱۹۵۲ء کو آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونینشن طلب کیا گیا۔ جس میں دو دن کی مسلسل بحث کے بعد حسب ذیل قرارداد کی تشکیل کی گئی۔

(۱) مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

(۲) چودھری ظفر اللہ وزیر خارجہ کو اس کے عہدے سے الگ کر دیا جائے۔

(۳) مرزائیوں کو تمام کلیدی آسامیوں سے ہٹا دیا جائے۔“

ان مطالبات کی تصدیق کے لئے ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور برکت علی ہال

میں آل مسلم پارٹیز کنونینشن کا پھر اجلاس ہوا۔ جس میں حسب ذیل حضرات کی ایک

مجلس عمل مرتب کی گئی۔

(۱) مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیت علمائے پاکستان

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی (جماعت اسلامی)

(۳) ماسٹر تاج الدین انصاری (احرار)

(۴) شیخ حسام الدین (احرار)

(۵) مولانا عبدالحکیم قاسمی (جمعیت علمائے اسلام)

(۶) مولانا محمد طفیل (جمعیت علمائے اسلام)

(۷) مولانا محمد بخش مسلم (جمعیت علمائے پاکستان)

(۸) مولانا غلام محمد ترنم (حزب الاحناف)

(۹) مولانا غلام دین (حزب الاحناف)

(۱۰) مولانا داؤد غزنوی (جمعیت اہل حدیث)

(۱۱) مولانا عطاء اللہ حنیف (جمعیت اہل حدیث)

(۱۲) مولانا نصر اللہ خان عزیز (جماعت اسلامی)

(۱۳) حافظ کفایت اللہ حسین (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ)

(۱۴) مظفر علی شمسی (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ)

(۱۵) مولانا نور الحسن شاہ بخاری (تنظیم اہل سنت والجماعت)

(۱۶) صاحبزادہ فیض الحسن (انجمن سجادہ نشیناں پنجاب)

(۱۷) مولانا عبدالغفور ہزاروی (انجمن سجادہ نشیناں پنجاب)

(۱۸) علامہ علاؤ الدین صدیقی (نامزد)

(۱۹) مولانا اختر علی خاں (نامزد)

(۲۰) مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش (نامزد)

مجلس عمل نے ۲۳ جنوری ۱۹۵۳ء کو وزیراعظم پاکستان سے مل کر انہیں اپنے مطالبات پیش کئے اور ایک ماہ کا نوٹس دے دیا کہ اگر ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء تک مجلس عمل کے متذکرہ مطالبات منظور نہ کئے گئے تو مجلس عمل اپنے مطالبات منوانے کے لئے راست اقدام کرنے پر مجبور ہوگی۔

مسئلہ ختم نبوت کی وضاحت :

اس دوران دوسری جماعتوں کے مقررین کے علاوہ امیر شریعت نے پنجاب سندھ اور سرحد میں تقریریں کر کے مسئلہ ختم نبوت کو عوام کے سامنے بڑی وضاحت سے بیان کیا، اس ضمن میں پشاور کے چوک یادگار کی ایک تقریر کے اقتباس خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مفتی سرحد مولانا عبدالقیوم پوپلزئی کی صدارت میں تقریباً ساٹھ ہزار (۶۰۰۰۰) نفوس کی حاضری میں امیر شریعت نے فرمایا :

”اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں انبیاء کرام علیہم السلام کا جہاں ذکر کیا ہے، وہاں ہر نبی کے بعد آنے والے دوسرے نبی کی اطلاع دے دی۔ چنانچہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دیتے رہے۔ حتیٰ کہ یہ سلسلہ نبوت خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ تک آپہنچا۔

آپ نے فرمایا : مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلَكِن

رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ۔ (الاحزاب: ۴۰)

حضرت محمد ﷺ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے

رسول ہیں اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں۔ اگر حضور ﷺ کے بعد کسی اور نبی نے آنا ہوتا اور یہ سلسلہ نبوت جاری رہنا ہوتا تو حضور ﷺ یہ اعلان نہ فرماتے کہ :
 انا خاتم النبیین لانی بعدی، یعنی میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا یہ تاجدار مدینہ رحمت دو عالم، خاتم الانبیاء ﷺ کی شان اقدس پر انتہائی کمینہ اور گستاخانہ حملہ ہے کہ ایک انگریز کا پروردہ اٹھ کر یہ اعلان کرے۔ کہ ”قرآن پاک کی وحی الہی میں میرا نام محمد رکھا گیا اور رسول بھی“۔ امیر شریعت نے فرمایا :
 ”اگر میں آج اعلان کروں کہ میں قائد اعظم ہوں تو کیا تم برداشت کرو گے؟“

سامعین : ”ہرگز نہیں“۔

امیر شریعت : ”اگر تم اپنے ایک دنیوی لیڈر کا مقام کسی دوسرے شخص کو دینے کی اجازت نہیں دیتے تو پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ برطانیہ کا پٹھو، تاجدار مدینہ خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرے کہ میں محمد ہوں۔
 اسی اصول اور ضابطے کے مطابق ہم اپنی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ مرزائیوں نے چونکہ حضور پر نور ﷺ کے بعد مرزا غلام احمد کو اپنا نبی تسلیم کر کے اپنا تعلق سرکار مدینہ سے توڑ لیا ہے۔ اسلامی آئین کے مطابق حضور کے بعد کسی دوسرے نبی کو ماننے والا مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

امیر شریعت نے قادیانی الہام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

(مرزا بشیر الدین محمود کہتا ہے کہ ”موجودہ ملکی تقسیم غلط ہے، یہ تقسیم ختم کرانے اور دونوں ملکوں کا باہمی افتراق دور کرانے کی وہ ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس عارضی تقسیم

کو کسی نہ کسی طرح ختم کیا جائے گا، اور پاکستان کو پھر اکھنڈ ہندوستان بنایا جائے گا“ جو آزادی ایک لاکھ ماؤں، بہنوں کی عزت و آبرو قربان کر کے اور دس لاکھ مسلمانوں کا خون بہا کر ایک کروڑ مسلمانوں کی خانہ بربادی کے بعد حاصل کی گئی ہے اس کو عارضی آزادی سمجھنے والا ملک و ملت کا بدترین دشمن نہیں تو اور کیا ہے۔
یہ بصیرت افروز تقریرات ایک بجے تک جاری رہی۔

(مخلص از حیات امیر شریعت ص: ۳۳۰ تا ۳۳۹)

محمد علی بوگرہ کی آمد :

مرزا جانبا ز مزید حالات لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں :

تحریک ختم نبوت کے باعث پاکستان کی سیاست میں غاجلانہ طور سے اکثر ایسی تبدیلیاں آئیں کہ عوام اور خود حکمران پارٹی کو بھی اس کا یقین نہیں تھا۔ مثلاً صوبہ سرحد کے خان برادران کا وجود مسلم لیگی حکمرانوں کے لئے دشمنی کا انتہائی بلند مقام رکھتا تھا۔ لیکن سیاسی ضرورت نے راتوں رات دشمنی کو دوستی میں بدل دیا۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان نے اپنی کابینہ کے رکن سکندر مرزا کے مشورے پر ڈاکٹر خان کو حکومت کے قریب کر لیا۔ عبدالقیوم خان پہلے سے ہی محمد علی بوگرہ کی وزارت میں شامل ہو چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ سرحد کی سیاسی چپقلش ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن پنجاب کے امن کی باگ ڈور تحریک ختم نبوت کے رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ سب کے سب جیل خانوں میں تھے، چنانچہ اس کام کے لئے گورنر جنرل پاکستان نے اپنے نامزد وزیراعظم کو سکھر جیل میں بھیجا۔

”آپ حضرات اگر اپنی تحریک کے سلسلے میں حکومت کے روبرو معذرت

کردیں تو آپ کو رہا کر دیا جائے گا۔ میں اسی کام کے لئے آپ سے ملنے آیا ہوں۔
وزیراعظم پاکستان کے یہ الفاظ حضرت امیر شریعتؒ اور ان کے ہم اسیرانِ قفس کے لئے نئے نہیں تھے، اس سے پیشتر اس قسم کی پیش کش کراچی جیل میں سابق وزیراعظم کی طرف سے بھی ہو چکی تھی۔

امیر شریعتؒ نے محمد علی بوگرہ کو نہایت مختصر جواب میں فرمایا :

”آپ حضرات کو ہماری اس قدر فکر کیوں ہے؟“

صوبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

کئے جاؤ مے خوارو ! کام اپنا اپنا

وزیراعظم پاکستان امیر شریعتؒ کا یہ شعر سن کر تھوڑی دیر ٹھہرے اور واپس چلے

گئے۔ (حیات امیر شریعت ص: ۳۶۵)

موقف اور اعتماد :

عوامی زندگی میں ہمسفروں پر اعتماد اسی قدر لازمی ہے جس قدر انسانی اعضاء پر بھروسہ کرنا ضروری ہے، ورنہ نہ تو گھر کا نظام چل سکتا ہے اور نہ ہی سیاسی جماعتیں زندہ رہ سکتی ہیں۔

امیر شریعتؒ نے صاحب رائے اور قادر الکلام ہونے کے باوجود بھی زندگی میں رضا کاروں تک کو اپنے بھروسے میں لیا اور قافلہ ہائے حیات کے ایک ایک فرد پر اعتماد کی ایسی عمارت استوار کی کہ ہر آدمی کو اپنے اعتماد کا وارث قرار دے دیا۔

تحقیقاتی عدالت کے روبرو مجلس احرار اور مجلس تحفظ ختم نبوت کا موقف واضح کرنے کا سوال آیا تو مشترک رہنماؤں کا ایک خصوصی اجلاس جیل میں منعقد ہوا جس

میں مختلف احباب نے اپنا اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے تحقیقاتی کمیشن کے ساتھ تعاون پر زور دیا اجلاس میں دوستوں کی رائے سن کر امیر شریعت نے ایک سر آہ کے ساتھ فرمایا: ”آپ دوست جو فیصلہ چاہیں کریں میں اس سے انحراف نہیں کروں گا، آپ حضرات کی باتوں نے میرے دماغ کو متاثر کیا ہے، لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں، یہ میرا ساتھ نہیں دے رہا، دل گواہی دیتا ہے کہ یہ کمیشن ہمارے ساتھ انصاف نہیں کرے گا، بلکہ ارباب حکومت نے ہمیں رسوا کرنے کے لئے ایک خوبصورت چال چلی ہے۔ اگر میری مانو تو ہمیں کمیشن سے عدم تعاون کا اعلان کر دینا چاہیے، پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

ویسے آپ لوگوں نے شہید گنج اور ۱۹۴۶ء کے انتخاب کے موقع پر بھی میری بات نہیں مانی تھی اور آخر وہی ہو کر رہا جس کا میں نے اظہار کیا تھا، مجھے یقین ہے کہ اب بھی آپ میری بات نہیں مانیں گے، تاہم اگر آپ حضرات اس پر مصر ہیں، تو پھر ہمیں مشروط تعاون پر آمادگی ظاہر کرنی چاہیے کہ ہمارا اصل فریق مخالف چونکہ قید و بند سے باہر ہے اس لئے یا تو اسے بھی ہمارے ساتھ یہاں لایا جائے تاکہ مقدمہ کی پیروی کے لئے ہم دونوں کے وسائل اور ذرائع یکساں ہوں، یا پھر ہمیں آزاد کر دیا جائے تاکہ ہم بھی اپنا موقف آزادانہ ماحول میں واضح کر سکیں۔

ایک فریق کو آزاد اور دوسرے کو سلاخوں میں بند کرنا، عملی صورت ہی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ارباب حکومت اپنا فیصلہ صادر فرما چکے ہیں۔ میری مانو، تو اپنی زندگی کا باقی حصہ قید و بند کی نظر کر دو، اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو۔ وہ بہتر کارساز ہے۔ لیکن اگر آپ حضرات اس کے لئے آمادہ نہ ہو سکیں تو میں آپ کے فیصلے کا

پورا پابند رہوں گا انشاء اللہ اس پر عمل کروں گا۔

”ہمارے ہاں تو جماعت نام ہے چند دوستوں اور ساتھیوں کی رفاقت کا“۔

امیر شریعت کی اس تقریر کے باوجود اجلاس نے فیصلہ کیا کہ مجلس احرار کو متوقع

نتائج سے بے پرواہ ہو کر من حیث الجماعت تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنا موقف پیش

کر دینا چاہیے۔ (حیات امیر شریعت ص: ۳۷۱)

قادیان میں تاریخی تقریر :

قادیان کے گلی کوچوں میں ایک رضا کار ٹین کا کنستریبجا کر اعلان کر رہا تھا کہ

ظہر کی نماز کے بعد حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مسجد شیخان میں ختم نبوت

کے موضوع پر تقریر کریں گے۔ اس اعلان سے قادیان میں ہڑ بونگ مچ گئی۔ بھاگیو،

دوڑیو، لیجیو، پکڑیو، پولیس الگ بھاگی پھرتی تھی، مرزائیوں کی سی آئی ڈی الگ

پریشان ہو رہی تھی۔

قصر خلافت میں اہم میٹنگ :

اس موقع پر ماسٹر تاج الدین انصاری بھی امیر شریعت کے ہمراہ تھے۔ وہ

فرماتے ہیں کہ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ مرزا محمود کے قصر خلافت میں کیا مشورہ ہوا مگر جو

کچھ میرے سامنے آیا، میری آنکھوں نے جو نظارہ دیکھا اس سے جو نتیجہ اخذ ہو سکتا تھا وہ

یہی تھا کہ حضرت شاہ جی کو تقریر کا موقع نہ دیا جائے۔

تقریر کا اعلان :

اعلان ہوتے ہی پولیس گارڈ مسجد شیخان کے موڑ پر پہرا جما کر کھڑی ہو گئی۔

اسے خیال یہ تھا کہ حضرت شاہ جی بازار کے سیدھے راستے مسجد میں تشریف لائیں گے مگر میں کسی اور فکر میں تھا۔ چنانچہ میں نے حضرت شاہ جی سے عرض کیا کہ آپ میرے ساتھ آئیں میں آپ کو ایسے راستے سے لے چلوں گا کہ آپ کا جی خوش ہو جائے گا۔ میں انہیں مرزائیوں کے خاص محلے میں سے گزار کر سیدھا قصر خلافت کی جانب لے گیا۔ مرزا محمود کے محل کے پاس سے ایک چھوٹی سی گلی سے نکل کر ہم مسجد شیخان میں بخیریت پہنچ گئے۔ کس قدر خطرناک راستہ تھا مگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال تھا۔ کسی شخص کو کوئی شرارت نہ سوجھی اور نہ کسی نے ہم سے تعرض کیا۔

حضرت شاہ جی منبر پر کھڑے ہوئے تقریر سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت شروع کی۔ اتنے میں مرزائی رضا کار جن کے ہاتھوں میں لٹھیاں تھیں مسجد میں داخل ہوئے قادیان کے ایک جیالے مسلمان نے مرزائیوں کے داخلے پر احتجاج کرنا چاہا مگر حضرت شاہ جی نے اسے ڈانٹ کر خاموش کر دیا اور فرمایا یہ نوجوان ہمارے مہمان ہیں اور یہ خانہ خدا ہے اس میں داخل ہونے پر کوئی پابندی نہیں ہے اس کے بعد مرزائی نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ آؤ میرے عزیزو! آگے آ کر بیٹھو، بیٹھو، بھئی ان کو جگہ دو وہ لوگ آگے آ کر بیٹھ گئے۔ حضرت شاہ جی نے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کی آیت درد میں ڈوبی ہوئی آواز سے تلاوت کی اور اس کے بعد مسئلہ ختم نبوت پر مثبت انداز میں تقریر فرمائی۔ تقریر کیا تھی جا دو تھا، سحر تھا، پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ تقریر کا ہر لفظ دل کی گہرائیوں میں اتر رہا تھا۔ خدا جانے کیا ہوا حاضرین سانس بھی آہستہ لیتے تھے۔ شاہ جی نے اس مسئلے پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا۔ دوران تقریر وہ دریافت بھی کرتے گئے کہ مسئلہ ٹھیک طح سمجھ میں آ گیا

”میں مرزا محمود اور قادیانیت کی جو مخالفت کر رہا ہوں۔ رب العزت کی قسم اس میں کوئی ذاتی غرض نہیں ہے اور نہ مجھے مرزا محمود اور قادیانیوں سے کوئی ذاتی رنجش یا کد ہے۔ میری دشمنی صرف حضور ختم المرسلین ﷺ کی محبت کی وجہ سے ہے مرزائی قادیانی کو محمد ﷺ کا شریک جانتے ہیں اور خدا کو یہ بات ہرگز گوارا نہیں ہے۔ دنیا میں ہزاروں نہیں لاکھوں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جو خدا کا شریک بتاتے اور بناتے ہیں لیکن خدا نے اپنے قصر ربوبیت کے دروازے بند نہیں کئے اور بدستور جس طرح ان کی پرورش کرتا ہے جو خدا کو وحدہ لا شریک مانتے ہیں اسی طرح مشرکین کو بھی پالتا ہے۔ اس کا غضب پوری طرح سے کبھی ان پر نازل نہیں ہوا لیکن رسول اللہ ﷺ کی نبوت میں شریک بنانے والے کو کبھی خدا نے معاف نہیں کیا۔ جس نے رسول اللہ ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا وہ کبھی نہیں پھولا پھلا۔ یہی انجام مرزائیوں کا ہوگا۔“

ع باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار (بخاری کی باتیں ص: ۳۸)

جاؤ میری ٹوپی خواجہ ناظم الدین کے قدموں میں ڈال دو :

حضرت مولانا اللہ وسایا رقم طراز ہیں :

حضرت امیر شریعت تحریک ختم نبوت کے دنوں میں تقریر کر رہے تھے شاہ جی پورے جو بن پر تھے۔ بے انداز مجمع گوش بر آواز، عشق رسول کی بھٹی گرم، اکابر واساطین ملت جلوہ افروز، شہر میں مکمل ہڑتال اور سناٹا، تحریک ختم نبوت کے لئے مسلمان جانیں دینے کے لئے آمادہ۔ کسی نے کہا شاہ جی خواجہ ناظم الدین لاہور پہنچ گئے ہیں۔ شاہ جی نے فرمایا۔ ساری باتوں کو چھوڑیں، لاہور والو کوئی ہے اور یہ کہتے ہوئے اپنے سر سے ٹوپی اتار لی اور ٹوپی کو ہوا میں لہراتے ہوئے نہایت جذبات انگیز

الفاظ میں فرمایا: جاؤ! میری اس ٹوپی کو خواجہ ناظم الدین کے پاس لے جاؤ۔ میری یہ ٹوپی کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکی، اسے خواجہ صاحب کے قدموں میں ڈال دو۔ اس سے کہو، ہم تیرے سیاسی حریف اور رقیب نہیں ہیں۔ ہم الیکشن نہیں لڑیں گے تجھ سے اقتدار نہیں چھینیں گے۔ ہاں ہاں جاؤ اور میری ٹوپی اس کے قدموں میں ڈال کر یہ بھی کہو کہ اگر پاکستان کے بیت المال میں کوئی سوراہا ہے تو عطاء اللہ شاہ بخاری تیرے سوروں کا وہ ریوڑ چرانے کے لئے تیار ہے۔

مگر شرط صرف یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فدائے ابی و امی کی ختم نبوت کی حفاظت کا ایسا قانون بنا دے کہ کوئی میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین نہ کر سکے آپ کی دستار ختم نبوت پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے۔ شاہ جی بول رہے تھے اور لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ (تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء ص ۲۵۴)

امیر شریعت اور جسٹس منیر کا مکالمہ :

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت اپنے شباب پر پہنچ کر مائل بہ اختتام تھی۔ تحریک کی قیادت اور ہزاروں کارکن جیلوں میں بند تھے۔ عدالتی تحقیقات کے لئے جسٹس منیر اور ایم آر کیانی پر مشتمل کمیشن لاہور ہائی کورٹ سماعت کر رہا تھا۔ جسٹس منیر متعصب قادیانی نواز تھا۔ وہ علماء کو عدالت میں بلا بلا کر بے عزت کر رہا تھا۔ تحریک ختم نبوت کو ”احرار احمدی نزاع“ اور ”فسادات پنجاب“ کا نام دیتا تھا۔ اسلام کو موضوع بحث بنا کر علماء کا مذاق اڑا رہا تھا اور اپنے قادیانی آقاؤں اور محسنوں کو خوش کر رہا تھا۔

سرکار بنام عطاء اللہ شاہ بخاری :

لیکن ایک دن وہ اپنی ہی عدالت ہی میں پکڑا گیا۔ اس نے مجدد تحریک تحفظ

تذکرہ دسواں سید عطاء اللہ شاہ بخاری ----- ﴿ ۱۷۰ ﴾

ختم نبوت، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو عدالت میں طلب کر لیا۔ حکومت نے بیان داخل کرنے کے لئے امیر شریعت کو سکھر جیل سے لاہور سنٹر جیل منتقل کر دیا۔ پیشی کی تاریخ پر امیر شریعت اور ان کے قیدی رفقاء کو سخت پہرے میں عدالت لایا گیا۔ عدالتی ہرکارے نے آواز لگائی، سرکار بنام عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ۔

امیر شریعت عدالت میں :

اب امیر ختم نبوت امیر شریعت، پورے قلندرانہ جاہ و جلال اور ایمانی جرأت وقار کے ساتھ کمرہ عدالت میں داخل ہوئے، سرفروشانِ احرار نے پورے ہائی کورٹ کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ عدالت کے دروازے پر ہزاروں فدائین ختم نبوت اور شمع رسالت کے پروانے نعرہ زن تھے۔ نعرہ تکبیر..... اللہ اکبر، تاج و تخت ختم نبوت..... زندہ باد، مرزائیت.... مردہ باد، امیر شریعت نے عدالت کے دروازے پر کھڑے ہو کر ہتھکڑیاں فضا میں لہرائیں اور ہاتھ سے اشارہ کیا..... مجمعِ دارنگی سے پوچھ رہا تھا :

سیدی و مرشدی! کہیے کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں؟ حکم ہوا..... خاموش! تمام مجمع ساکت و جامد! امیر شریعت عدالت میں داخل ہو گئے۔

مردِ مومن کا چہرہ :

جسٹس منیر.... بغض و حسد سے بھرا ہوا، غصے سے لال پیلا، گردن تنی ہوئی اور تکبر و غرور کا ناہنجار بن کر سی پر بیٹھا تھا۔ مردِ مومن کے چہرہ انور پر نگاہ پڑی تو اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ جسٹس منیر دوسری مرتبہ آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کارروائی شروع ہو گئی۔ امیر شریعت نے اپنا تحریری بیان عدالت میں پیش کیا۔ جسٹس

منیر نے ایک نظر بیان کو دیکھا (جسے اس نے ”منیر انکوائری رپورٹ“ میں شامل نہیں کیا) اور پھر مخصوص چھبے ہوئے انداز میں سوالات کا آغاز کر دیا۔

جسٹس منیر: ہندوستان میں اس وقت کتنے مسلمان ہیں؟

امیر شریعت: سوال غیر متعلق ہے، مجھ سے پاکستان کے مسلمانوں کے بارے میں پوچھیں۔

جسٹس منیر: (تمسخر آمیز لہجے میں) ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ جائے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟

امیر شریعت: ہندوستان میں علماء موجود ہیں، وہ بتائیں گے۔

جسٹس منیر: (طنز کرتے ہوئے) آپ بتادیں؟

امیر شریعت: پاکستان کے بارے میں پوچھیں، یہاں کے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔

جسٹس منیر: مسلمان کی تعریف کیا ہے؟

امیر شریعت: اسلام میں داخل ہونے اور مسلمان کہلانے کے لئے صرف کلمہ شہادت کا

اقرار اعلان ہی کافی ہے، لیکن اسلام سے خارج ہونے کے ہزاروں روزن

ہیں۔ ضروریات دین میں سے کسی ایک کا انکار کفر کے ماسوا کچھ نہیں۔ اللہ

تعالیٰ کی صفات عالیہ میں سے کسی ایک کو بھی انسانوں میں مانا تو مشرک،

قرآن کریم کی کسی ایک سورۃ یا آیت یا جملہ کا انکار کیا تو کافر، اور نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب ختم نبوت کے بعد کسی انسان کو کسی بھی حیثیت سے نبی مانا

تو مرتد۔

جسٹس منیر: (قادیانی وکیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان کے بارے میں کیا

خیال ہے؟

امیر شریعت: خیال نہیں عقیدہ ہے، جوان کے بڑوں کے بارے میں ہے۔

مرزائی وکیل: نبی کی تعریف کیا ہے؟

امیر شریعت: میرے نزدیک اسے کم از کم ایک شریف آدمی ہونا چاہیے۔

جسٹس منیر: (بدتمیزی کے انداز میں) آپ نے مرزا غلام احمد قادیانی کو کافر کہا ہے؟

امیر شریعت: میں اس سوال کا آرزو مند تھا۔ کوئی بیس برس ادھر کی بات ہے، یہی

عدالت تھی، جہاں آپ بیٹھے ہیں، یہاں چیف جسٹس، مسٹر جسٹس ڈگلس

ینگ تھے اور جہاں مسٹر کیانی بیٹھے ہیں، یہاں رائے بہادر جسٹس رام لال

تھے۔ یہی سوال انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔ وہی جواب آج دہراتا

ہوں۔ میں نے ایک بار نہیں ہزاروں مرتبہ مرزا کو کافر کہا ہے، کافر کہتا

ہوں، کافر کہتا رہوں گا۔ یہ میرا ایمان ہے، عقیدہ ہے اور اس پر مرنا چاہتا

ہوں۔ مرزا قادیانی اور اس کی ذریت کافر و مرتد ہے مسلّمہ کذاب اور

ایسے ہی دیگر جھوٹوں کو دعویٰ نبوت کے جرم میں قتل کیا گیا۔

جسٹس منیر: (غصے سے بے قابو ہو کر دانت پیتے ہوئے) اگر غلام احمد قادیانی آپ کے

سامنے یہ دعویٰ کرتا تو آپ اسے قتل کر دیتے؟

امیر شریعت: میرے سامنے اب کوئی دعویٰ کر کے دیکھ لے۔

حاضرین عدالت: نعرہ تکبیر، اللہ اکبر، ختم نبوت زندہ باد، مرزائیت مردہ باد، کمرہ

عدالت لرز گیا۔

جسٹس منیر: (بوکھلا کر) توہین عدالت۔

امیر شریعت: (جلال میں آکر) توہین رسالت۔

جسٹس منیر: دم بخود، خاموش، مبہوت، حواس باختہ، ہوش عنقا، پیشانی سے پسینہ پونچھنے

لگا۔ عدالت امیر شریعت کی جرأت ایمانی اور جذبہ حب رسول ﷺ دیکھ کر

سکتے میں آچکی تھی۔ (از سید محمد کفیل بخاری بحوالہ نقیب ختم نبوت اگست ۲۰۰۱ء)

انسان یا چٹان :

شاعر ختم نبوت سید امین گیلانی لکھتے ہیں :

راقم الحروف کو یہ واقعہ شاہ جی نے خود سنایا تھا فرمایا ایک دفعہ جالندھر میں

قادیانیت کے خلاف تقریر کر رہا تھا اچانک کسی مخالف نے شہدگی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ

دیا فرمایا شہدگی مکھیوں کا ایک مکمل نظام ہے۔ وہ اس نظام اور اپنے سردار کے تحت کام کرتی

ہیں۔ فرمایا میں دیکھ رہا تھا کہ مکھیوں کا سردار آگے آگے میری طرف تیزی سے آرہا ہے اور

پیچھے پیچھے مکھیوں کا لشکر، وہ آتے ہی میرے ابروؤں کے درمیان بیٹھ گیا اور ساتھ ہی تمام

لشکر نے میرے چہرے پر ڈیرہ جمالیا۔ اسی اثنا میں، میں نے دیکھا کہ بعض لوگ اٹھ کر

بھاگنے لگے، میں نے فوراً لکارا کہ خبردار کوئی اٹھنے نہ پائے۔ فرمایا مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ

بھاگتے کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ اس لئے روک دیا کہ میں تختہ مشق بن چکا ہوں، دوسرے

لوگ بھی ساتھ مارے نہ جائیں۔ فرمانے لگے کہ میرا چہرہ گرم ہوتا گیا۔ مجھے ان کے ڈنگ

مارنے کا کچھ احساس نہیں تھا۔ صرف ایک مکھی نے کہیں میرے آنکھ کے کونے میں ڈنگ

مارا تو مجھے سوئی لگنے کی سی چھن محسوس ہوئی، مگر میں اپنی جگہ پر جم کر کھڑا رہا۔ بالآخر لوگوں

نے سعی کر کے مجھے وہاں سے بچا کر ساتھ لیا۔ کئی دن تک میرے چہرے کا ورم نہ گیا۔

کئی کئی سیر برف کوٹ کوٹ کر میرے چہرے پر رکھی جاتی تھی۔ فرمایا مجھے ایک خطرہ تھا،

کہیں میری بیٹائی کو نقصان نہ پہنچا ہو، جب ذرا میری آنکھیں کھلیں تو مجھے روشنی نظر آئی، تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ (بخاری کی باتیں ص ۲۶، ۲۷)

میرا سب کچھ قربان :

شاہ جی نے ایک دفعہ تقریر میں فرمایا! قادیان کانفرنس کے خطبہ پر دفعہ ۱۵۳ کے تحت مجھ پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ اس کی سزا زیادہ سے زیادہ صرف دو سال قید ہے۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں محمد ﷺ کا خادم ہوں۔ اس جرم میں یہ سزا بہت کم ہے میں رسول اللہ کی ناموس پر ہزار جان سے قربان ہونے کو تیار ہوں مجھے شیروں اور چیتوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اور پھر کہا جائے کہ تجھے بجرم عشقِ مصطفیٰ ﷺ یہ تکلیفیں دی جا رہی ہیں تو میں خندہ پیشانی سے اس سزا کو قبول کروں گا اور میں اپنا آٹھ سالہ بچہ عطاء المنعم اور اس جیسے خدا کی قسم ہزار بچے رسول اللہ ﷺ کی کفش پر نچھاور کر دوں۔ (مختصر سوانح از غازی خاں کابلی)

شہداء ختم نبوت :

میں کہتا ہوں کہ جب تک احرار زندہ ہیں جھوٹی نبوت نہیں پھیلے گی۔ جب بھی کبھی کوئی کذاب سر اٹھائے گا صدیق اکبرؓ کی سنت جاری کی جائے گی۔ ماضی میں احرار کی بے پناہ جدوجہد، جانکام محنت و ایثار اور ہماری برپا کردہ تحریک تحفظ ختم نبوت میں ہزاروں جوانان گل گون قبا، سرخ پوشان راہ بقا اور سرستان عہد و وفا کی قربانی و شہادت احرار کے اخلاص کی زندہ مثال ہے۔

جو لوگ تحریک ”تحفظ ختم نبوت“ میں جہاں جہاں شہید ہوئے ان سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور جو آئندہ ہوگا اس کی بھی۔ شہداء ختم نبوت کے لئے میں کیا دعا

کروں؟ دعا تو یہ ہے کہ ان کے صدقے میں ہمارا ایمان بچ جائے۔ (آمین)
یاد رکھو! میں تو زندہ نہیں رہوں گا مگر تم دیکھو گے کہ شہدائے ختم نبوت کا خون بے
گناہی رنگ لا کر رہے گا۔ جو ”میاں“ ﷺ کا نہیں وہ اس قابل نہیں کہ اسے منہ بھی لگایا
جائے۔

جو نام نہاد مسلمان نبوت کے ان ڈاکوؤں سے حسن سلوک کے قائل ہیں یا ان
سے رواداری پر عامل ہیں وہ حرماں نصیب روز محشر شفیع امت حضور خاتم النبیین ﷺ
کے سامنے کیا منہ لیکر جائیں گے جو ”میاں“ ﷺ کا نہیں وہ اس قابل نہیں کہ اسے منہ
بھی لگایا جائے۔ نبی کریم کے منصب عالیہ پر ڈاکہ ڈالنے والا میلہ کذاب کی طرح
آج بھی واجب القتل ہے۔ ارتداد ایک ایسا جرم ہے جس کی معافی اسلام میں کہیں
نہیں۔ ”مرزا“ اور اس کے ماننے والے دجال، کذاب، مرتد، واجب القتل اور جہنمی
ہیں۔ (بخاری کی باتیں ص: ۳۶)

جانِ ایمان اور روحِ قرآن :

مسئلہ ختم نبوت جانِ ایمان اور روحِ قرآن ہے۔ اگر مسلمان عقیدہ ختم نبوت
سے بال برابر بھی ادھر ادھر ہو جائیں تو پھر نہ محمد عربی ﷺ کا فرمان باقی رہتا ہے۔ اور نہ
خدا تعالیٰ کی وہ تزیہہ و تقدیس باقی رہتی ہے۔ جس پر حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر
حضور ختمی مرتبت تک تمام انبیاء علیہم السلام متفق ہیں۔ مرزائیت کی روح پر اسی جانِ
قرآن اور جانِ اسلام سے مرتد نہ ضرب ہے۔ میں اس کے استیصال کو ہر مسلمان کے
لئے فرض بلکہ افرض جانتا ہوں اور اپنی زندگی کی آخری بازی بھی اس پر لگا دوں گا۔ یہ
پاکستان کے جسم کا سیاسی ناسور ہے اگر حکومت نے اس کا آپریشن نہ کیا تو یہ ناسور

سارے جسم کو تباہ کر کے رہے گا۔ (اقوال بخاری)

بیٹی تم نے میری دکھتی رگ پکڑی ہے :

شاہ جی فرمایا کرتے : میری بیٹی! میرے ظاہری اسباب سے میری حیات کا باعث ہے۔ اللہ بیٹوں کو بھی سلامت رکھے، مگر بیٹی سے مجھے بہت محبت ہے۔ میری بیٹی نے کئی بار مجھے کہا :

”ابا جی ! اب تو اپنے حال پر رحم کریں، آپ کو چین کیوں نہیں آتا، کیا آپ سفر کے قابل ہیں، چلنے پھرنے کی طاقت آپ میں نہیں رہی، کھانا پینا آپ کا نہیں رہا، یہ آپ کا حال ہے، کیا کر رہے ہیں آپ؟“

میں نے کہا : ”بیٹی! تم نے میری دکھتی رگ پکڑی ہے۔ میں تمہیں کس طرح سمجھاؤ، بیٹا! تم بہت خوش ہوگی اگر میں چار پائی پر مروں؟ میں تو چاہتا ہوں کسی کے گلے پڑ کے مروں، تم اس بات پہ راضی نہیں کہ میں باہر نکلوں میدان میں اور یہ کہتا ہوں ”لَا نَبِيَّ بَعْدَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“، لَا رَسُولَ بَعْدَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لَا أُمَّةَ بَعْدَ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ بیٹا! دُعا کرو، عقیدہ ختم نبوت بیان کرتے ہوئے اور کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے موت آجائے۔“ (سیدی والی ص: ۱۸)

مبلغین کو وصیت :

تحفظ ختم نبوت کے تمام مبلغین کو امیر شریعت نے اپنے مکان کی بیٹھک میں بلا کر حسب ذیل وصیت فرمائی۔

(۱) ”عزیزو! اسلام کی تبلیغ کانٹوں کا تاج پہننے کے مترادف ہے، جدھر منہ کرو گے مخالف ہی مخالف نظر آئیں گے۔ حتیٰ کہ ایسے ایسے مقامات سے گزر ہوگا اور مخالفت ہوگی، جہاں تمہارا گمان بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اگر تم اس عزم پر پکے اور پختہ رہے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ (پھر تھوڑا مسکرائے اور فرمایا) احرار بظاہر کسی تحریک میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن جس عزم کو لے کر اٹھے اس پر ڈٹے رہے تو نتیجہ یہ ہے کہ آج برسِ اقتدار آنے والا ہر گروہ احرار کے نام سے لڑتا ہے۔

(۲) وعظ کرنے کے لئے جانے سے پہلے داعی سے کرایہ کبھی وصول نہ کرنا۔ اگر اتنا بھی کرو گے تو منہ کھائے گا، آنکھ شرمائے گی، حق بیان نہ ہوگا۔ فرمایا۔ آمدورفت کا کرایہ گھر سے لیکر چلنا۔ تقریر و بیان کے بعد اگر داعی کچھ خدمت کرے تو اس کے سامنے شمار نہ کرنا۔ اور اگر کچھ بھی نہ دے تو اپنی زبان سے طلب نہ کرنا، بلکہ چپکے سے ہنس مکھ واپس آجانا۔ فرمایا۔ ساری زندگی میرا یہی عمل رہا ہے۔ جب کہیں جانا ہوتا تو تمہاری اماں سے پوچھا کرتا تھا کہ مجھے فلاں جگہ وعظ کہنے جانا ہے کرایہ ہے؟ اگر ہوتا تو آمدورفت کا خرچ گھر سے لے کر چلتا۔

(۳) فرمایا! کچھ بھی خدمت نہ کرنے والا، اگر پھر بھی بلا لے اور دعوت دے دے تو جانے سے انکار نہ کرنا۔ فرمایا! اب اگر چھلی اور پہلی مرتبہ ہدیہ، حق الخدمت وغیرہ نہ مل سکنے کے سبب جانے سے رک جاؤ گے تو للہیت نہ ہوگی بلکہ نفسانیت ہوگی۔ اور داعی کے سامنے شمار کرنے سے روکنے میں یہ حکمت فرمائی۔ ہو سکتا ہے داعی غریب اور مفلس ہونے کے سبب حق الخدمت یا کرایہ بھی پورا نہ دے سکے۔ اس سے خود کو بھی تردد ہوگا اور داعی کے دل میں بھی ہوک اٹھے گی۔ ہائے! میں غریب تھا، نا، کہ کرایہ بھی نہ دے

سکا اور اس سے اس غریب کے دل سے ایک آہ نکلے گی۔ لہذا یہ نصیحت یاد رکھنا کہ غریب کی آہ اور دل دکھانے کے ہر پہلو سے پرہیز کرنا۔ اگر ان باتوں پر عمل کرو گے تو انشاء اللہ کبھی بھوکے نہیں رہو گے۔ اور یہی باتیں دنیا و عقبیٰ کی فلاح و بہبود اور ترقی و سر بلندی کا موجب ثابت ہوگی۔ (حیات امیر شریعت ص ۳۸۷)

رفعتِ عزت و احترام :

ایک دفعہ لاہور انجمن حمایت اسلام کی سہ روزہ کانفرنس کے آخری اجلاس میں شاہ صاحب کی تقریر تھی اور میاں ممتاز دولتاناہ کی صدارت تھی۔ شاہ جی نے ملتان سے تشریف لانا تھا، کسی وجہ سے وقت مقررہ سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے پہنچے۔ مجمع بیتابی سے منتظر تھا۔ بار بار پوچھتے شاہ صاحب ابھی تک کیوں نہیں پہنچے؟ اس لئے اسٹیج سیکرٹری خلیفہ شجاع الدین کو ہر دس منٹ کے بعد اعلان کرنا پڑتا کہ شاہ صاحب ضرور تشریف لائیں گے، آپ اطمینان سے بیٹھیں۔ لیجئے اطلاع پہنچی ہے کہ شاہ صاحب دفتر پہنچ گئے ہیں، اب عنقریب تشریف لے آئیں گے۔ آخر یہ اعلان کیا کہ شاہ صاحب دفتر سے جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ بس اب پہنچے کہ پہنچے، میاں دولتاناہ اگرچہ صدارت کے لئے کب کے آچکے تھے، مگر سوائے منتظمین کے عوام میں سے کسی کو خبر تک نہ تھی، مگر جب شاہ جی کا پتہ چلا کہ وہی دروازہ دفتر سے روانہ ہو چکے ہیں تو تمام پبلک سڑک پر استقبال کے لئے پہنچ گئی۔ جب شاہ جی تشریف لائے تو ہجوم نے والہانہ خیر مقدم کیا اور فلک بوس نعروں سے استقبال کیا۔ شاہ جی اسٹیج پر پہنچے تو جلسہ والوں کی جان میں جان آئی اور انہیں علم ہو گیا کہ دنیا دار کتنی شان و شوکت رکھتا ہو، مگر جو عزت و احترام اللہ والوں کا ہے وہ انہیں کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔

ایک مخالفانہ اشتہار کا جواب :

اتنے میں ایک شخص نے ایک اشتہار جو مرزائیوں کی طرف سے تقسیم ہوا تھا، اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ انجمن حمایت اسلام ایک تعلیمی ادارہ ہے، اس کانفرنس میں بخاری جیسے سیاسی اور خصوصی مذہبی لیڈر کو تقریر کے لئے کیوں بلایا گیا ہے۔ شاہ جی نے جب یہ اشتہار پڑھا تو خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا :

”سب سے پہلے مرزائیوں کے اس اشتہار کا جواب دینا ہے، پھر اشتہار پڑھ کر سنایا۔ فرمایا: جلسہ انجمن حمایت اسلام کا جس کے نام سے ہی حمایت اسلام ظاہر ہے، تقریر بخاری کی صدر میاں ممتاز دولتانا، اسٹیج سیکرٹری خلیفہ شجاع الدین میں پوچھتا ہوں آپ کو کیوں تکلیف ہوئی۔ بلانے والوں نے بلایا، آنے والا آ گیا، آپ کے پیٹ میں مروڑ کیوں اٹھا؟ انجمن حمایت اسلام مسلمانوں کی جماعت ہے۔ خلیفہ شجاع الدین صاحب سے مخاطب ہو کر، کیوں خلیفہ صاحب انجمن حمایت اسلام میں کوئی مرزائی بھی ہے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا، پھر فرمایا تو پھر آ کر انہیں کیوں تکلیف ہوئی، ان کی تسلی یوں نہیں ہوگی، پھر خلیفہ صاحب کو بلایا اور مائیک پر کھڑا کر دیا، فرمایا: آپ اعلان کر دیں کہ ہمارے نزدیک مرزا غلام احمد کافر اور مرتد ہے اور اس کو ماننے والے بھی کافر مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ خلیفہ صاحب نے من و عنان اعلان کر دیا، پھر شاہ جی نے گرج کر فرمایا: کہو مرزائیو! اب تسلی تو ہوگئی ہوگی۔ جلسہ انجمن حمایت اسلام کے صدر اور جلسہ کے اسٹیج سیکرٹری خلیفہ شجاع الدین نے جو اعلان کر دیا ہے، اس کے بعد بھی کوئی کسر باقی ہے۔ اس معاملہ میں کوئی بھی مسلمان مجھ سے جدا نہیں، پھر اصل تقریر شروع فرمائی۔

مجھے اور مرزا محمود کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دو :

ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے کہنے لگے: حق اور باطل کو پرکھنے کے لئے مجھے اور مرزا محمود کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دو۔ بس ایک مہینہ کے لئے اور نمکین پانی کے سوا کھانے پینے کو کچھ نہ دیا جائے۔

چند روز میں ہی ختم نبوت کا اقرار کر کے باہر نکلنے کے لئے منتیں نہ کرے تو میرا نام عطاء اللہ نہیں۔ تقریر کے بعد بیٹھے تھے، میں نے ازراہِ تفسیر کہا شاہ جی! اگر وہ پھر بھی ختم نبوت کا اقرار نہ کرے۔

فرمایا: امین! میں اس کا گلہ دبا کر ٹٹا ہی نہ ختم کر دوں گا، پھر اس کی لاش ہی کوٹھڑی سے باہر نکلے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے کا تسمہ :

تحریک ختم نبوت کے بعد جب قید سے رہا ہو چکے تھے۔ غالباً ۱۹۵۵ء میں فیصل آباد دھوبی گھاٹ کے میدان میں ضعیفی اور علالت کے سبب بیٹھ کر تقریر فرما رہے تھے۔ دورانِ تقریر کسی نے ایک چٹ بھیج دی۔ لکھا ہوا تھا کہ جو لوگ ختم نبوت کی تحریک میں شہید ہو گئے، ان کا ذمہ دار کون ہے؟ شاہ جی نے پڑھا تو جوش میں آ کر کھڑے ہو گئے اور گرج کر فرمایا :

”سنو! ان شہداء کا میں ذمہ دار ہوں، نہیں نہیں آئندہ بھی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کی خاطر شہید ہوں گے، ان کا بھی میں ذمہ دار ہوں، تم بھی گواہ رہو (اور پھر آسمان کی طرف منہ کر کے فرمایا) اے اللہ! تو بھی گواہ رہنا شہداء کا میں خود

ذمہ دار ہوں اور جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا، اگر میں زندہ رہا اور موقع ملا تو پھر بھی ایسا ہوگا۔ اگر کل مسلمان میاں صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتے کے ایک تسمے پر قربان ہو جائیں تو پھر بھی حق ادا نہیں ہوگا۔ ان جملوں سے سامعین تڑپ اُٹھے، لوگ دھاڑیں مار مار روئے لگے اور ختم نبوت زندہ کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ (بخاری کی باتیں ص: ۶۸۲-۶۸۳)

امیر شریعت عزم و ہمت کے پیکر تھے۔ مسئلہ ختم نبوت کے دفاع اور ردِ مرزائیت کے لئے عزیمت کی کلغی لگائے ملک کے طول و عرض میں پہنچے اس مبارک کام کو وہ اپنی در ماندہ قوم کی تمام دیرینہ بیماریوں کا علاج، دنیا میں سر بلندی کا باعث، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا ذریعہ اور آخرت میں سرخروئی کا زینہ سمجھتے تھے۔ یہی ان کا اوڑھنا تھا، اور یہی ان کا بچھونا تھا اور اسی راہ پر چلتے ہوئے اپنے مالک کی رفاقت کے پختہ احساس کے ساتھ انہیں نہ جیل ہتھکڑیوں اور دارورسن کی پرواہ اور نہ اپنے مالک کی پناہ و سہارا ہوتے ہوئے کسی ظالم کے ظلم و ستم اور جبر و تشدد کا خطرہ تھا.....

عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام



باب ہشتم

دعوت و خطابت، قید و بند کی صعوبتیں

جیل کی یادیں اور عزیمت و استقامت کے دلچسپ واقعات

رب ذوالجلال کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت خطابت بھی ہے۔ خطابت اس کا نام ہے کہ آپ بہترین کلام کے ذریعہ سے لوگوں کو متوجہ کریں۔ تمام انبیاء کرام خطیب تھے، حضرت شعیب علیہ السلام تو خطیب الانبیاء اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم استاد الخطباء ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تربیت سے گلشن رسالت سے فیض یاب ہونے والے نفوسِ قدسیہ نے خطابت کے وہ جوہر دکھائے تاریخ جن کی مثال لانے سے قاصر ہے۔

ہمارے اکابر میں سے ایک نام امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا بھی ہے۔ جنہوں نے برصغیر پاک و ہند میں اپنی خطابت کا لوہا منوایا۔ امیر شریعت سے مولانا محمد علی جوہر نے ایک مرتبہ عرض کیا۔ شاہ جی! تم اپنی تقریر میں جب لوگوں کو قورمہ اور پلاؤ مہیا کرتے ہو تو انہیں یہ بھی کہہ دیا کرو کہ محمد علی کی سوکھی روٹی بھی قبول کر لیا

کریں۔ مولانا جوہر نے ایک مرتبہ اپنے اخبار میں لکھا کہ یہ شخص (امیر شریعت) خطیب نہیں ساحر ہے۔ شورش کاشمیری نے فرمایا۔ شاہ جی کے ہاں خطابت کے سوا دوسری تمام خصوصیتیں ثانوی تھیں بلکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ خطابت ہی کی پیداوار تھیں جس طرح ہر بڑے آدمی کی خصوصیت اس کا نام لیتے ہی حافظے کی لوح پر آجاتی ہے۔ مثلاً غالب کا نام لیتے ہی ایک عظیم شاعر کا تصور بندھتا ہے۔ اس طرح شاہ جی کی ذات خطابت سے مختص ہوگئی وہ سراپا خطابت تھے۔ شاہ جی پیدائشی خطیب تھے انہوں نے خطابت کو اختیار نہیں کیا بلکہ خطابت نے انہیں اختیار کیا تھا۔ شورش نے شاہ جی کی خطابت کے بارے میں جو منظوم کلام کہا ہے۔ پڑھتے جائیے اور سردھنتے جائیے۔

خطیب اعظم عرب کا نغمہ عجم کی لے میں سنا رہا ہے
 سر چمن چہچہا رہا ہے سروغا مسکرا رہا ہے
 حدیث سرو و سمن نچھاور، زبان شمشیر اس پہ قربان
 مسیلمہ ایسے جلسازوں کی بیخ و بنیاد ڈھا رہا ہے
 میں اس کے چہرے کی مسکراہٹ سے ایسا محسوس کر رہا ہوں
 کہ جیسے کوثر پہ شام ہوتے کوئی دیا جھللا رہا ہے
 خدا فروشوں کی خانقاہوں پہ ایک بجلی سی کوندتی ہے
 ہوا ہے گوتند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

(امیر شریعت نمبر ص ۸۸)

حضرت امیر شریعتؒ بچپن ہی سے بڑا اچھا قرآن پڑھتے تھے۔ حضرت مولانا

غلام مصطفیٰ قاسمی جو امیر شریعتؒ کے استاد تھے۔ امیر شریعتؒ کی آواز سے اتنے متاثر تھے

کہ اکثر و بیشتر جمعہ شاہ جیؒ سے پڑھوایا کرتے تاکہ انہیں تقریر کے داؤ پیچ سے واقفیت ملتی رہے۔ یہی دن تھے جب شاہ جیؒ فن خطابت کی سیڑھیوں پر قدم رکھ رہے تھے۔

جاننا مرزا لکھتے ہیں :

شاہ جی کے قرآن کریم پڑھنے کا انداز جب عام ہوا تو شہر کے گلی محلوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ انہیں شبینوں پر بلانے لگے۔ گھروں سے نکل کر یہ آواز گلی کوچوں اور پھر بازار تک آن پہنچی..... ع دل سے نکلی در جاناں تک پہنچی

پہلی تقریر :

آخر وقت آیا کہ مسجد کے ارد گرد کے لوگوں نے مولانا غلام مصطفیٰ کو مجبور کیا کہ شاہ جی کو کھلے میدان میں تقریر کی اجازت دیں۔ چنانچہ پہلی تقریر اندرون گلوالی دروازہ بازار کمہاراں میں ہوئی۔ دوسری تقریر کے لئے سید گلاب شاہ نامی شخص جو مولانا غلام مصطفیٰ کے معتقد تھے، شاہ جی کو امرتسر کی نواخی بستی سلطان ونڈ لے گئے۔ اس طرح یہ کلی کھلی، پھول بنا اور اس کی مہک نے ساری فضا کو معطر کر دیا۔

امامت :

نگہت باد بہاری نے چمن بردوش ہو کر لالہ و گل سے سرگوشیاں کیں اور صحن چمن سے بوئے لالہ و گل اڑا کر لے گئی۔ شبنم کے آنسو چینتے رہے۔ نسیم صبح گا ہی سر پیٹ کر رہ گئی۔ گل بوٹوں نے لاکھ حصار کیے مگر بوئے گل اسیر نہ ہو سکی۔ کوچہ جیل خانہ کے عوام اپنی مسجد کے لئے پیہم اصرار کے ساتھ مولانا غلام مصطفیٰ سے شاہ جی کو مانگ کر لے گئے۔ یہ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے۔

ہال بازار کے وسط سے شروع ہو کر کوچہ جیل خانہ رام باغ، پولیس تھانہ کے

سامنے ختم ہوتا تھا۔ دوسری طرف میوہ منڈی کی پشت اس کی ہمسایہ تھی۔ اس طرف رام باغ کا بازار بھی اس کے سامنے تھا۔ اس قدر وسیع آبادی کو مسجد کی تنگ دامنی پر ہمیشہ گلہ رہا۔ لیکن شاہ جی کے خطیب منتخب ہونے پر مسجد کی وسعتیں اور مسدود ہو گئیں۔ یہ زمانہ لاسلکی کا نہیں تھا اور نہ آلہ مبکر الصوت کا رواج تھا لیکن شاہ جی کی آواز دل اور کانوں کو مطمئن کرتی رہی۔ نمازیوں نے مکان کی چھتوں تک کو اپنی ضرورت کے لئے اپنا لیا تھا۔ (حیات امیر شریعت ص ۳۵)

لحٰن داؤدی :

آپ کی تبلیغ کا خاص وصف یہ تھا کہ آپ کتاب اللہ پڑھتے تھے۔ آپ حافظ تھے۔ قاری تھے۔ پھر قدرت نے آپ کو لحن داؤدی عطا فرمایا تھا۔ آپ جب منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بیخود ہو کر قرآن پڑھتے تھے۔ حاضرین پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کے مخالفین بھی آپ سے قرآن سننے کے لئے کشاں کشاں جلسوں میں آتے تھے۔ اور آپ جب اپنے مخصوص انداز میں کتاب اللہ کی تلاوت کرتے تو لوگ تڑپ اٹھتے تھے۔ گاندھی کی بات کہ میں تو صرف شاہ جی کا قرآن سننے آیا تھا۔ آپ نے وقت کی روش اور مبلغین و واعظین کی عام عادت کے خلاف منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر لوگوں کو قرآن سنایا اور سمجھایا۔ اور آپ کی ساری عمر قرآن کی خدمت میں ہی گزر گئی۔

آپ نے تبلیغ دین کو عام پیشہ ور مبلغین کی طرح استحصال زر کا ذریعہ نہ بنایا اگر آپ چاہتے تو آپ تبلیغ کو ”پیشہ“ بنا کر اپنا گھر سونے کا بنا سکتے تھے مگر آپ نے تبلیغ دین کو اس کا صحیح مقام دیا۔ اسے جہاد فی سبیل اللہ سمجھا۔

ایفائے عہد کا اہتمام :

ایک دفعہ ملتان راقم الحروف (امین گیلانی) سے ایفائے عہد کی اہمیت پر فرمایا :
 سیالکوٹ تقریر کرنے کا وعدہ دے چکا تھا کہ چوتڑوں پر ایک بڑا سا پھوڑا نکل آیا، پلستر
 وغیرہ باندھتا رہا، خیال تھا، جلدی پھٹ جائے گا، مگر وہ تاریخ آگئی اور پھوڑا ہنوز اسی
 طرح تھا۔ وہاں سے کچھ کارکن لینے کے لئے آگئے، مگر میرا حال دیکھ کر مایوس ہو گئے،
 اس حال میں کیسے لے جائیں، اس طرف انہیں یہ پریشانی تھی کہ تقریر کا اعلان کیا جا چکا
 ہے، رات کو جلسہ ہے میں نے ان کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے کہا بھائی! اگر کسی
 طرح لٹا کر مجھے سیالکوٹ تم لے چلو تو جیسے ہو تقریر میں کروں گا چنانچہ انہوں نے کار کا
 بندوبست کیا اور مجھے لٹا کر سیالکوٹ لے گئے۔ میں نے کہا: سٹیج پر میز کرسیوں کے
 بجائے چار پائی رکھوا کر اس پر گدا بچھوادو۔ گاؤتکیے رکھ دو، چنانچہ میں نے ایک کروٹ پر
 لیٹ کر تقریر کی۔ دوران تقریر جوش سے کچھ بیان کر رہا تھا کہ اچانک پھوڑا پھٹ گیا،
 پھوڑے پر ہاتھ رکھ کر اسی طرح تقریر کرتا رہا۔ جب تقریر کر چکا تو ساتھیوں سے کہا لو
 بھائی ہماری تقریر ہی ہمارے پھوڑے پر نشتر کا کام دے گئی۔ (بخاری کی باتیں ص: ۹۶)

شاہ جی کو دھمکی :

مولانا لال حسین اختر فرماتے ہیں، تقسیم سے قبل صوبائی الیکشن میں تحصیل
 ڈسکہ سے ایک مرزائی امیدوار بھی تھا۔ اسی اثنا میں چودھری عبدالغنی گھمن نے
 صاحبزادہ فیض الحسن صاحب سے جو اس وقت گوجرانوالہ میں کسی علالت کے سبب
 صاحب فراش تھے ملاقات کی اور کہا ڈپٹی کمشنر نے مجھے بلا کر ہدایت کی ہے کہ تم اپنے

موضع کے تمام ووٹ مرزائی اُمیدوار کو لے کر دینا، اور میں نے ان سے پکا وعدہ کر لیا ہے کہ ان کے حکم کی پوری طرح تعمیل ہوگی۔ لہذا آپ بخاری صاحب کو کہہ دیں کہ وہ ہمارے گاؤں میں مرزائی اُمیدوار کی مخالفت کرنے نہ آئیں۔ نہ وہ جا کر اس کے خلاف ووٹ مانگیں۔ اگر انہوں نے میری بات نہ مانی تو نتائج خطرناک ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک عالم اور سید کے خون سے ہمارے ہاتھ بھرین۔ میرے اس مشورہ کو اگر نہ مانا گیا تو پھر بات صاف ہے۔ دنیا پہلے ایک سید کی شہادت پر آج تک رورہی ہے، پھر اسے بھی روئے گی۔ بہتر یہی ہے کہ وہ میری بات مان لیں اور میرے موضع کا رخ نہ کریں۔

جورات قبر میں آنی ہے باہر نہیں آسکتی :

مولانا فرماتے ہیں صاحبزادہ صاحب نے مجھے بلوا بھیجا اور سارا واقعہ من وعن سنا دیا۔ اور کہا اب سوچ سمجھ لو۔ ساتھیوں سے مشورہ کر کے جیسا مناسب ہو، قدم اٹھائیں۔ مولانا بتاتے ہیں کہ شاہ جی کہیں دورہ پر تھے۔ ہم نے مشورہ کر کے یہی طے کیا کہ ہمیں ان کی دھمکی سے مرعوب نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ مرزائی اُمیدوار کامیاب ہو جائے گا۔ ہم نے گردونواح کے تمام رضا کاروں کو پیغام پہنچا دیا کہ وہ جمعہ اس موضع میں پڑھیں اور باوردی آئیں۔ ادھر ہم نے شاہ جی کو تار دے کر بلایا اور اس موضع میں اعلان کروا دیا کہ یہاں جمعہ مولانا لال حسین اختر پڑھائیں گے اور اس کے بعد شاہ جی کی تقریر ہوگی۔ شاہ جی جب جمعہ کے روز صبح تشریف لے آئے تو میں اور شاہ جی اور کچھ دیگر احباب کار میں بیٹھ کر ڈسکہ کی طرف اس موضع کو روانہ ہو گئے۔ میں نے راستے میں شاہ جی کو سارے حالات سے آگاہ کیا۔ شاہ جی خاموشی سے سنتے

رہے۔ جب میں بات ختم کر چکا تو میں نے پوچھا شاہ جی! کیا خیال ہے ہم نے وہاں جانے کا فیصلہ صحیح کیا یا غلط؟ فرمایا: مولوی صاحب جو رات قبر میں آئی ہے وہ باہر نہیں آسکتی۔

چھوڑو اللہ کے سپرد کرو :

بہر حال ہم جب وہاں پہنچے تو ہمارے سینکڑوں رضا کار باوردی پہنچ چکے تھے اور سارے گاؤں میں گہما گہمی تھی۔ رضا کاروں نے استقبال کیا۔ ہم اترے اور اسٹیج کی طرف چلے۔ وہاں پہنچے تو خاصا مجمع ہمارے انتظار میں تھا۔ رضا کاروں نے چاروں طرف سے جلسہ کو گھیر لیا اور اسٹیج کے گرد بھی بہت سے رضا کار پہرہ دینے لگے۔ جب میں خطبہ کے لئے کھڑا ہوا تو پہلی تین صفیں ساری کی ساری مخالفین کی تھیں۔ سب مسلح تھے، بندوقیں، کلہاڑیاں، ٹوکے ہاتھوں میں لئے بیٹھے تھے۔ اس وقت مجھے معاً خیال آیا کہ ہم سے غلطی ہوگئی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ پہلی صفوں میں رضا کاروں کو بٹھاتے، تاکہ مخالف آسانی سے حملہ آور نہ ہو سکے۔ میں نے آہستہ سے یہ بات شاہ جی کے کان میں کہی۔ شاہ جی نے فرمایا: اب چھوڑو اللہ کے سپرد کرو اور خطبہ دو۔

میں نے ابھی خطبہ کے چند الفاظ کہے تھے کہ چوہدری عبدالغنی پہلی صف کے درمیان سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پکار کر کہا مولوی صاحب! وعظ بیشک کہو، جمعہ کی نماز پڑھاؤ ہم وعظ سنیں گے۔ نماز تمہارے پیچھے پڑھیں گے، مگر یہ یاد رکھو! اگر الیکشن کے متعلق یا ہمارے امیدوار کے خلاف ایک لفظ بھی کہا تو یہ بندوقیں، کلہاڑیاں اور ٹوکے تمہارے سروں اور سینوں پر ہوں گے۔ ہم نے پہلے بتا دیا ہے۔ بعد میں کوئی نہ کہے کہ ہم نے زیادتی کی ہے۔ یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا تو شاہ صاحب نے ایک دم میرا ہاتھ کھینچ کر

مجھے بٹھا دیا اور ایسے جوش اور جلال سے کھڑے ہوئے کہ میں نے نہ کبھی پہلے اور نہ کبھی بعد میں ان کو ایسے جوش اور جلال میں دیکھا۔ شاہ جی نے بغیر کچھ کہے خطبہ مسنونہ شروع کر دیا۔ خطبہ کے بعد چند آیات قرآنی تلاوت فرما کر ان کا ترجمہ کیا۔ پھر ایسے پُر جوش اور والہانہ انداز سے تقریر جاری رکھی کہ کسی کو کچھ ہوش نہ تھا۔ حتیٰ کہ الیکشن کے موضوع پر آگئے اور جانی دشمن بیٹھے سن رہے ہیں۔ تقریر کرتے کرتے شاہ جی نے ایسی بے خودی اور بے ساختگی کے انداز میں گرج کر فرمایا :

وہ دیکھو! ملائکہ ہاتھوں میں قلم لئے اور سامنے رجسٹر رکھے بیٹھے ہیں جو مسلمان اُمیدوار کو ووٹ دے گا، اس کا نام جنتیوں میں لکھیں گے اور جو مرزائی اُمیدوار کو ووٹ دے گا، اس کا نام دوزخیوں میں لکھیں گے، لوگو! تمہیں خدا کی قسم ہے بتاؤ! تم کیا چاہتے ہو؟ جو چاہتا ہے کہ ملائکہ اس کا نام جنتیوں میں لکھیں وہ ہاتھ کھڑا کرے، یکدم تمام مجمع نے ہاتھ کھڑے کر دیئے، جب شاہ جی نے غور سے دیکھا تو پہلی تین صفیں جو مخالفین کی تھیں، ان میں سے کسی نے ہاتھ کھڑا نہیں کیا تھا۔

شاہ جیؒ نے فوراً لکارا: ”عبدالغنی“ ہاتھ اٹھا دے ورنہ مارا جائے

گا، تیرا اور تیرے ساتھیوں کا نام دوزخیوں میں نہ آجائے۔“

شاہ جیؒ نے کچھ ایسے بارعب انداز میں یہ جملے کہے کہ عبدالغنی نے جھٹ اپنا

ہاتھ بلند کر دیا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے باقی ساتھیوں نے بھی ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

پورا پنڈال اللہ اکبر کے نعروں سے گونجنے لگا اور ہم لوگ بہ ہزار خاطر و مدارت وہاں

سے کامیاب واپس آئے۔

سنگ پر سنگ چلاؤ تمہیں ڈر ہے کس کا ؟

شہید گنج تحریک کے ایام میں جالندھر بستی شیخ میں جلسہ ہوا، پہلی تقریر مولانا مظہر علی نے کرنی تھی۔ مگر عوام سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ایک کہرام اور شور و غوغا برپا کر دیا گیا۔ بعضوں نے پتھر برسائے شروع کر دیئے۔ شاہ جی یہ تماشا دیکھ رہے تھے، فوراً آگے تشریف لے آئے۔ مولانا مظہر علی صاحب کو فرمایا: آپ بیٹھیں، شاہ صاحب نے ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی، سر کے بالوں کو جھٹکا دیا، تلواریں بھی گلے سے اتار کر رکھ دی اور بلند آواز سے یہ شعر پڑھا.....

بجرمِ عشق تو ام می کشند غوغایست

تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشا یست

پھر مخالفین کو گرج کر فرمایا: تم بے شک پتھر برسائو، اگر بخاری نام ہے تو قتل ہونا منظور ہے لیکن پیغامِ حق کہہ کے چھوڑوں گا۔ قتل ہونا سیدوں، ہاشمیوں کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ کربلا میں بھی حق کی آواز پر مسلمانوں ہی کے ہاتھوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے شہید ہوئے تھے، میں بھی اسی سید الاولین و آخرین سرورِ کائنات فخرِ موجودات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نواسہ ہوں، حق کہوں گا اور حق کے اظہار سے ہرگز باز نہ رہوں گا۔ تم بے شک پتھر برسائو، شور و شر سے ہرگز باز نہ آؤ.....

سنگ پر سنگ چلاؤ تمہیں ڈر ہے کس کا

سینہ کس کا ہے میری جان جگر کس کا ہے

یہ الفاظ سن کر مجمع پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا، پتھر ہاتھوں سے چھوٹ گئے، شاہ جی نے مسلسل کئی گھنٹے تقریر فرمائی، پھر انہی لوگوں نے شاہ صاحب اور ان کے

ساتھیوں کے لئے آرام و آسائش کا بندوبست کیا۔ نوجوان رضا کار بن گئے، اور سربراہ آوردہ لوگ آ آ کر معافی کی درخواست کرنے لگے۔ (بخاری کی باتیں ص: ۵۳)

سکھوں کو قرآن سنایا :

مولانا عبداللطیف صاحب خطیب جامع مسجد گنبد والی (جہلم) فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کچھ لوگوں نے شاہ جیؒ کو کٹھیالہ سیداں منڈی بہاؤ الدین کے قریب ایک قصبہ ہے، وہاں وعظ کے لئے بلوایا۔ جلسہ سے قبل ہی جلال پور کے پیر فضل شاہ صاحب نے لوگوں کو اُکسایا کہ یہاں وہابی کا وعظ مت ہونے دو۔ بخاری وہابی ہے، وہ آ رہا ہے لوگوں کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالے گا، لہذا کچھ بھی ہو جائے اس کا وعظ نہ ہونے دو۔ لوگ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔ جس تاریخ کو وعظ تھا شاہ صاحبؒ حسب وعدہ منڈی بہاؤ الدین اترے تو اس وقت تک کوئی بھی شخص پریشانی اور خطرہ کے باعث لاری اڈہ پر شاہ جی کو لینے کے لئے نہیں آیا تھا۔ کچھ وقت گذرا تھا کہ چند داعیان گھبرائے ہوئے پہنچے اور عرض کیا کہ شاہ جی! وہاں تو یہ قصہ ہو چکا ہے۔ شدید خطرہ ہے، اس لئے مجبور ہیں جلسہ ملتوی کر دیں۔ شاہ جی نے فرمایا: تم مجھے تانگہ میں بٹھا کر پہلے روانہ کر دو اور خود پیچھے آؤ، تمہارا کوئی ذمہ نہیں۔ اگر وہ وعظ کہنے پر ماریں گے تو میں مار کھاؤں گا۔ شاہ جی تانگہ میں بیٹھے شاہ جی کی جرأت دیکھ کر وہ لوگ بھی اللہ کے بھروسے پر ساتھ چل پڑے۔ جب آگے آگے شاہ صاحب گاؤں پہنچے تو وہاں ایک گروہ فساد کی نیت سے کھڑا تھا، انہیں دیکھ کر شاہ جی نے گرج دار آواز میں کہا السلام علیکم۔ دوسرے طرف ساتھ ہی کچھ سکھ بھی بغرض تماشا کھڑے تھے۔ شاہ جیؒ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: میں قرآن سنانا چاہتا ہوں۔ گوردوارہ میں کچھ دیر کے لئے

جگہ دو گے؟ خدا کی قدرت سکھوں نے خوشی سے منظور کیا اور شاہ صاحب کو ساتھ لے کر گوردوارہ میں چلے گئے۔ پہلے سکھ تماشا سائی تھے۔ اب مسلمان تماشا سائی کی حیثیت سے یہ دیکھنے کہ یہ گوردوارہ میں کیسے قرآن سنائیں گے، وہاں تک چلے گئے۔ شاہ جی نے وہاں قرآن سنایا، سکھ ادب سے سننے لگے، پھر ”نور بھری“ والا قصہ سنایا، جو درج ذیل ہے، شاہ صاحب کے خلوص نے وہ اثر دکھایا کہ اب سب مسلمان نادم تھے، اور آنسو بہا رہے تھے۔ شاہ جی سے اپنی حرکت پر معذرت خواہ ہوئے اور شاہ صاحب کامیاب و کامران واپس لوٹے۔

سُرمہ لگانے آیا ہوں :

نور بھری، نور بھری کی حکایت اس طرح ہے جس کی مثال دے کر شاہ صاحب نے سامعین کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ فرمایا کسی گاؤں میں ایک نور بھری نام کی عورت رہتی تھی، نہایت بد صورت اور کریمہ المنظر، چہرہ چمک زدہ رنگ توے کی طرح کالا، کوئی اس کا رشتہ نہیں مانگتا تھا، وہ پریشان رہتی تھی۔ اس نے ایک نابینا سے تعلق پیدا کر لیا، اور اس سے کہا حافظ جی اگر آپ کی آنکھیں ہوتیں تو مجھے دیکھ کر مجھ پر ضرور عاشق ہو جاتے، میرا چہرہ گلاب کی مانند اور آنکھیں ہرنی کی طرح ہیں۔ غرض اس نے حافظ کو اپنا گرویدہ کر لیا اور ہر طرح سے عیش کرنے لگی، ایک دن اچانک اس نے ایک آواز سنی۔ سرمہ لے لو سرمہ ”اندھوں کو بینا کرنے والا سرمہ“ نور بھری پریشان ہو گئی کہ اگر یہ آواز حافظ جی نے سن لی تو وہ ضرور سرمہ خرید لے گا، اور اگر اس کی بینائی واپس آگئی تو مجھے جوتے مارے گا کہ تو اپنے مصنوعی حسن کی تعریفیں کر کے مجھے لوٹتی رہی۔ وہ بھاگی اور جا کر سرے والے سے کہا کہ حکیم! جی واقعی سرمہ اندھوں کو بینائی دے دیتا

ہے، اس نے کہا کہ آزما کر دیکھ لو، نور بھری خوفزدہ ہو گئی، اپنے عیش کو بچانے کے لئے حکیم سے ساری شیشیاں خرید لیں اور اسے واپس کر دیا، تاکہ نابینا جس کے سر پر وہ عیش کر رہی تھی کہیں بینا نہ ہو جائے۔

شاہ صاحب نے فرمایا: اے قصبے والو! تم سب نابینا ہو، تمہارے پیر اور صاحبزادگان نور بھریاں ہیں، اور میں سرمہ بیچنے والا حکیم، تمہارا پیر مجھے اس لئے یہاں آنے نہیں دیتا تھا کہا اگر تم نے سرمہ لگا لیا، آنکھوں کا نور واپس آ گیا تو ان نور بھریوں کے حسن کا پول کھل جائے گا اور تمہارے سر پر جو عیش کر رہے ہیں، ختم ہو جائے گا۔ آج میں تمہاری آنکھوں میں سرمہ لگانے آیا ہوں تاکہ تمہاری آنکھیں روشن ہو جائیں اور ان کے مکروہ چہرے دیکھ سکو۔ (بخاری کی باتیں ص: ۲۲)

مفتی محمد حسنؒ صدارت کی کرسی پر :

امر تسر میں ایک دفعہ کسی بات پر ہندو مسلم کھنچاؤ پیدا ہو گیا، شاہ جیؒ نے مسلمانوں کا رعب قائم کرنے کے لئے ایک چوک میں جلسہ رکھ دیا۔ مفتی محمد حسن صاحب شاہ جیؒ سے قبل جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ انہیں صدارت کی کرسی پر بٹھا دیا اور تلاوت قرآن پاک اور نظمیں وغیرہ ہو گئیں۔ مفتی صاحب مرحوم نے دیکھا کہ شاہ جی صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے تو خود تقریر فرمانے لگے، تھوڑی دیر گزری تھی کہ شاہ صاحب تشریف لے آئے۔ مفتی صاحب یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ دراصل تقریر تو بخاری صاحب کی ہے، میں تو وقت گزارنے کے لئے کچھ کہہ رہا تھا۔ شاہ جیؒ تشریف لے آئے، اب وہی تقریر فرمائیں گے اور یہ بھی عذر فرمایا کہ میرے پاؤں میں تکلیف ہے اس لئے مجھے جانے کی اجازت دے دی جائے۔

جب تقریر کا طلسم ٹوٹا :

(مفتی صاحب عرصہ سے پاؤں کی تکلیف میں مبتلا تھے۔ بالآخر ایک پاؤں کٹوانا پڑا تھا) چنانچہ ایک رضا کار تانگہ لینے چلا گیا۔ شاہ جی کی تقریر شروع ہو گئی، اس وقت چونکہ ”ہندو مسلم“ مناقشت کا سوال تھا، تقریر ابتدا ہی میں سحر آفریں انداز اختیار کر گئی۔ آدھ پون گھنٹہ گزر گیا مگر حضرت مفتی صاحب سراپا توجہ بن کر شاہ جی کی تقریر میں کھوئے ہوئے تھے، انہیں اپنی تکلیف کا احساس تک نہ رہا۔ تقریر میں اس وقت ساہ جی حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کا قصہ نہایت بارعب اور دل فریب انداز میں بیان فرما رہے تھے اور جذبات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جب شاہ جی نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرؓ کا دامن کھینچ کر فرمایا: ”عمرؓ! کس نیت سے آیا ہے اور حضرت عمرؓ نے فوراً کلمہ شہادت پڑھ کر اظہار ایمان کر دیا، جس پر دار ارقم“ میں بیٹھے ہوئے تمام صحابہ نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ اس موقع پر مجمع نے بھی نعرہ تکبیر اللہ اکبر بلند کیا۔ نعرہ کے بعد ایک دم بازار کی ایک طرف سے شورا اٹھا اور گھوڑے کے بے تحاشا بھاگنے کی آواز آئی، کچھ لوگ تحقیق کے لئے بھاگے تو پتہ چلا جس رضا کار کو تانگہ لینے کے لئے بھیجا تھا وہ تانگہ لے کر آیا اور تقریر میں ایسا کھو گیا کہ مفتی صاحب کو اطلاع دینا یاد نہ رہا اور حضرت مفتی صاحب بھی ایسے بھولے کہ کسی سے پوچھا تک نہیں کہ ابھی تک تانگہ کیوں نہیں آیا؟ تانگے والا بیس پچیس منٹ انتظار کرنے کے بعد خود آیا کہ اسٹیج والوں سے پوچھوں کہ سواری کیوں نہیں آئی مگر خود تانگے والا بھی تقریر کے سحر میں آ گیا، اب تانگہ تنہا کھڑا تھا، اچانک فلک شکاف نعرہ اللہ اکبر سے گھوڑا ڈر کر بھاگا تو یہ طلسم ٹوٹا اور مفتی صاحب تشریف لے گئے۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۰۲)

ہندو لڑکیوں سے خطاب :

تقسیم سے بہت قبل لاہور میں ایک پبلک جلسہ میں شاہ جی تقریر کے لئے تشریف لائے، تو اس وقت کچھ ہندو لڑکیاں مائیک کے آگے آزادی کا کوئی گیت سنا رہی تھیں (جلسہ غالباً کانگریس کی طرف سے تھا) جب وہ گیت گا کر بیٹھ گئیں اور شاہ جی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو سب سے پہلے ان بچیوں کو مخاطب کر کے فرمایا :

بیٹیو ! تمہارا یوں مردوں کے سامنے آزادی کے گیت سنانے سے آزادی نہیں مل سکتی، اگر آزادی کے لئے کچھ کام کرنے کی تڑپ ہے تو کام میں بتاتا ہوں۔ جاؤ جا کر مسلمان بہنوں کو یقین دلاؤ کہ تم ان کو اچھوت نہیں سمجھتی ہو۔ اپنے عمل سے انہیں دکھا دو کہ تم انہیں اپنی بہنیں سمجھتی ہو، اگر تم نے ایسا کیا تو وہ بھی تمہارے ساتھ مل کر عورتوں میں آزادی کی روح بیدار کریں گی۔ اور اپنے مردوں سے کہیں گی کہ جاؤ تم راہ آزادی میں جان کی بازی تک لگا دو، اگر جہاد آزادی میں شہید بھی ہو گئے تو ہم تمہارا ماتم نہیں کریں گی بلکہ فخر سے سراٹھا کر کہیں گی کہ دیکھ لو میرا خاوند اور میرا بھائی اور میرا بیٹا مردانہ وار وطن کی عزت اور انسانیت کی سر بلندی کے لئے جان کو قربان کر گیا۔ یوں گیت گانے سے آزادی کی منزل قریب نہیں ہو سکتی، پھر دوران تقریر فرمایا: حدنگاہ تک انسان ہی انسان بیٹھے ہیں، کیا اچھا موقع ہے، اللہ میاں یہ نہ کہیں کہ بخاری تجھے ایسے ایسے مواقع فراہم ہوئے تو نے میرا پیغام کیوں نہ پہنچایا۔ میں آج تمہیں قرآن سناتا ہوں۔ سنو اللہ میاں کیا فرماتے ہیں، پھر قرآن پاک کی تلاوت فرمائی اور ہندو مسلمان، سکھ سب کو سمجھایا کہ انسان پر اللہ کے کیا کیا حقوق ہیں۔ اللہ وحدہ لا شریک ہے اور اس کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں۔ شاہ جی دو گھنٹے تک قرآن سناتے رہے،

اس کا ترجمہ اور تفسیر کرتے رہے۔ بلا تین مذہب و ملت مجمع کا مجمع لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ جب جلسہ ختم ہوا تو واپسی پر میرے آگے تین سکھ جا رہے تھے، ان میں سے ایک بولا، یار ٹھہر جاؤ، مجھے کہیں پیشاب سے فارغ ہو لینے دو۔ مولوی صاحب اگرچہ ہمیں ہی بھگو بھگو کرتے لگا رہے تھے، مگر ایسا مزہ آ رہا تھا کہ میں پیشاب کرنے کے لئے نہیں اٹھا کہ نہ جانے بعد میں کیا کچھ کہہ جائیں اور میں نہ سن سکوں۔ (بخاری کی باتیں ص: ۴۲)

بندے کا اللہ سے تعلق :

فرمایا: اللہ اور بندے میں کم از کم اتنا تعلق تو ہونا چاہئے، جیسے کسی ماں کا بیٹا معمول کے مطابق گھر نہ آئے تو وہ بے چین ہو کر اسی کی راہ دیکھتی، کبھی کھڑکی پر، کبھی دروازے پر، جب زیادہ بے چینی بڑھتی ہے تو اس کے ملنے والے دوستوں سے پوچھتی ہے، وے پتر تو میرا عبدالرحمان تے نہیں دیکھیا، یعنی اے بیٹے! تم نے میرے عبدالرحمن کو تو نہیں دیکھا، وہ ساتھ ساتھ گھر کے کام کاج بھی کرتی جاتی ہے، دوسرے بچوں کو کھانا بھی دیتی ہے، ان کی دوسری ضرورتوں کو بھی پورا کرتی ہے مگر سب سے اوپر ہی اوپر اصل اس کا جی عبدالرحمن کی طرف ہوتا ہے، اسی طرح جس طرح یہ عورت سارے کام کرتی جاتی ہے، مگر اصل میں اس کا دھیان، اس کا دل، اس کی توجہ عبدالرحمن کی طرف ہوتی ہے، کم از کم بندے کا تعلق اتنا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونا چاہئے کہ وہ سب دنیا کے کام کرتا رہے، مگر اس کی توجہ، دھیان دل اپنے اللہ کی طرف ہو، شاہ جی توحید یوں سمجھا رہے تھے کہ دل سینوں میں توحید کے نور سے روشن ہو رہے تھے اور میری تو یہ کیفیت ہو رہی تھی، جی چاہتا تھا اللہ میاں کا دامن تھام کر چل چل کر روؤں۔

(بخاری کی باتیں ص: ۱۳۱)

مولانا سید احمد شاہ صاحب بخاری فرماتے ہیں، میں اس تقریر میں موجود تھا، جس میں سورۃ صافات کی پارہ نمبر ۲۳ کی آیت ”فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ“ کا ترجمہ یوں فرمایا، پس تم نے تمام مخلوقات کے مالک کے لئے کیا رکھا ہے، شاہ صاحب نے فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم کو راہِ راست پر لانے کے واسطے کوشش فرماتے ہوئے کہتے ہیں، تم لوگوں نے عبادت اور بندگی جب غیر اللہ کے لئے روارکھی ہے تو اللہ تعالیٰ کے لئے باقی کیا رہ گیا۔ عبادت ہی تو خدا تعالیٰ کے لئے مخصوص تھی، تو جب وہ بھی من دون اللہ کے واسطے ہوگی تو بتاؤ اب رب العالمین کے سامنے کون سا تحفہ پیش کر کے اس کی خوشنودی کا تمغہ حاصل کرو گے۔

تقریر کے ایمان افروز اقتباسات :

تصویر کا ایک رُخ تو یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی میں کمزوریاں اور عیوب تھے، اس کے نقوش میں توازن نہ تھا۔ قد و قامت میں تناسب نہ تھا، اخلاق کا جنازہ تھا، کریکٹر کی موت تھی، سچ کبھی نہ بولتا، معاملات کا درست نہ تھا۔ بات کا پکانہ تھا، بزول اور ٹوڈی تھا۔ تقریر و تحریر ایسی ہے کہ پڑھ کر متلی ہونے لگتی ہے لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر اس میں کوئی کمزوری نہ بھی ہوتی۔ وہ مجسمہ حسن و جمال قویٰ میں تناسب ہوتا، چھاتی ۴۵ انچ، کمر ایسی کہ سی آئی ڈی کو پتہ نہ چلتا، بہادر بھی ہوتا، مرد میدان ہوتا، کریکٹر کا آفتاب ہوتا، خاندان کا مہتاب ہوتا، شاعر ہوتا، فردوسی وقت ابوالفضل اس کا پانی بھرتا، خادم اس کی چاکری کرتا، غالب اس کا وظیفہ خوار ہوتا، انگریزی کا شکسپئر ہوتا اور اردو کا ابوالکلام ہوتا، پھر نبوت کا دعویٰ کرتا تو کیا ہم اسے نبی مان لیتے؟

میں تو کہتا ہوں کہ خواجہ غریب نواز، شیخ سید عبدالقادر، حیلانی، امام ابوحنیفہ،

امام بخاریؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، ابن تیمیہؒ، غزالیؒ یا حسن بصریؒ بھی نبوت کا دعویٰ کرتے تو کیا ہم انہیں نبی مان لیتے؟ علیؑ دعویٰ کرتا کہ جسے تلوار حق نے دی اور بیٹی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی، سیدنا ابو بکر صدیقؓ، سیدنا عمر فاروق اعظمؓ اور سیدنا عثمانؓ بھی دعویٰ کرتے تو کیا بخاری انہیں نبی مان لیتا، ہرگز نہیں، میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کائنات میں کوئی انسان ایسا نہیں جو تخت نبوت پر سج سکے اور تاج امامت و رسالت جس کے سر پر ناز کرے، وہ ایک ہی ہے جس کے دم قدم سے کائنات میں نبوت سرفراز ہوئی۔

(بخاری کی باتیں ص: ۱۵۶)

ہم کسی اپنے کام کو تو نہیں جا رہے :

ایک دفعہ تقریر میں فرمایا :

جس نے میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بار دیکھ لیا، پھر وہ انہی کا ہو گیا۔ سینے پر پتھر رکھے گئے، رسی گلے میں ڈال کر گھسیٹا گیا، آگ میں ڈالے گئے، سولی پر لٹکائے گئے، آزمائش کی ہر بھٹی میں ڈالے گئے، مگر ثابت قدم نکلے، پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ میرے نبی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، پھر لکار کر فرمایا: یہ خیال نہ گزرے کہ ابو جہل نے بھی تو دیکھا تھا، ہاں ہاں کبھی یوں نہ سوچ لینا ابو جہل نے اپنے بھتیجے کو دیکھا ہوگا، اس کی نگاہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں پڑی۔

مولانا عبدالرحمن صاحب میانوی فرماتے ہیں، ایک دفعہ شاہ صاحب اور میں مظفر گڑھ کے ایک قصہ میں وعظ کے لئے جا رہے تھے، راستہ کچا، کڑا کے کی دھوپ پڑ رہی تھی، شدید گرمی کا موسم تھا، دو ڈیڑھ میل آگے پیدل جانا تھا، تھوڑی دور چلے کہ مجھے بہت گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے کہا شاہ جی یہ دھوپ اور گرمی کا عالم اور ابھی کتنی دور

پہنچنا ہے، کیا بنے گا؟ یہ سن کر شاہ جی نے مجھے تو کچھ جواب نہ دیا، ایک دم آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا: ”ہم کسی اپنے کام کو تو نہیں جارہے۔“

چند منٹوں میں دیکھتا ہوں کہ جہاں دو درورتک بادل کا نشان نظر نہیں آتا تھا، وہاں پر طرف بادل گھر گھر کر آنے لگے، نہ وہ گرمی رہی، نہ وہ دھوپ، مزے کا موسم ہو گیا۔ (بخاری کی باتیں ص: ۳۰)

بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی :

صوفی شیر محمد صاحب جھنگ صدر، ریاست پٹیالہ راج گڑھ کے مہاجر ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ :

ایک دفعہ میرے بھائی کے بے حد اصرار پر شاہ جی راج گڑھ اس شرط کے ساتھ تشریف لائے کہ تقریر نہیں کروں گا صرف آرام کروں گا، مگر عوام و خواص کی سہیم التجا سے مجبور ہو کر تیسرے روز شاہ جی تقریر کرنے پر راضی ہو گئے۔ رات کو جلسہ کا اعلان کر دیا گیا، ہزار ہا لوگ جوق در جوق جلسہ گاہ میں پہنچ گئے، اتفاق یہ ہوا کہ ساتھ ہی آسمان پر بادل بھی چھانے لگے، ادھر تقریر کا آغاز ہوا، ادھر بوند باندی شروع ہو گئی، کچھ لوگ کھسکنے پر آمادہ نظر آئے تو شاہ جی نے طنزیہ لہجہ میں فرمایا: کیوں جی کہاں تو تقریر کے لئے اتنے تقاضے تھے، اور اب دو ہی بوندوں میں سارا عشق بہہ گیا۔ خبردار اب کسی کو جانے کی اجازت نہیں، ہاں صرف میری مائیں بہنیں جاسکتی ہیں، وہ جا کر گھر کے سامان اور بچوں کو سنبھالیں، یہ کہنا تھا کہ جلسہ پر سکون چھا گیا، تقریر جاری ہوئی بارش تھم گئی، بادل تو آسمان پر تھے مگر اس احتیاط سے کہ زمین پر کوئی پانی کا قطرہ نہ گرے۔ اب تقریر کا دھارا پورے زور پر تھا، شاہ جی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلے

دعوت اسلام کا نقشہ اپنے خاص انداز سے کھینچ رہے تھے۔ موقع کی مناسبت سے حالی مرحوم کا یہ شعر مترنم لہجہ میں پڑھا.....

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی

عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

ابھی اتنا ہی کہا تھا، وہ بجلی کا کڑکا تھا تو اس زور سے بجلی کا کڑکا ہوا کہ مجمع

کانپ اٹھا۔ صوفی صاحب کہتے ہیں اگرچہ اسے اتفاق پر محمول کیا جاسکتا ہے، مگر لوگوں

کو اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے بجلی نے شاہ جی کے اشارے پر تڑپ کر، مجمع کو حیرت

زدہ کر دیا ہو۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۳۶)

یہ آگینے بڑے نازک ہیں :

تقسیم ہند سے کئی برس پہلے کی بات ہے کہ میں حضرت شاہ صاحب کے

ساتھ ہزارہ کے علاقہ میں گیا، یاد نہیں رہا کون سا قصبہ تھا؟ تقریر دوپہر کے وقت تھی،

شاہ صاحب تقریر کے لئے اٹھے، خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا :

حضرات ! آپ کو معلوم ہے کہ ہم اپنے ملک سے فرنگی کو نکالنے کی فکر میں

ہیں اور میری اکثر تقریریں اسی موضوع پر ہوتی ہیں۔ میری تقریر کا پہلا حصہ ایسے

موضوع پر ہوگا کہ آپ حضرات کے وہم و گمان میں بھی وہ موضوع نہیں ہوگا، ہاں تقریر

کا دوسرا حصہ فرنگی سامراج کی جڑوں کو اس سرزمین سے اکھاڑ دینے کے لئے ہی ہوگا،

تو سنئے ! آج صبح منہ اندھیرے جب میں قضائے حاجت کے لئے باہر گیا، تو اچانک

نگاہ پڑی کہ کچھ بیبیاں ایک جگہ اسی ضرورت کے لئے بیٹھی ہیں، میں فوراً پلٹا اور ان سے

دور ایک گوشہ تلاش کر کے فارغ ہوا، مگر اس واقعہ سے میرے دل میں سخت چوٹ لگی،

اسی لئے پہلا موضوع اسی واقعہ کو بنانا پڑا، پھر بڑے درد مندانہ لہجہ میں پکار کر فرمایا: اے پٹھانو! تم تو بڑی غیرت مند قوم کہلاتے ہو، کیا تم اپنی بیٹیوں کے لئے اپنے گھر میں گز بھر جگہ نہیں مختص کر سکتے کہ وہ بیچاریاں تحفظ کے ساتھ اس ضرورتِ انسانی سے فارغ ہو سکیں، میں کہتا ہوں تمہیں اگر ان کا یہ گندسروں پر اٹھا کر کہیں باہر پھینکنا پڑے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ گھروں سے باہر جا کر یہ ضرورت پوری کریں، پھر عورت کا احترام اس کی شرم و حیا، اس کے تحفظ ناموس پر وہ کچھ عقلی اور نقلی دلائل دیئے کہ لوگ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ کئی بزرگوں نے اٹھا اٹھ کر پگڑی گلے میں ڈال کر ہاتھ جوڑے اور فریاد کی شاہ جی! بس کیجئے آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے اس تقریر کا ایک حصہ ابھی تک یاد ہے، فرمایا ہائے وہ بیٹیاں! تم جس کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دے دو، وہ اُف کئے بغیر تمہاری پگڑیوں اور داڑھیوں کی لاج رکھنے کے لئے ان کے ساتھ ہو لیتی ہیں، سسرال میں جب میسکے کی یاد آتی ہے، چھپ چھپ کر رو لیتی ہیں، کبھی دھوئیں کے بہانے آنسو بہا کر جی ہلکا کر لیا، آٹا گوندھتے ہوئے جو آنسو بہتے ہیں وہ آٹے میں جذب ہو جاتے ہیں، کوئی نہیں جانتا کہ ان روٹیوں میں اس بیٹی کے آنسو بھی شامل ہیں، غیر تمندو! ان کی قدر کرو، یہ آگینے بڑے نازک ہیں۔ (ماخوذ از بخاری کی باتیں ص: ۱۳۰)

نرالا بیان، نرالی شان :

روزنامہ زمیندار جولائی ۱۹۲ء میں ایک مضمون نگار لکھتا ہے :

وقت چلا جاتا ہے واقعات نقش بہ حجر رہتے ہیں۔ ایک دفعہ سیالکوٹ میں حضرت امیر شریعتؒ کی تقریر کا انتظام ایک مندر کے طویل و عریض احاطہ میں کیا گیا۔ سیالکوٹ کے لوگ آپ کی تقریر کے عاشق تھے۔ اتنا مجمع ہوا کہ سیالکوٹ کی تاریخ نے

شاید ہی دیکھا ہو۔ خصوصاً ہندو اتنی زیادہ تعداد میں آپ کی تقریر سننے آئے تھے کہ مسلمانوں سے بھی ان کی تعداد زیادہ تھی۔ آپ کی تقریر کا موضوع تھا۔ ”ہندوستان کی آزادی“ انقلاب زندہ باد کے فلک بوس نعروں میں آپ کی تقریر شروع ہوئی۔ غیر ملکی حکومت کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے گفتگو کا ریلا اس موڑ پر پہنچا کہ ہمارے حصول مقصد کے راستے میں مضبوط روڑا کونسا ہے۔

منجملہ اسباب و علل بیان کرتے ہوئے ہندوؤں کی تنگ نظری کا ذکر آیا۔ مجمع میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور تقریر سیا لکوٹ کے ایک عظیم الشان مندر میں ہو رہی تھی۔ ہندوؤں کا ایک جم غفیر تقریر سننے کے لئے موجود تھا۔ حضرت نے ہندوؤں کی تنگ نظری پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ آپ نے نہ صرف ہندوؤں کے مذموم اخلاق کو تفصیل سے بیان کیا بلکہ ان کی مذہبی تنگ نظری کو بھی بیان کر کے اسلام اور ہندو ازم کا مقابلہ کیا۔ ہندو مجمع مارے شرم کے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اور مسلمان فلک شگاف نعروں لگا رہے تھے۔ ”اسلام زندہ باد“ ”امیر شریعت زندہ باد“ شاہ جی نے اس مجمع میں جو کچھ فرمایا وہ ان کی شان خصوصی تھی۔ ورنہ اگر کوئی دوسرا مسلمان لیڈر اس قسم کا تبصرہ کرتا تو تنگ نظر ہندو قتل و مقاتلہ کے لئے تیار ہو جاتے۔ لیکن وہاں ایک شان ہی نرالی تھی۔ شاہ جی کی زبان فیض ترجمان سے جو کچھ نکل رہا تھا۔ ہندو زبان حال سے اس کی تصدیق کر رہے تھے۔ اور اندر ہی اندر شرمسار ہو رہے تھے۔ تقریر کے بعد جو غالباً ڈیڑھ دو بجے ختم ہوئی تھی ہندو ہاتھ جوڑ کر آپ کی تعظیم کر رہے تھے۔ اور ملال کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ ورنہ کیا کہ مجال ایسے مجمع میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو ہندو ازم کے خلاف کوئی مسلمان لیڈر ایک لفظ تک کہہ سکے۔

ہندو بھی قرآن سنتے :

ایک دفعہ حضرت امیر شریعت بٹالہ، گودا سپور تشریف لائے
 ہندوؤں کا ایک مجمع حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور خواہش ظاہر کی کہ حضرت
 آج ہمیں کچھ سنائیں۔ آپ نے فرمایا کیا سناؤں میں تو قرآن جانتا ہوں۔ انہوں نے
 نے عرض کیا ہمیں بھی قرآن سنائیے۔ ہم نہایت شوق سے قرآن سنیں گے۔ آپ نے
 کلمہ توحید لا الہ الا اللہ کی تشریح و توضیح اس انداز سے بیان کی کہ ہندو مجمع عیش عیش کے
 اٹھا۔ آپ کی تقریر تقریر یاد و گھنٹے جاری رہی۔ اور وہ اس حد تک متاثر ہوئے کہ اس کے
 بعد جب کبھی قادیان سے بٹالہ آتے تو لوگ خواہش کرتے کہ کبھی حضرت امیر شریعت
 پھر بٹالہ تشریف لائیں اور ہمیں وہی لا الہ الا اللہ کی تشریح و توضیح سنائیں۔ حضرت کے
 طفیل وہ لوگ ساتھیوں کی بھی بہت تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت
 شاہ جی مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

خطابت کا سحر :

شاہ جی اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ اللہ نے انہیں لحن
 داؤدی عطا کیا تھا۔ قرآن پڑھتے تو سامعین دم بخود رہ جاتے اور تقریر کرتے تو گویا
 گلستان کھل جاتا۔ خاص انداز اور نرم سے بر محل شعر پڑھتے تو سامعین پھڑک جاتے۔
 بسا اوقات ایسا ہوتا کہ عشاء کی نماز کے بعد تقریر شروع ہوتی اور صبح کی اذان تک جاری
 رہتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مجمع زنجیروں سے بندھا بیٹھا ہے اکتا کر اٹھ بیٹھنا تو دور
 کی بات ہے کوئی اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سامعین پر مقرر نے
 جادو کر دیا ہے۔ اکثر ایسا ہوا مخالفین یہ ارادہ لے کر ان کے جلسوں میں آتے کہ آج

رور گڑ بڑ کریں گے مگر شاہ جی کی خطابت کا سحر انہیں دنیا و مافیہا سے ایسا بے خبر کرتا کہ کسی مسئلے پر ہاتھ اٹھانے کو کہتے تو یہ مخالفین بھی بے اختیار ہاتھ اٹھا دیتے۔ شاہ جی اس طلسم کاری کے بارے میں خان غلام محمد خاں لوند خوڑ کی روایت بڑی دلچسپ ہے ان کا کہنا ہے میں نے نہ تو شاہ جی کو دیکھا تھا نہ ان کا معتقد تھا میرا سیاسی مسلک بھی ان سے مختلف تھا۔ ایک دفعہ عشاء کے وقت دلی دروازے کے باہر سے گزرا تو شاہ جی تریہ کر رہے تھے میں بڑے ضروری کام کے سلسلے میں جا رہا تھا مگر اس خیال سے رک گیا کہ جس مقرر کی دھوم ہے اسے پانچ منٹ سن لینا چاہیے۔ میری عادت یہ ہے کہ میں اسے میں ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتا۔ خود اپنے جلسے میں بھی گھوم پھر کر دیکھتا اور سنتا ہوں۔ پانچ منٹ ان کی تقریر سنتا رہا پھر سوچا تھوڑی دیر اور سن لوں تقریر کا سحر تھا کہ کھڑے کھڑے بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے ساری رات تقریر سنتا رہا۔ بسے حواس گم ہوئے کہ اپنا کام ہی بھول گیا۔ یہاں تک کہ صبح کی اذان بلند ہوئی۔ شاہ جی نے تقریر کے خاتمے کا اعلان کیا تو خیال آیا کہ اوہو ساری رات ختم ہو گئی۔ تب پتہ چلا کہ شخص تقریر نہیں کرتا جادو کرتا ہے۔

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

سینڈھی گال سمجھ گدھی ہا :

شاہ جی ہر سال جون اور جولائی کے تقے ہوئے موسم میں جب کہ یہاں (ڈیرہ غازی خان) کا کسان اور مزدور پیشہ طبقہ فصل کی کٹائی اور بٹائی سے فارغ ہوتا تھا، اس ضلع میں تشریف لے جاتے۔ شہری آبادیوں سے دور آباد کاروں کی بستیوں میں

دوپہر کے وقت ان کی زبان میں خطاب کرتے۔ دس دس اور بیس بیس کوس سے آئے ہوئے دیہاتی شاہ جی کی باتیں سنتے۔ گھنٹوں خطاب کرنے کے بعد شاہ جی ان سے سوال کرتے۔ ”مینڈھی کائی گال سمجھ گدھی ہا“۔ (میری کوئی بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے) اگر جلسے میں ایک دیہاتی نے بھی کہہ دیا ”سائیں کو“ (یعنی کوئی نہیں) تو شاہ جی پھر اس ایک دیہاتی کو سمجھانے کے لئے سارے مجمع سے اسی طرح گھنٹوں خطاب کرتے۔ جب تک پورا مجمع بات سمجھ نہ لیتا تقریر ختم نہ کرتے۔

تیس برس دعوت کا ایک ہی انداز :

اس طرح زندگی کے تیس برس مسلسل ڈیرہ غازی خان کے عوام کو مختلف اوقات میں خطاب کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمہن داروں نے کتے اور سوروں کی پرورش سے توبہ کر لی۔ اس علاقہ کے وڈیروں سے روپیہ لے کر غریب مسلمان لڑکیوں کو ہندو ساہوکاروں کے چنگل سے نجات دلائی۔ شہری اور دیہاتی مسلمان کو مجبور کیا کہ شریعت کی رو سے اپنی جائیداد میں لڑکیوں کو بھی حصہ دیں۔ قانون تو تبدیل نہ ہو سکا لیکن ڈیرہ غازی خان اور ضلع مظفر گڑھ کے اکثر لوگوں نے شریعت کی اس قانون کی پیروی شروع کر دی۔ شاہ جی جن دنوں اس علاقے کا دورہ کرتے، تو گرمی کی شدت سے ان کے تمام جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آتیں۔ اس کے باوجود دروازہ ایسی بے آب و گیاہ بستیوں میں جاتے جہاں کے لوگ پانی کی قلت کی وجہ سے مجبور ہو کر جوہڑ کا پانی پیتے اور کھانے کے لئے انہیں پیاز، اچار یا مسور کی دال میسر تھی۔ جن گھروں میں گوشت یا دوسری بہتر خوراک میسر آسکتی تھی، شاہ جی نے ان گھرانوں سے یہ کہہ کر ہمیشہ اجتناب کیا۔

”میں جن لوگوں کو سمجھانے آیا ہوں، اگر ان کے ساتھ گھل مل نہ جاؤں تو ان

پر میری بات کا اثر نہیں ہو سکتا۔“

حالانکہ یہ ضلع پیر پرستی میں پنجاب کے تمام اضلاع پر سبقت رکھتا ہے اور شاہ جی چاہتے تو یہاں کی غربت اور عوام کی سادگی سے پورا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ علاقے کے تمَن دار انہیں سونے کے برابر وزن کرتے لیکن وہ دیہاتیوں کے ساتھ کھاتے پیتے اور انہی کے گھروں میں ٹھہرتے، جہاں ایک طرف ڈھور ڈنگر بندھے ہوتے اور تمام کمرہ گوبر کی بدبو سے اٹا ہوتا مگر شاہ جی کی پیشانی پر کبھی شکن نہ پڑتی۔ تیس برس اسی جدوجہد میں گزرے جس نے اسلام اور انسانیت کے حق میں بہتر نتائج پیدا کیے۔

پہلی سیاسی تقریر :

دسمبر ۱۹۱۹ء میں ہندوستان کی تینوں بڑی جماعتوں نیشنل کانگریس مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس نے امرتسر میں سالانہ جلسے منعقد کیے۔ اسی پلیٹ فارم پر مولانا شوکت علی کی صدارت میں عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی پہلی معرکہ الآرا سیاسی تقریر کی اس تقریر کی اثر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ تحریک خلافت کے لئے دس لاکھ روپے کی خطیر رقم جمع ہو گئی مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار میں ان کی بے حد تعریف فرمائی۔

ابوالکلام آزاد کی حمایت میں تقریر :

امرتسر سے باہر پہلی مرتبہ فروری ۱۹۲۱ء میں کلکتہ میں تشریف لے گئے جہاں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ وہاں مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز کردہ ترک موالات کی تائید میں ایک پر شکوہ تقریر کی جس سے ان کی خطابت کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ صف اول کے رہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔

چھ ماہ قید بامشقت :

۱۲۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو رہا ہو کر گھر آئے تو وطن کا نقشہ بگڑا ہوا پایا۔ ہندو مسلم اتحاد کا دور لد چکا تھا۔ دونوں قوموں کے درمیان مناقشت اور افتراق کے جراثیم پھیل چکے تھے اور اور انگریزوں کے شہ پر سوامی شردھانند نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی تحریک شروع کر دی تھی۔ شاہ جی نے ایک طرف جہاں شدھی کے زہر کو دور کرنے اور مسلمانوں کا ایمان محفوظ کرنے کی سعی کی وہاں دوسری جانب انگریزی سازشوں کے تار و پود بکھیرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ زچ ہو کر انہیں جنوری ۱۹۳۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ شاہ جی نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا اور مقدمے کی کارروائی میں کوئی حصہ نہ لیا۔ عدالت نے چھ ماہ قید بامشقت یا پانچ سو روپے جرمانے کی سزا دی۔

جرمانے کی رقم عقیدت مندوں نے جمع کرادی شاہ جی رہا ہو گئے مگر جرمانے کی ادائیگی پر سخت خفا تھے۔ انہیں گلہ تھا کہ لوگوں نے اپنی حلال کمائی فرنگی خزانے میں کیوں دی۔؟

اس مقدمے سے فارغ ہو کر شاہ جی نے خطابت کی ساری صلاحیتیں شدھی کے ازالے کے لئے صرف کر دیں اور ہزاروں مسلمانوں کو کفر کی تاریکیوں میں غرق ہونے سے بچالیا۔

آؤ اپنی زندگی کا ثبوت دیں :

گروہ (آریہ سماج) نے سرور کائنات ﷺ کی توہین کرنے کا فیصلہ پختہ کر لیا۔ اس سلسلے میں وہ ایسی ایسی تحریریں سامنے لائے کہ مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے۔ غلامی کا جواء ان کے گردنوں پر کوہ ہمالیہ سے زیادہ بوجھل معلوم ہونے لگا۔ غم اور غصے

کے ملے جلے جذبات سے وہ ہندوؤں کا مقابلہ کرتے رہے۔ آخر انہی دنوں شاہ جی نے عصمتِ انبیاء کے تحفظ کا فیصلہ کیا۔ درویش اپنی گودڑی سنبھال کر بے سرو سامانی کے عالم میں نکل کھڑا ہوا۔ قانونِ افرنگ اور دولتِ ہند اس کے ارادوں میں نہ تو کانٹے بکھیر سکی اور نہ ہی ان کے قدموں کی رفتار مدہم ہو سکی۔

”مسلمانو! میں تمہاری سوئی ہوئی غیرت کو جھنجھوڑنے آیا ہوں۔ آج کفار نے توہینِ پیغمبرؐ کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انہیں شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسلمان مرچکا ہے۔ آؤ اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔ عزیز نوجوانو! تمہارے دامن کے سارے داغ صاف ہونے کا وقت آپہنچا ہے۔ گنبدِ خضرا کے مکین تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ اُن کی آبرو خطرے میں ہے۔ اُن کی عزت پر کتے بھونک رہے ہیں۔ اگر قیامت کے دن محمد ﷺ کی شفاعت کے طالب ہو تو پھر نبی کی توہین کرنے والی زبان نہ رہے یا سننے والے کان نہ رہیں۔“

ان خیالات کو شاہ جی نے برصغیر کے مسلمانوں میں بیان کیا۔ وہ شب و روز دیوانوں کی طرح تقریریں کرتے۔ گاؤں، قصبات، شہر اور بستیوں کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے منجمد خون میں حرارت پیدا ہوئی۔ بس پھر کیا تھا؟ شیر کی طرح بچرا ہوا مسلمان گستاخِ ہندوؤں کی تلاش کرنے لگا۔ نگاہیں جنت کی تلاش میں موت سے ہمکنار ہونے کو بے قرار نظر آنے لگیں۔ دلوں میں شوقِ شہادت کی لذت محسوس ہونے لگی۔ خرد مسکراتی رہی مگر عشقِ منزل کی جانب رواں دواں رہا۔ اس طرح شاہ جی نے مسلمان نوجوانوں کو ابھار کر ایسے مقام پر لا کھڑا کیا کہ اس کے آگے دو ہی راستے تھے، یا تو ہندوستان میں داعیِ اسلام ﷺ کی عزت ہمیشہ کے لئے

تا بود ہو جائے یا پھر غیر مسلموں کو آئندہ جرات نہ ہو کہ وہ حضور ﷺ کی ذات گرامی پر زبان طعن دراز کریں۔ (روزنامہ زمیندار جولائی ۱۹۴۷ء)

”امہات“ کی ناموس پر قربان ہو جاؤ :

حضرت مولانا مجاہد الحسنی صاحب لکھتے ہیں:

جب ہندو راج پال نے نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا۔ تو ۷ جولائی ۱۹۵۱ء کو ایک احتجاجی جلسے سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے خطاب کیا۔ فرمایا :
آج مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید (تقریر میں یہ دونوں صاحب موجود تھے) کے دروازے پر ام المومنین حضرت عائشہؓ تشریف لائیں اور فرمایا۔ ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایک بدنام زمانہ ہندو گستاخ نے سید الکونینؐ کی عزت و ناموس پر حملہ کیا ہے۔

ارے وہ دیکھو تو ام المومنین حضرت عائشہؓ کہیں سامنے دروازے پر تو نہیں کھڑی ہیں۔ (پورا مجمع دروازے کے جانب دیکھنے لگا) بس پھر کیا تھا جلسہ گاہ میں کہرام مچ گیا۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ دیکھو دیکھو سبز گنبد میں حضور ﷺ تڑپ رہے ہیں حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ پکارتی ہیں امہات المومنین تم سے اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ان کے ناموس پر قربان ہو جاؤ۔ سچے بیٹے ماں کی عزت و ناموس کے لئے کٹ مرا کرتے ہیں۔ غازی علم الدین شہید شاہ جی کی اسی تقریر سے متاثر ہو کر اٹھا تھا اور راجپال کو قتل کر کے حیات جاودانی حاصل کر گیا۔

(خطاب امیر شریعت ص ۷۳)

میں بڑے بڑے مقررروں نے دادِ سخن حاصل کی۔ شاہ جی سب سے آخر میں بولنے اٹھے تو بولنے کے لئے بظاہر کوئی نکتہ باقی نہ رہا تھا لیکن غالب کے اس شعر کو اس کیفیت سے پڑھا کہ خود پنڈت موتی لال جھوم گئے.....

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا

نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

پنڈت جی پکاراٹھے: شاہ جی آپ تو ہندوستان کے دل کی آواز ہیں۔

(سوانح و افکار ص ۲۱۰)

خطابت کی کرامت :

شاہ جی کی خطابت کی کئی مثالیں ہیں لیکن ڈیرہ غازی خان کی یہ مثال اس لئے قابل ذکر ہے کہ وہاں اگر خطابت کی کرامت نمائی نہ ہوتی تو قتل و غارت کا بازار خوب گرم ہوتا۔

مجلس احرار اسلام کے زیر اہتمام ڈیرہ غازی خان میں ایک عظیم الشان اجتماع منعقد ہوا، اجتماع سے چند روز قبل وہاں کے بعض مقتدر اور بااثر زمینداروں نے شاہ جی کے خلاف خوب خوب پروپیگنڈہ کیا ان دنوں مزارات کے قبوں کا مسئلہ زوروں پر تھا۔ علاقہ کے باشندوں کو شاہ جی کے خلاف خوب بھڑکا دیا گیا کہ آپ قبروں پر قبے تعمیر کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ شاہ جی حسب پروگرام اجتماع میں شرکت کے لئے تشریف لائے تو جلسہ گاہ کا رنگ بگڑا ہوا تھا۔ سامعین کی اکثریت خراج پیش کرنے کی بجائے لاثمیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھی۔

شاہ جی اسٹیج پر رونق افروز ہوئے اور تلاوت کے بعد خطاب شروع کیا تو مجمع

مجسٹریٹ: آپ کو علم ہے کہ ایسی تقریر کی سزا کیا ہوتی ہے؟

شاہ صاحب: ہاں مجھے علم ہے کہ اس کی سزا کیا ہے!

اگر میری تقریر جو ڈائری نویس کی جانب سے آپ کے پاس آئی اس دفعہ کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے تو مجھے اس تقریر کا اعتراف ہے لیکن اگر یہ تقریر ان تقاضوں کو پورا نہیں کرتی تو بامعنی بات کہی ہے جو اس دفعہ کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

ہائے مشکل تھی جو آساں ہوتے ہوتے رہ گئی :

اس مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے جب مجسٹریٹ نے آپ کو تین سال قید بامشقت کی سزا کا حکم سنایا آپ میاں والی جیل میں محبوس ہو گئے۔ آپ جیل میں اکثر مولانا جوہر کا یہ شعر ترمیم کے ساتھ پڑھا کرتے

دار کے حق دار کو قید سے سالہ ملے

ہائے مشکل تھی جو آساں ہوتے ہوتے رہ گئی

(حیات امیر شریعت ص: ۷۱)

تحریک مدح صحابہؓ :

جاناب مرزار لکھتے ہیں : پنجاب اور یوپی کا دورہ کرتے ہوئے لکھنؤ (احاطہ شوکت علی) میں تقریر کے دوران کسی نے امیر شریعتؒ سے صحابہ کرامؓ کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے پر بلند آواز سے پکارا :

”شاہ صاحب! یہاں صحابہ کرام کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کہنا جرم ہے۔“

یہ فقرہ سنتے ہی امیر شریعت نے مجمع سے دوبارہ تصدیق کی.... اور معا بعد طبیعت میں یکا یک تیزی آگئی، اور صحابہ کرام کا بار بار نام لیا، اور ہر نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہا۔

حالانکہ امیر شریعت چار روز لکھنؤ ٹھہرے، لیکن قانون اور حکومت دونوں خاموش رہے۔

امر تسر واپس پہنچ کر جماعت سے صلاح و مشورے کے بعد ۲۶ اگست ۱۹۳۵ء کو دوبارہ لکھنؤ گئے اور چوک فرنگی محل میں تقریر کے دوران کہا:

”مجھے افسوس ہے کہ انگریزوں نے لکھنؤ میں ایک ایسا قانون جاری کر رکھا ہے، جس کی رو سے منقبت صحابہؓ کرنا اور کرانا جرم ہے۔ حضرت ابو بکر و عمر، عثمان و علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف کرنا قابل سزا جرم ہے اور یہ سزا دو سال قید تک ہے۔ غضب خدا کا اسی ہزار اہل سنت و الجماعت کی آبادی اور وہ اس قانون کو حکومت سے نہیں بدلواتی۔ چند ماہ ہوئے ہمارے بھائی غازی منے خاں نے یہاں مدح صحابہؓ پڑھی تھی جس کی پاداش میں ان پر مقدمہ چل رہا ہے۔ میں حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اس قانون کو فوراً منسوخ کر دے۔ یہ مداخلت فی الدین ہے۔ حکومت نے خود مذہب کی آزادی کا اعلان کر رکھا ہے۔ گالیاں بکنا تو جرم ہو سکتا ہے، مگر کسی کی تعریف کرنا کیونکر جرم قرار دیا جاسکتا ہے۔ آج حکومت نے قمار بازی، شراب نوشی اور عصمت فروشی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ لیکن خلفائے راشدینؓ کی تعریف پر پابندی عائد ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنی پوزیشن پر غور کرے۔

میں شیعہ حضرات سے خطاب نہیں کر رہا، بلکہ میرا روئے سخن حکومت کی

طرف ہے، شاید کل کو کچھ اور سمجھ لیا جائے۔ اس لئے کان کھول کر سن لو، میں تمام یوں، پی

﴿ ۲۱۹ ﴾ -----
 منت سماجت پر وقت دے دیا۔ اس کے بعد احرار و رنگ کمیٹی کا اجلاس ان ہی تواریخ میں مقرر ہو گیا۔ اب شاہ جی کو امرتسر سے سمہ سٹہ، اور سمہ سٹہ سے چارمیل کے فاصلہ پر دریا کے کنارے تقریر کے لئے پہنچنا تھا۔ اور پھر لاہور واپس جا کر اجلاس میں شریک ہونا تھا۔ ایک طرف ایفائے عہد اور دوسری طرف احساس فرض۔ رفقائے کرام نے سمہ سٹہ کے پروگرام کی منسوخی کا مشورہ دیا۔ لیکن اس مردمومن نے دو جھگوں کی اس بستی میں پہنچ کر اپنے وعدے کو نبھایا اور اجلاس کے اختتام سے قبل لاہور پہنچ کر دو روزہ بحث میں الجھے ہوئے مسائل کو بھی چٹکی بجاتے میں حل کیا۔

تدبر اور وفاداری :

رفیق امیر شریعت مرزا محمد حسن چغتائی فرماتے ہیں :

کھروڑ پکا سے سات میل کے فاصلہ پر بیلہ واہگہ کے مضافاتی دیہات میں احرار رضا کاروں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ ان کے اصرار پر دو روزہ کانفرنس کی منظوری مرکز سے حاصل کی گئی۔ علاقہ کے زمینداران اگرچہ رضا کاروں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف تھے۔ اور انہوں نے کبھی تعاون نہیں تھا۔ لیکن اب کانفرنس کے انعقاد اور پھر شاہ جی کی تشریف آوری کی خبر سے وہ تعاون کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور پیش کش کی کہ مقررین حضرات کی رہائش اور مہمانوں کے خوردنوش کا انتظام ان کے ذمہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس موقع پر شاہ جی کے علاوہ مولانا قاضی احسان احمد، مولانا عبد الرحمن میانوی، اور دیگر مقررین شریک کانفرنس تھے۔ پہلے اجلاس کی ابتدائی کارروائی کے بعد پروگرام کے مطابق قاضی صاحب کی تقریر کا آغاز ہوا۔ اجتماع حاضری کے لحاظ سے عدیم النظر تھا اور علاقہ کے باوردی مسلح رضا کار قریباً یک صد کی تعداد میں ڈیوٹی پر

اور پوتوں والا ہوں اور اس میں میری کوئی خوبی نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں متقی اور پارسا تھا یا ہوں بلکہ سیدھی سادی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے باپ دادا کی عزت کا پاس تھا اور ہے۔ مجھے تو ان کی پگڑی کی لاج رکھنی تھی تا کہ یہ نہ کہا جائے کہ خاندان سادات بخارا کا لڑکا سید نور الدین کا پوتا اور حافظ سید ضیاء الدین کا بیٹا ایسا ویسا نکلا اور اس کے بدلہ میں نیکوں کا یہ گھرانہ بدنام ہو۔ باقی اللہ کا خوف تو بڑی بات ہے۔ اور خوش قسمت ہے وہ جسے یہ چیز حاصل ہو، سوا الحمد للہ کہ اس بارہ میں انگلی سے غیر محرم کو چھونے اور نگاہ تک غلط نہ ہونے کی بھی قسم کھا سکتا ہوں۔

کل پھیل کا درخت ان شاء اللہ یہاں نہیں ہوگا :

شاہ جی جب اول بہاولپور گھلوال (تحصیل احمد پور شرقیہ) میں تشریف فرما ہوئے۔ تو جلسہ کا انتظام ایک ایسے میدان میں کیا گیا۔ جہاں ایک پرانے پھیل کے درخت کا وسیع و عریض سایہ جلسہ گاہ کے لئے موزوں تھا۔ شاہ جی نے وہاں تقریر شروع کرنے سے قبل فرمایا کہ مجھے اس جگہ ریچھوں، کتوں کی بدبو آرہی ہے۔ اس لئے میں اس جگہ وعظ نہ کروں گا۔ منتظمین اور دیگر معتبران علاقہ نے بتایا کہ اس بات سے ہمیں انکار نہیں کہ یہاں ریچھ اور کتے لڑائے جاتے ہیں۔ لیکن ہماری مجبوری ہے کہ اس جگہ کوئی موزوں میدان موجود نہیں۔ جہاں سایہ کا انتظام ہو۔ اور مجمع کے لئے کافی گنجائش ہو۔ وہ شخص جو ریچھ کتوں کی لڑائی کا دھندا کرتا تھا۔ وہ بھی مجمع سے نکل کر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور توبہ کر کے یقین دہانی کرائی کہ آئندہ وہ اس مذموم فعل کا اعادہ نہ کرے گا۔ پھر بھی شاہ جی نے خوشی سے نہیں بلکہ طوعاً و کرہاً تقریر کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تقریر تین چار گھنٹوں تک جاری رہی۔ اور جب اختتام کو پہنچی تو شاہ جی نے

قیام گاہ کی طرف روانہ ہوتے ہوئے لوگوں کو بتایا کہ ”یہ پیپل کا درخت ان شاء اللہ کل یہاں نہ ہوگا“ شاہ جی کی اس بات کو لوگوں نے استعجاب سے سنا لیکن دوسرے روز خدا کا کرنا کیا ہوا کہ صبح ہی صبح دریا میں سیلاب آیا۔ جس سے یہ بستی بھی محفوظ نہ رہی اور پیپل کے درخت کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ جڑوں سمیت نکل باہر آ پڑا۔ اور اس کا نام و نشان تک نہ رہا۔

اس واقعہ کو سن کر ملک پیر بخش خان گھلوذیلدار شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے۔ اور اس طرح سے ملک صاحب اور ان کے خاندان کا دائمی تعلق شاہ جی سے استوار ہو گیا۔ بلکہ علاقہ کے ولی اللہ حافظ کریم بخش کی بدولت شاہ جی کی ڈاڑی میں تقریب میلاد النبیؐ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بہاولپور گھلوال کے لئے مختص ہو گئی۔

حکومت کا منصوبہ بنا کام بنایا :

ایک دفعہ حکومت وقت نے حضرت شاہ جی کی تقریر پر پابندی عائد کی تو شاہ جی نے بڑی حکمت اور جرأت سے حکومت کا منصوبہ بنا کام بنایا۔ نیلے رنگ کا تہہ بند، نیم آستین کی واسکٹ، سر پر موٹے کھدر کی سفید پگڑی اور ہاتھوں سے خالی..... پنجاب پولیس امیر شریعت کو مندرجہ ذیل لباس میں دیکھنے کی عادی تھی..... سر پر کپڑے کی گول ٹوپی، نیم آستین کا لمبا کرتہ، گھٹنوں سے اونچا پاجامہ اور ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا۔

اجنبی لباس میں امیر شریعت نہ تو پولیس سے پہچانے گئے اور نہ ہی سفر میں کسی دوسرے مسافر سے۔ جہلم کے اسٹیشن پر اترتے وقت ضرورت پڑی تو ہمراہی نے امیر شریعت کو تلاش کے لئے پنڈت کرپارام کہہ کر مسلسل پکارا۔ شاہ جی نے اپنے

ساتھی سے کہہ دیا تھا، تم گاڑی میں میرے ساتھ نہ بیٹھنا، اگر مجھے آواز دینے کی ضرورت ہو تو شاہ جی کے بجائے ”پنڈت کرپارام برہم چاری“ کہہ کر آواز دینا۔ ہندی میں پنڈت کے معنی اونچی ذات کے ہیں، اور مسلمانوں کے ہاں سید سردار کے معنی میں مستعمل ہے۔ ”کرپا“ ہندی میں عطا کرنے کو کہتے ہیں اور ”رام“ اللہ کے ہم معنی استعمال ہوتا ہے۔ ہندی میں برہم چاری مجرد کو کہتے ہیں۔ امیر شریعتؒ نے بخاری کا وزن برابر رکھنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا۔ اس طرح پنڈت کرپارام برہم چاری سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ہم معنی بن گیا۔ یوں امیر شریعتؒ نے اپنے بلند مقاصد کی ادائیگی اور پولیس کی گرفت سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے نام کا ہندی ترجمہ کر لیا۔ مگر امیر شریعتؒ اسے ریلوے حدود سے دور جا کر ملے.....

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام

ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میرپور جہلم سے نو میل دور دریائے جہلم کے اس پار آبادی کا نام ہے، یہ کشمیر کے ان باشندوں پر مشتمل ہے جن کے اکثر افراد پہلی جنگ عظیم میں بھرتی ہو کر استعماری فوج کے دوش بدوش لڑ چکے تھے۔ تحریک کشمیر کے دنوں میں بھی اس بستی کے عوام نے اپنی آزادی کے لئے مجلس احرار کے تحت بڑی قربانی کی تھی۔ پولیس کے انتظامات امرتسر سے جہلم تک مکمل ہو چکے تھے لیکن مجرم محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنی منزل کے سامنے کھڑا تھا۔

میری آمد کی اطلاع نہ کرنا :

میرپور کے سامنے سے گزرتے ہوئے دریائے جہلم کی چیخ و پکار سے پتھروں

کے دل دھڑک رہے تھے۔ ناخدا کشتیوں کے پتوار پھیلائے موجوں سے برسری پیکار تھے کہ امیر شریعت نے پتن پر قدم رکھا۔ پولیس ہر مسافر کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے امیر شریعت نے پتن سے دریا کو عبور کرنا مناسب نہ سمجھ کر دو میل اوپر جا کر دریائے جہلم کو پار کیا اور پھر کئی میل پیدل سفر کے بعد میرپور میں داخل ہو گئے۔ ہمراہی کو متنبہ کیا کہ تم جاؤ لیکن میری آمد کی اطلاع نہ کرنا۔ میں خود ہی جلسہ میں پہنچ جاؤں گا۔

امیر شریعتؒ عوام سے خطاب کریں گے :

انجمن کے سالانہ اجلاس کا آخری دن تھا۔ ریاستی حکام مطمئن تھے۔ برطانوی پولیس اپنے کارنامے پر خوش تھی کہ عطاء اللہ شاہ بخاری ریاست میں داخل نہیں ہو سکا۔ منتظمین نے اس خوف سے کہ انجمن کی بدنامی نہ ہو اور رات کے اجلاس میں لوگوں کی حاضری کم نہ ہو شہر میں منادی کرادی کہ رات آخری اجلاس میں امیر شریعت عوام سے خطاب کریں گے۔ اجلاس شروع ہوا تو صدر جلسہ نے قوم سے معذرت کی۔

”ہمیں افسوس ہے کہ امیر شریعت ریاستی اور برطانوی قانون کی

پابندیوں کے باعث تشریف نہ لائے.....!“

ابھی یہ فقرہ ادھورا تھا کہ امیر شریعتؒ نے جلسے کے ایک کونے سے آواز دی۔ ”آپ غلط کہتے ہیں“۔ یہ فقرہ کہتے ہوئے اور مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج کی جانب بڑھتے گئے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کون دیہاتی ہے کہ صدر استقبالیہ کی بات کاٹ رہا ہے۔ اب امیر شریعتؒ اسٹیج پر تھے اور بھاری بھر کم کھدر کی پگڑی اتار کر عوام

کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت مجمع کا حال دیکھنے والا تھا۔ آخر امیر شریعتؒ نے صبح چار بجے تک تقریر کی۔

امیر شریعتؒ کے میرپور پہنچنے کے نتیجے میں پنجاب پولیس اور ریاستی حکام کے کئی آفیسر معطل ہوئے اور انہی دنوں میرپور کے اکثر دیہاتوں میں بغاوت پھیل گئی جس کے نتیجے میں کئی سرکاری عمارات کو نذر آتش کیا گیا۔

پانچویں مصلے کے تم مالک ہو :

حضرت امیر شریعتؒ اصلاح احوال کے طور پر بعض اوقات نہایت اہم مسائل لطائف کی صورت میں بیان فرماتے جو سامعین کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ عبرت و موعظت کا باعث بنتے۔

ایک مرتبہ راولپنڈی میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

”ایک مسجد میں ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ وہ گردن پر ہاتھ باندھ کر نماز

پڑھ رہا ہے۔ جب فارغ ہوا تو میں نے کہا آفرین : چار مصلے ائمہ فقہا نے سنبھال

رکھے ہیں لیکن پانچویں مصلے کے تم مالک ہو۔ اس نے کہا شاہ صاحب کیا کروں مجبور

ہوں اگر ہاتھ پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھوں تو لوگ بدعتی سنی کہتے ہیں۔ اور اگر کھول دیتا

ہوں تو ”رافضی“ کی پھبتی کس دیتے ہیں۔ اور اگر سینے پر ہاتھ رکھتا ہوں تو ”نجدی

وہابی“ کہہ کر مسجد سے نکال دیتے ہیں۔ اس لئے تنگ آ کر میں نے گردن پر ہاتھ

باندھنا شروع کر دیئے تاکہ کسی کو ناراض ہونے کا موقع نہ ملے۔“

اس لطیفہ میں مسلمانوں کے فرقہ وارانہ نزاع اور فروعی اختلاف کو دور کرنے

کی کس قدر اعلیٰ اور احسن طریق پر کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی مساوات کا نمونہ :

ایک مرتبہ گفتگو کرتے ہوئے شاہ جی نے فرمایا :

”میں ایک گاؤں میں چار پائی پر بیٹھا ہوا تھا، بعض لوگ مجھے ملنے کے لئے آئے لیکن وہ میرے پاس بیٹھنے کے بجائے دور الگ زمین پر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا بھئی! مجھ سے کیوں ڈرتے ہو، میرے پاس آ کر بیٹھو۔ وہ کہنے لگے کہ آپ تو سید ٹھہرے ہم آپ کے پاس کس طرح بیٹھ سکتے ہیں۔ میں نے کہا (نعوذ باللہ) سید اتنی ہی ناپاک جنس ہے کہ تم اس کے قریب آنے سے ڈرتے ہو۔“

اس قسم کی باتیں حضرت امیر شریعتؒ کی محافل کو کشت زعفران بنا دیتی تھیں۔ ان باتوں میں دراصل عبرت و موعظت کے نکتے پوشیدہ ہوتے۔ اور اصلاح احوال کے طور پر حضرت شاہ جی مسلمانوں کو ان کی خامیوں پر متوجہ کرتے رہتے تھے۔ ان باتوں میں ایک سبق بھی ہوتا اور طنز بھی۔ حضرت شاہ جی نے حق بات کے اظہار میں کبھی لیت و لعل اور مصلحت سے کام نہیں لیا، بلکہ وہ مردِ درویش ہر محفل اور ہر حال میں اپنے دل کی بات کہہ دیا کرتے تھے.....

ع خدارحمت کند ایس عاشقان پاک طینت را (حیات امیر شریعتؒ ص: ۱۵۵)

نادرہ روزگار شخصیت :

شورش کاشمیری رقمطراز ہیں :

یوں تو سرزمین ہند نے کئی شعلہ بیان اور آتش نوا خطیب پیدا کئے ہیں۔ مگر زبان سے لوچ، اسلوب بیان کی دلکشی، فکر و خیال کی وسعت اور پختگی، ظرافت کی

شائستگی، حاضر جوابی کی شوخی اور استدلال کی سحر کاری میں جو مقام امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو نصیب ہوا اس میں وہ منفرد اور یگانہ روزگار دکھائی دیتے ہیں۔

شاہ جی کے سحرِ خطابت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ بارہا آپ نے سامعین سے خطاب کرتے کرتے رات گزار دی اور جب طلوع فجر کے وقت مؤذن کی آواز کانوں میں پڑی تو سراپا حیرت بن کر پوچھا صبح ہو گئی ابھی تو میں تمہیدی کلمات ہی عرض کر رہا تھا۔

لوگو! صبح ہو گئی اور مؤذن پکار پکار کہہ رہا ہے اے نیند کے ماتو، ہوش میں آؤ۔ میں نے بھی اپنی پوری زندگی تمہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے میں صرف کر دی۔ لیکن تم بیدار نہ ہوئے، مجھے تو کبھی کبھی یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے قبرستان میں اذان دے رہا ہوں۔ راقم الحروف ایک دفعہ ملتان میں حضرت شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت مرغیوں کے لئے روٹی کے ٹکڑے بنا رہے تھے۔ میں نے ازراہ تفسن عرض کیا شاہ جی آپ کس کام میں لگ گئے۔

فرمانے لگے بیٹا! کیا بتاؤں قوم کو زندگی بھر آواز دی، اسے پکارا، حتیٰ کہ میرے بال سفید ہو گئے لیکن اس کے دل کی سیاہی دور نہ ہوئی۔ آخر تھک ہار گیا اور انسانوں سے منہ موڑ کر اب خدا کی دوسری مخلوق کی طرف ملتفت ہوا ہوں۔ یہ مخلوق ایسی با وفا ہے کہ میری ادنیٰ پکار پر دیوانہ وار آتی ہے اتنے میں شاہ جیؒ نے مرغیوں کو آ، آ، آ کہہ کر بلانا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام مرغیاں شاہ جی کے ارد گرد جمع ہو گئیں، مجمع دیکھ کر فرمانے لگے :

”کیوں بیٹا! ہے نا، اطاعت و فرمانبرداری کی مثال۔“

انتہائی خطرناک پستیاں :

فرمایا۔ لگاتار چالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا۔ پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے، غاروں سے ہم کلام ہوتا تو جھوم اٹھتے، چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں، سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لئے طوفان بکنار ہو جاتے، درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں، صرصر سے گویا ہوتا تو وہ صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں شگاف پڑ جاتے۔ جنگل لہرانے لگتے، صحرا سرسبز ہو جاتے۔ افسوس میں نے ان لوگوں میں معروفات کا بیج بویا جن کی زمینیں ہمیشہ کے لئے بنجر ہو چکی تھیں، جن کے ضمیر قتل ہو چکے تھے، جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط تھا، جن کی پستیاں انتہائی خطرناک تھیں جو برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔

قید و بند :

حق کہنے اور سچ بولنے کا راستہ بالاخر جیل جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ شاہ جی خود فرمایا کرتے تھے۔ زندگی کیا ہے؟ تین چوتھائی ریل میں کٹ گئی ایک چوتھائی جیل میں۔ شاہ جی کی کل مدت قید آٹھ اور نو سال کے لگ بھگ ہے۔ امیر شریعت فرمایا کرتے میں نے تقریر کی لوگوں نے کہا واہ شاہ جی واہ، میں قید ہو گیا لوگوں نے کہا آہ شاہ جی آہ۔ اور واہ اور آہ میں ہم ہو گئے تباہ۔

قید و بند کی صعوبتیں، مشقتیں اور پریشانیاں شاہ جی کو اپنے مشن سے نہ ہٹا سکیں۔ شاہ جی ان کیفیات کے حامل تھے.....

جذبے کو جنوں تو ہونے دو تم خیر مناؤ زنداں کی
یہ راہ حق کے دیوانے پابندی منزل کیا جانیں
جس سمت قدم اٹھ جاتے ہیں خود منزل آگے آتی ہے
یہ راز کچھ ایسا راز نہیں آسودہ منزل کیا جانیں

(سوانح و افکار ص: ۷۷)

معافی کی درخواست کے ہزار ٹکڑے کر دیے :

جانبا زمرزا لکھتے ہیں :

شاہ جی کو لاہور سنٹرل جیل میں آئے ہوئے دو ہفتے ہوئے تھے کہ اچانک
ایک دن انہیں جیل کے دفتر میں بلوا کر ان کے سامنے انگریزی میں لکھی ہوئی درخواست
پیش کی جس میں درج تھا کہ اگر اس دفعہ حکومت مجھے معاف کر دے تو میں یقین دلاتا
ہوں کہ آئندہ میری کوئی حرکت ایسی نہیں ہوگی جس سے حکومت کو کسی قسم کی شکایت پیدا
ہو۔ اس درخواست کے نیچے کسی کا نام درج نہیں تھا اور نہ تحقیق پر کسی کا نام مل سکا۔ شاہ
جی نے اس درخواست کا ترجمہ سن کر اسے سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ سے لیا اور ہزار ٹکڑے
کر کے اپنے پاؤں تلے روند اور تین دفعہ اس پر تھوکا پھر غصے کی حالت میں واپس چلے
گئے۔ (حیات امیر شریعت ص ۷۴)

جیل خانے کی محدود دنیا میں :

جیل خانے کی محدود دنیا میں بھی حضرت امیر شریعت اپنی انجمن آپ تھے۔
عبادت الہی جیل خانے میں ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا چنانچہ نماز فجر سے فارغ ہو کر
قرآن حکیم کی تلاوت کرتے یا درود و وظائف اور ذکر الہی میں منہمک رہتے۔ تہجد کے

وقت جب کبھی آپ اللہ کا ذکر بالجہر کرتے یا دوسرے اوقات میں تلاوت قرآن مجید کرتے تو خود ہی وجد میں آجاتے اور اپنا روایتی لب ولہجہ اختیار کرتے تو سکوت زنداں میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ ریاضت سے فراغت پاتے تو داستان پارینہ کے ورق کے ورق الٹنے لگتے۔ اسی طرح ایک دن جیل کے باورچی فتح دین کا ذکر آگیا۔ اس باورچی نے اگرچہ کھانا پکانے میں مہارت حاصل کر لی تھی، لیکن مولانا ابوالحسنات جنہیں امیر شریعت ”ہرفن مولا“ کہا کرتے تھے باورچی کی ایک نہ چلنے دیتے اور ہر روز نئی ہدایت جاری فرمادیتے تھے۔

خانساماں کانفرنس :

اس موقع پر امیر شریعت نے مختلف باورچیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ :
 ”میں نے ایک بار انگریزوں کے خلاف خانساماؤں کی تحریک عدم تعاون بھی چلائی تھی۔ مجھے جہاں کہیں سے اطلاع ملتی کہ اس انگریز افسر کے ہاں کوئی مسلمان ملازم خانساماں کی خدمات سرانجام دے رہا ہے تو میں اسے عدم تعاون پر آمادہ کرتا۔ چنانچہ اس سلسلے میں امرتسر میں ایک خانساماں کانفرنس بھی منعقد کی جس کے اچھے اثرات ظاہر ہوئے۔“

”تحریک خلافت کے دنوں امرتسر میں، میں نے زنانہ بازاری کے خلاف مہم چلائی تھی، جس کے نتیجے میں ”اس بازاری“ اکثر عورتوں نے شادی کر لی، اور کچھ نے گناہ کے کاروبار سے تائب ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح سے گڑہ رام باغ جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں، گندگی سے پاک ہو گیا۔“

(حیات امیر شریعت ص: ۷۷)

کبھی کبھار صحت اجازت دیتی اور موڈ میں ہوتے تو گراونڈ میں والی بال یا کوئی دوسری in door game کھیلنے چلے جاتے۔ بہر طور موسم باد بہاری سے بے نیاز ہو کر خزاں کے یہ دن بھی بہار کی طرح کٹتے رہے۔

تربیت گاہ :

شورش کاشمیری رقم طراز ہیں :

جیل خانے میں قیدی کی نفسیات عجیب و غریب ہوتی ہیں، جہاں تک ان کی معنوی خصوصیت کا تعلق ہے وہ تو ہر قیدی کے باب میں یکساں ہے لیکن مختلف طبائع مختلف اثرات اخذ کرتی ہیں۔

ہندوستان کی سیاسی تحریکوں میں اجتماعی قید و بند نے بہت سے لوگوں میں ادب و سیاست اور فکر و نظر کی وسعتیں پیدا کیں، ہر شخص بقدر استعداد ایک دوسرے سے مستفید ہوتا اور ذہنا پروان چڑھتا تھا، انہی صحبتوں سے سیاسی ذہن میں استقلال پیدا ہوتا تھا اور مزاج میں پختگی آتی تھی اس دور کے بیشتر راہنماؤں اور بہت سے سیاسی کارکنوں کی سیاسی معراج جیل خانے کی ان صحبتوں کے فیضان کا نتیجہ تھی البتہ قید تنہائی غور و فکر کی عادی طبیعتوں کے سوا عام حالات میں مہلک ثابت ہوتی اس سے مزاج میں تہور پیدا ہوتا یا پھر غصہ جھنجھلاہٹ اور چڑچڑاپن نشوونما پاتے تھے۔

ہندوستان کی یادیں :

شاہ جی جب کبھی قید ہوئے عام جماعتی رفقاء سے ان کا ساتھ رہا۔ اگر کبھی علیحدہ رہنا پڑا تو اپنی انجمن خود بنالی، جہاں گئے اپنی باغ و بہار طبیعت ساتھ لے گئے۔ ان کی شخصیت کے گرد بڑائی کا ایک خاص ہالہ بنا ہوا تھا جس سے ہر کوئی ان کے احترام

کرنے پر مجبور تھا۔ قیدی سے لے کر افسر تک سب ان کی طرف کھینچتے اور عزت کرتے تھے ”سکندر وزارت“ کے عہد میں راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل کا انگریز سپرنٹنڈنٹ کرنل ہاڈر آپ کا گرویدہ تھا اسے معلوم تھا کہ شاہ صاحب انگریزوں کے کٹر دشمن ہیں لیکن وہ آپ کی شخصیت سے متاثر ہی نہیں مرعوب تھا۔ اس نے آپ کو بیڈمنٹن کھیلنے پر آمادہ کیا۔ شاہ جی جب تک راولپنڈی جیل میں رہے وہ ہر شام آپ سے بیڈمنٹن کھیلا کرتا۔ اس نے بہ عنوان ”ہندوستان کی یادیں“ ایک کتاب لکھی ہے جس میں اپنے بعض مطالعات و تجربات کا ذکر کیا ہے۔

دلفریب شخصیت :

شاہ جیؒ کے متعلق لکھا ہے کہ :

”جن قیدیوں نے مجھے اثنائے ملازمت میں متاثر کیا ان میں عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نام کا ایک سیاسی قیدی بڑی ہی دلفریب شخصیت کا مالک تھا، اس کا چہرہ مہرہ چرچ کے ان مقدس راہبوں کی طرح تھا جن کی تصویریں یسوع مسیح سے مشابہ ہوتی ہیں یا پھر ان مستشرقین کی طرح جنہیں یورپ میں خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اسے عرب کے بڑے بڑے قاموسیوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن ان کے صحیح شناسا ہمارے ہاں کتنے ہیں؟ میں اسے اپنا دوست بنانا چاہتا تھا لیکن ہمارے درمیان سب سے بڑی روک ہماری مختلف زبانیں تھیں۔ میں اس کی زبان کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا تھا لیکن وہ انگریزی سے قطعاً ناواقف تھا۔ اس کا بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ ۱۸۵۷ء کے اس ”اینٹی برٹش“ ذہن کی باقیات میں سے تھا جنہیں ہمارے پیشروؤں نے علماء کو پھانسی دے کر پیدا کیا تھا۔“

یاد ہائے رفتہ :

شاہ جیؒ تحریک خلافت کے ایام اسیری کا ذکر بڑی حسرت اور مسرت سے کرتے تھے ان کی رائے میں وہ دن ان ہی زندگی کا حاصل تھے۔ تمام ملک مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں ایک بڑا جیل خانہ بن چکا تھا۔ بالخصوص پنجاب کے قید خانے اس وقت کے بڑے بڑے لوگوں کا دارالعلوم تھے۔ شاہ جی سزایابی کے فوراً بعد لاہور جیل میں رکھے گئے۔ جہاں ان کے ساتھ بابا گوردت سنگھ، لاجپت رائے، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا لقاء اللہ عثمانی، صوفی اقبال احمد پانی پتی، مولانا اختر علی خان، سردار سردول سنگھ کولیشتر، راجہ غلام قادر خان، سردار منگل سنگھ، پنڈت نیکی رام شرما اور بعض دوسرے لوگ بھی محبوس تھے۔ کچھ دنوں بعد لالہ لاجپت رائے کے سوا گیارہ نفوس کا یہ قافلہ میانوالی جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں مولانا احمد سعید دہلوی، اور ڈاکٹر ستیہ پال پہلے سے موجود تھے۔ ایک بزم آراستہ ہو گئی۔ اس قید و بند کے حالات مولانا عبدالمجید سالک نے اپنی ”سرگزشت“ میں تفصیل سے لکھے ہیں، ملاحظہ ہو :

جیل خانے کا نقشہ :

”جیل میں ایک احاطہ تھا جس کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ میں چار کوٹھڑیاں تھیں۔ اس کو ”مہڈے خانہ“ یعنی لڑکوں کا احاطہ کہتے تھے اور ایک حصے میں ایک بڑا کھلا کمرہ تھا جس میں سات آٹھ قیدیوں کے لئے گنجائش تھی چونکہ یہ کمرہ قید محض (یعنی بے مشقت) والے قیدیوں کے لئے مخصوص ہوتا تھا اس لئے یہ کمرہ کہلاتا تھا۔ یہ دونوں حصے ایک درمیانی دروازے سے ملے ہوئے تھے۔ اختر علی خانؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا داؤد غزنویؒ، عبدالعزیز انصاریؒ، عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولوی لقاء اللہؒ، صوفی

اقبالؒ، راجہ غلام قادر خانؒ، مولانا عبداللہ چوڑی والے دہلویؒ، میں اور نذیر احمد سیما بؒ ”محض کمرے“ اور ”منڈے خانے“ میں بھیج دیئے گئے۔ اور وہیں ہمارے باورچی خانے کا انتظام کر دیا گیا۔ سردار سردول سنگھ کولیشٹر، سردار منگل سنگھ اور ان کے دو ہندو ساتھی ہندو لیڈروں کے احاطے میں بھیج دیئے گئے جس میں اب ڈاکٹر ستیہ پال، لالہ گردہاری لال امرتسری، لالہ ترلوک چند، دلش بندھو گپتا (تیج) اور متعدد مشہور کارکن آگئے تھے۔

امام السارقین :

چند ہی ہفتوں میں میانوالی جیل سیاسی قیدیوں سے معمور ہو گیا اور رضا کاروں کے احاطوں سے قومی نعروں کی دلاویز صدائیں بلند ہونے لگیں۔ پڑھے لکھے قیدیوں نے مطالعہ وغیرہ کا مشغلہ اختیار کیا۔ چنانچہ ہم لوگوں کا پروگرام یہ ہوتا تھا صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوئے، نماز باجماعت ادا کی اور چائے پی۔ اس کے بعد میں اور عبدالعزیز انصاری مولانا احمد سعید سے ادب عربی صرف و نحو اور منطق کا سبق لینے لگے۔ اختر علی خان اور راجہ غلام قادر خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے قرآن صحیح کرنے لگے، مولوی لقاء اللہ عثمانی اپنی سازشوں اور چوریوں میں مصروف ہو گئے یعنی فلاں فلاں مطلوبہ چیز کیونکر چوری چھپے باہر سے منگوائی جائے اور فلاں فلاں پیغام فلاں شخص کو کس تدبیر سے پہنچایا جائے۔ مولوی لقاء اللہ عثمانی نماز میں ہم سب کے پیش امام بھی تھے اور یہ چوری چھپے کام بھی انہی کے سپرد تھے چنانچہ میں نے ان کا لقب ”امام السارقین“ مقرر کیا تھا۔ سید حبیب بعض وجوہ سے ہمارے ساتھ نہ ٹھہر سکے اس لئے دوسرے احاطے میں چلے گئے تھے۔ ایک زمانہ میں وہ مولانا داؤد غزنوی کو لنگریزی پڑھایا کرتے تھے اور مولانا داؤد سید حبیب کو عربی پڑھاتے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ان کو انگریزی آئی نہ ان کو عربی.... خیر میں دن بھر کا پروگرام عرض کر رہا تھا۔ صبح ہم تھوڑی سی مشقت بھی کرتے تھے یعنی چرنے یا پانچ تار کا سوت (صرف بقدر دو چھٹانک) درمی بانی کے لئے بٹ دیا کرتے تھے۔ یہ کوئی بیس منٹ کا کام تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم کا سلسلہ ایک بجے تک جاری رہتا۔

جیل کو دیکھ کے گھریا آیا :

اس وقت مولانا عبداللہ چوڑی والے لکار کر کہتے ”ارے بھائی! کھانا تیار ہے“ اگرچہ ہمارے کھانا پکانے پر مشقتی قیدی مقرر تھے لیکن ہم نے باورچی خانے کا چارج مولانا عبداللہ کو دے رکھا تھا۔ اور انہوں نے اپنے فرائض مفوضہ کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنی مہارت فن سے دہلی کے وہ وہ کھانے پکا کر ہمیں کھلائے کہ ”جیل کو دیکھ کے گھریا آیا“ سب اکٹھے بیٹھ کر لطف کے ساتھ کھانا کھاتے اور قیلولہ فرماتے۔ نماز ظہر اور عصر کے بعد چائے کا دوسرا دور جاری ہوتا۔ مغرب کے بعد کھانا کھایا جاتا اور عشاء کے بعد بھی دیر تک بحث مباحثے جاری رہتے۔ کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی تھی جس میں اختر علی خان گھڑا بجاتے، صوفی اقبال تالی بجا کرتاں دیتے، سید عطاء اللہ شاہ بخاری غزل گاتے، مولانا احمد سعید، شیخ مجلس بن کر بیٹھتے اور مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری حال کھیلتے، غرض ہم لوگوں کے مشاغل، صوم و صلوة، تلاوت قرآن، تعلیم و تعلم اور تفریح و تفسن کے تمام پہلوؤں سے مکمل تھے لیکن بعض اوقات قوالی میں اتنا غلغلہ اور ولولہ ہوتا کہ دوسرے دن ہمارے ہمسائے یعنی پھانسی کی کوٹھڑیوں والے قیدی سپرنٹنڈنٹ جیل سے شکایت کرتے کہ ”حضور ہمیں یہاں سے کہیں اور بھیج دیجیے یہ ”موبلی“ لوگ ہمیں ساری رات

سونے نہیں دیتے۔“

مولانا عبداللہ چوڑی والے :

اب ہمارے کمرے میں ایک قابل قدر شخصیت کا اضافہ ہو گیا تھا دہلی کے مولانا عبداللہ چوڑی والے آچکے تھے اور ان کی وجہ سے ایک خاص قسم کی شگفتگی دوستوں میں پیدا ہو چکی تھی۔ مولانا دہلی کے نہایت ممتاز قومی کارکن ہونے کے علاوہ مختلف قسم کے دہلوی کھانے پکانے میں بڑے ماہر تھے چنانچہ مولانا احمد سعید کی استدعا پر انہوں نے ہمارے باورچی خانے کا چارج لے لیا۔ اور اسی دن سے ہمارے دسترخوان کی لذتوں میں اضافہ ہو گیا۔ کہیں کھڑے مسالے کا قورمہ پک رہا ہے کبھی میٹھے ٹکڑے تیار ہو رہے ہیں، کبھی پُر تکلف قبولی کھجڑی تیار ہو رہی ہے۔ کبھی ماش کی پھریری وال دسترخوان پر آرہی ہے۔ چونکہ ہمیں دو چھٹانک فی کس کے حساب سے گھی ملتا تھا اور معمولی کھانوں میں استعمال ہونے کے بعد بیچ رہتا تھا اس لئے مولانا عبداللہ اس کا خشک حلوا تیار کر لیتے تھے اور اس کے قتلے کاٹ کاٹ کر سب دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے یہ خشک حلوا عام طور پر تیسرے پہر کی چائے کے ساتھ کھایا جاتا تھا۔ مولانا عبداللہ کی عمر تو اس وقت سینتیس اڑتیس (۳۷، ۳۸) سال سے زیادہ نہ تھی لیکن سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ داڑھی فرنیچ کٹ تھی اور سرخ و سفید رنگت پر بہا رہتی تھی۔ پرلے درجے کے ہنسوز اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے اور دلچسپ واقعات اور لطیفے سنا کر ہم سب کا دل بہلاتے تھے۔

شعر فہمی، سخن سنجی :

یوں تو سبھی احباب شفیق اور محبت پرور تھے مگر مولانا احمد سعید بے تکلف

خانہ ترازو ہے اور کسوٹی بھی، جس سے ہر انسان کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے کسی انسان کا ظرف پرکھنا ہو یا یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ کیا ہے؟ تو اسے دسترخوان یا جیل خانے میں پہچاننے کی کوشش کرو۔ دونوں جگہیں ایسی ہیں جہاں انسان بولتا ہے۔ اس معیار پر انہوں نے ان دونوں کو پرکھا اور تو لا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر افراد کے معاملے میں ان کی رائے بڑی صاف اور پختہ تھی۔ جہاں تک سیاسی تحریکوں میں قید ہونے والے افراد کا تعلق تھا وہ جیل خانے کو تربیت گاہ سمجھتے لیکن اخلاقی مجرموں کے بارے میں ان کا نقطہ نگاہ مختلف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جیل خانے مجرموں کو مزید مجرم بناتے ہیں اور یہاں اصلاح احوال کی توقع ہی عبث ہے جو خرابیاں ایک اخلاقی قیدی کو جیل خانے میں سوچتی اور سجھائی جاتی ہیں وہ ایسی ہیں کہ ایک طرف خطرناک جرم پرورش پاتے ہیں دوسری طرف سزا کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

قانون، مکڑی کا جالا :

قانون و سزا کے بارے میں ان کا نقطہ نظر حکیمانہ تھا، وہ قانون کو حکیم سولن کے الفاظ میں مکڑی کا جالا سمجھتے جو طاقتور سے ٹوٹ جاتا اور کمزور کو پھانس لیتا ہے ان کی نظر میں جرم سے کہیں زیادہ قانون سخت تھا اور سزا کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ محض انتقام ہے اپنی قید و بند کے خلاف کبھی کوئی شکایت نہ کی اور نہ کسی افسر مجاز کا گلہ کیا۔ جو صعوبتیں پیش آئیں انہیں پچشم قبول کیا۔ البتہ کبھی کبھار تقریر کا رنگ باندھنے کے لئے فرماتے۔

”جیل خانہ میری بیوی کا حق مہرنہ تھا اور نہ ہی وہ عقیقہ خاتون اپنے

جہیز میں ساتھ لائی تھی۔“

ان کے گنجلک بالوں کی سپیدی، کھلے ماتھے کی سلوٹوں اور متحرک آنکھوں کی عقبی لہروں پر اچھلتی ہوئی نظریں ڈالتے ہی قید و بند کی ایک ایسی تاریخ سامنے آ جاتی تھی جس کا سر نوشت تھا.....

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

(سوانح و افکار ص: ۹۱ تا ۹۰)

حضرت امیر شریعتؒ تحریک ختم نبوت کے معرکہ الآ را خطیب تھے۔ عام مقررین والی نزاکتیں، آمادگی کے باوجود معذرتیں اور گلے کی خرابی اور سرد روی کی کوفتیں ان میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ وہ فرض شناس رہنما تھے۔ جہاں کھڑے کر دیئے جاتے وہاں ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے، جہاں کچھ کہنا ہوتا بے تکان، بے تکلف بے لحاظ کہتے۔ ان کی ہر تقریر میں ایک نیا پن ہوتا، ایک نیا خیال، ایک نیا جمال، ایک نیا انداز بیاں ایک قدر مشترک تھی وہ بے حد رقت انگیز تقریر کرتے۔ خود بھی روتے، مجمع کو بھی رلاتے۔ شورش نے کیا خوب ترجمانی کی ہے.....

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ
اسی کی صورت کو تک رہا ہے سفر سے ٹوٹا ہوا زمانہ



باب نہم

ذوق شعر و ادب، ظرافت،

حاضر جوابیاں اور چٹکے

امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو اللہ تعالیٰ نے زبان اس قدر شستہ اور صاف عطا فرمائی تھی کہ جب آپ اردو میں گفتگو فرماتے تو یہ گمان ہوتا کہ پنجاب کے باشندے نہیں دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان ہیں۔ آپ کو خود بھی اپنی زبان پر ناز تھا اور فرماتے میں پٹنہ میں پیدا ہوا ہوں اس لئے اہل زبان بھی ہوں۔ امیر شریعت کا ادبی ذوق بہت بلند تھا، شعر و ادب ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ نہ شعر کہنا ان کے لئے کوئی دشوار کام تھا، اور نہ تقریر کرنا کوئی بوجھل کام تھا۔ ان کو ہزاروں عربی، فارسی، اردو پنجابی اشعار از بر تھے اور ان کو اپنی تقاریر میں کچھ اس انداز سے بر محل استعمال فرماتے کہ سننے والے تڑپ اٹھتے تھے۔ ان کی تقریر کے دوران ادبی ذوق رکھنے والے اپنی نوٹ بک نکال کر بیٹھ جاتے جب حضرت شاہ جیؒ شعر پڑھتے تو وہ لوگ اس کو جھٹ نقل کر لیتے۔ شاہ جی کی زبان بڑی پاکیزہ ہوتی تھی۔ گرائمر، محاورہ، اسلوب بیان، زبان کی ہر غلطی سے وہ پاک

بولتے، لکھتے اور اپنے ہر ہر لفظ کے لئے پوری قوت سے دلیل رکھتے تھے۔

شعروادب :

علامہ طالوت مرحوم فرماتے ہیں :

ہم جملہ عقیدت مندوں کی طرح مدت العمر شاہ جی کو ایک بے مثال خطیب اور بے نظیر سخن فہم سمجھتے رہے مگر ایک دن بیٹھے بٹھائے دفعۃً ہمیں معلوم ہوا کہ شاہ جی شاعر بھی ہیں۔ اور ندیم تخلص فرماتے ہیں۔ سچ جانئے کہ آسمان پھٹ پڑتا اور ہم اپنی آنکھوں سے فرشتوں کو زمین پر گرتا ہوا دیکھ لیتے تو ہم کو اتنا تعجب نہ ہوتا جتنا یہ سن کر تعجب ہوا کہ شاہ جی بھی شاعری فرماتے ہیں۔ یہ تعجب اس بناء پر نہیں تھا کہ شعرو سخن کوئی عالم بالا کی چیز تھی اور وہاں تک شاہ صاحب کی رسائی نہیں تھی۔ بلکہ یہ استعجاب :

ع ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

کی اقسام میں سے تھا۔ یہ تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سخن گوئی سے سخن فہمی زیادہ مشکل ہے اور شاہ جی جب سخن فہموں کے بھی سردار ہیں تو سخن سنجی ان کے مرتبہ سے فروتر بات ہے۔ مگر اس فروتر بات میں بھی اس قدر پختگی، بلندی اور چستی ہوگی اس کا ہمیں گمان تک بھی نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے شعر گوئی کی طرف عمداً اور ارادۃً توجہ نہیں فرمائی اور جس طرح ہمیں دفعۃً معلوم ہوا کہ وہ شاعر ہیں۔ خود انہیں بھی اچانک واردات کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ سخن فہمی کے ساتھ ساتھ سخن گوئی کے جراثیم بھی ان کے اندر پائے جاتے ہیں۔ مگر شکر کیجئے کہ بحیثیت فن انہوں نے اس کو اختیار نہیں فرمایا۔ ورنہ بڑے بڑوں کے نام ان کی سخن وری کے سامنے ”چھوٹو رام“ ہو کے رہ جاتے ان کی زندگی بازی گاہ سیاست میں جس نہج پر گزری اس کے متعلق کبھی میں نے

کہا تھا.....

صبح دم ریل میں گزرتی ہے
شب کسی جیل میں گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو اس کھیل میں گزرتی ہے

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا :

اور اسے تفسن نہ خیال فرمائیے بلکہ یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنی خداداد نعمت (خطابت) کے تشکر میں کراچی سے کلکتہ اور گلگت سے ممبئی تک سارے برعظیم پاک و ہند میں گاؤں گاؤں، شہر شہر اور کونے کونے کا سفر کر ڈالا، اور ہر جگہ لوگوں کو آزادی و وطن خواہی اور مغربیت سے ایمان و اسلام کو بچالینے کا درس دیا۔ یہ کام اس قدر وسیع تھا کہ انہیں اس کے سوا کسی دوسری طرف توجہ فرمائی کا موقع ہی نہ مل سکا۔

پھر تعجب بالائے تعجب اس وقت ہوا جب یہ معلوم ہوا کہ شاہ جی کے فاضل فرزند حضرت ابو ذر بخاری نے موتیوں کے ان بکھرے ہوئے دانوں کو بڑے سلیقہ سے ایک سلک میں پرو کر بازار کساد و فساد میں پیش کرنے کا ارادہ فرمالیا ہے اور پھر اس مشکِ نافہ کے لئے عطار کے فرائض مجھ ہچمدان و ہیچ میرز کو ادا کرنے ہوں گے۔ اب:

ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

پہلے تو یہ خیال آیا کہ تعارف میں صرف سعدی کے الفاظ لکھ دوں ”مشک آنست کہ خود بوید نہ کہ عطار بگوید“ مگر پھر خیال ہوا کہ عطاروں کے بازار میں تو یہ بات کہتے ہوئے حرج نہیں اور جس بازار میں حضرت ابو ذر اپنا یہ گنجینہ زر پیش کرنے والے

ہیں وہاں : ع شناسا نہیں کوئی بھی اس ہنر کا

پھر اس کے ساتھ خطرہ یہ بھی ہے کہ کچھ کہنے کے ساتھ کہنے والے کا بھرم بھی

کھلتا ہے۔ شاہ جی فرمائیں گے: ع شعر مر ابدرسہ کہ برد؟

اور اہل نظر کہیں گے: ع سخن فہمی عالم بالا معلوم شد!

بہت سوچا اصطلاحات کا سہارا لینے کو جی چاہا اور معاً غالب کا شعر دماغ میں

گھومنے لگا.....

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

دل کو ایک گونہ تسلی ہوئی اور شاہ جی کے کلام کو دیکھنے بیٹھ گیا کہ اب بادہ و

ساغر کی اوٹ میں بہت کچھ لکھ لوں گا، ورق الٹا کر نظر ڈالی تو سب سے پہلے شاہ جی کے

اس شعر پر جا پڑی.....

گر ہو دوائے عشق کی تلخی نصیب عقل

بنتی ہے پھر تو بادہ و ساغر کہے بغیر

پڑھتے ہی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اصطلاحات کا سہارا ہبائے منشوراً ہو گیا اور ضمیر نے کہا کہ

اب کہو اور میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ غالب کے بعد غالب کے زمینوں میں پہلے تو

بہت کم لکھا گیا اور تھوڑا بہت جو لکھا گیا وہ عموماً کامیاب نہیں رہا۔ ”جواب آں غزل“ کا

دور غالب کے ساتھ ہی ختم ہو گیا..... ع

ایں جواب آں غزل غالب کہ صائب گفتہ است

لیکن اگر شاہ جی اس شعر کے جواب کی بجائے جواب آں غزل لکھ ڈالتے تو

کیا کامیاب نہ ہوتے؟

دوسرے صفحے پر نگاہ پڑی تو فارسی کی ایک نعت سامنے آگئی جس کا مطلع

ہے.....

ہزار صبح بہار از نگاہِ مے چکدش

جوں پیش زلبِ سیاہِ مے چکدش

مطلع پڑھتے ہی ایک بہت پرانا واقعہ ذہن پر چھا گیا۔ اور دل نے گواہی دی

کہ یقیناً یہ نعت اس واقعہ کے بعد ہوئی ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک بار میں نے شاہ جی کی ایک تقریر سنی یوں تو ہر تقریر خطابت

کا شاہکار ہوتی ہے مگر اس تقریر کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ تقریر تقریباً ساری رات جاری

رہی مگر ہزاروں کے مجمع میں سے ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جسے کوئی داعیہ تقریر میں سے

اٹھا کے لے گیا ہو۔ شاہ جی کا چہرہ جلال و جمال کا مرقع بنا ہوا بجلی کی روشنی میں آفتاب کی

طرح چمک رہا تھا مجھے اس موقع پر پرانے کسی استاد کی رباعی یاد آگئی.....

از سخن شہد نابِ مے چکدش

وز تبسم گلابِ مے چکدش

مے تو اں گفت کز حرارتِ مے

از جبیں آفتابِ مے چکدش

میں نے ایک لفظ کی تبدیلی سے اسے شاہ جی پر چسپاں کر دیا.....

از سخن شہد نابِ مے چکدش

وز تبسم گلابِ مے چکدش

می تو اں گفت کز حرارتِ وعظ
از جبین آفتاب سے چکدش

اور پاس بیٹھے ہوئے ایک دوست کو سنادی۔ وہ تڑپ اٹھا اور بار بار رباعی کے مصرعے دہراتا اور شاہ جی کو دیکھتا۔ بعد میں یہ یاد نہیں کہ میں نے یہ رباعی خود یا اس دوست نے شاہ جی کو سنائی۔ اگرچہ آپ نے ہماری اصلاح تو قبول نہ فرمائی۔ مگر رباعی کو بہت پسند فرمایا۔ لکھ لی، اپنی عادت کے مطابق جھوم جھوم کر کئی بار سنائی۔ ہمارے لئے سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ لو جی! ایک چیز تو ہم بھی ایسی نکال لائے جو اب تک شاہ جی کے ذخیرہ انتخاب میں نہیں تھی۔ ورنہ عموماً یہ ہوا کہ ان کی محفل میں کوئی شعر پیش کرو تو اس کے ساتھ دو تین شعر اور سنا ڈالتے ہیں اور دل نے ابہتا جا یہ کہا کہ اس رباعی کے ساتھ ساتھ اب تمہارا نام بھی شاہ جی کے دل میں محفوظ ہو گیا اتنے سے تقرب پر اتنا نشہ چھا گیا کہ بس کچھ نہ پوچھئے.....

ع بلبل ہمیں کہ قافیہ رگل شود بس است

مگر یہ بات ہمارے وہم و گماں میں بھی نہیں تھی کہ اس رباعی کا کچھ جواب بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی اتنا عمدہ اور بلند پایہ۔ کسی بڑے سے بڑے سخن فہم کے سامنے یہ نعت پڑھ جائیے اور پوچھئے کہ یہ کس کا کلام ہو سکتا ہے تو جواب یہی ملے گا کہ کسی پرانے استاد کا کلام ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ دیکھئے تو سہی.....

چمن چمن گل و نسریں ز عکس رخ ریزد

سبد سبد گل خنداں ز راہ می چکدش

خندہ نمکیں اور چشم سیاہ کی فتنہ انگیزیاں ملاحظہ ہوں۔ الحفیظ والامان!

چہ شور ہاست بجانم زخندہ نمکیں
 چہ فتنہ ہاکہ ز چشم سیاہ می چکدش
 صفات حق کی جلوہ نمائی کا بیان آپ نے بہت پڑھا ہوگا مگر ذات و صفات
 کے شاہد اور گواہ آپ نے بہت کم دیکھے ہوں گے.....

چہ گفتگو چہ تبسم شہادتے بحدوث
 ز نور چہرہ قدم را گواہ می چکدش
 اس نعت کے ساتھ ساتھ یہ نعت بھی ملاحظہ فرمائیے اور ہو سکے تو سخن فہموں
 کے ہاں اسے جامی کی طرف منسوب کر کے سناد دیجئے ان شاء اللہ ان میں سے کوئی ایک
 بھی آپ سے یہ نہیں کہے گا کہ یہ نعت جامی کی نہیں ہو سکتی!

لولاک ذرۃ ز جہانِ محمد است
 سبحان من یراہ چہ شانِ محمد است
 سپارۃ کلامِ الہی خدا گواہ
 آں ہم عبارتے ز زبانِ محمد است
 نازد بنام پاک محمد کلامِ پاک است
 نازم باں کلام کہ جانِ محمد است
 توحید را نقطہ پرکار دین ماست
 دانی؟ کہ نکتہ ز بیانِ محمد است

وہی جامی کا سوز و گداز، وہی بیان کی پختگی و شستگی، وہی انداز و طرزِ بیاں کون
 سی چیز ایسی ہے جو جامی کے ہاں ہو اور یہاں نہ ہو؟

اردو میں وحدت الوجود کا مسئلہ شاہ جی نے صرف ایک شعر میں بیان فرمایا ہے

دیکھئے کس قدر صاف اور تعبیر کتنی دلکش ہے.....

ذروں سے تابہ مہر ستاروں سے تاچمن
عکسِ جمالِ یار کی تابندگی ہے دوست

(سوانح الالہام ص: ۱۲)

تین میں ایک، ایک میں تین :

یہ وہ جاہلانہ وحدت الوجود نہیں جہاں عیسائیوں کی طرح ”تین میں ایک اور ایک میں تین“ کے بجائے ”دو میں ایک اور ایک میں دو“ یا ”ایک میں سب اور سب میں ایک“ کہا جاتا ہے۔ بلکہ یہ وہ عالمانہ وحدت الوجود ہے، نہ جس کے سمجھنے میں وقت پیش آئے نہ جسے ماننے میں کوئی امر مانع ہو۔ وحدت کو وجد آیا تو اس نے اپنی صفات کے مظاہر کو پھیلا دیا۔ ذات نے صفات کی جلوہ نمائی کی، اور جلوہ ذات متحرک ہوا۔ دیدہ بینا جہاں جہاں تھی وہ حیران رہ گئی۔ اردو میں وحدت الوجود کا مسئلہ آپ نے صرف ایک شعر میں بیان فرمایا ہے۔ زبان و بیان دیکھئے کس قدر صاف اور تعبیر کتنی دلکش ہے.....

ذروں سے تابہ مہر ستاروں سے تاچمن
عکسِ جمالِ یار کی تابندگی ہے دوست!
بخت اگر رسا شود، دست دہد سبوائے خویش
از نگہ سمن برے لالہ رنے نکوائے خویش
باغ و بہار ما ندیم یعنی کہ جنت النعیم
روئے خوش است و خوائے خوش بوائے خوش و گلوائے خوش

غنیمت کنجاہی نے اپنی مثنوی میں پنجاب کی تصویر کشی کی ہے۔ اور شاہ جی

نے اس تصویر کا دوسرا رخ اسی زمین میں پیش کیا۔ دونوں ساتھ ساتھ ملاحظہ ہوں :
چند نظمیں اردو میں اکبر کے رنگ کی بھی موجود ہیں جن میں مزاح اور تفسن ہے
اور انہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر شاہ جی خازن ریاست سے دامن نہ الجھالیتے تو
موجودہ وقت میں نظم و شاعری اور ادب میں اکبر کے صحیح جانشین ہوتے اور جب اتنا اور
اس میں اضافہ ہو جائے کہ ان کی اکثر نظمیں فی البدیہہ کہی ہوئی ہیں تو اور بھی ان کی قدر
بڑھ جاتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ غالب کی طرح شاہ جی بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں

ع کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

نہ یہ اشعار اس بناء پر انہوں نے لکھے ہیں کہ واقعی وہ شعر لکھ رہے ہیں اور نہ
جن کو انہوں نے کبھی اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ان کی حیثیت محض تبرکات اور تاریخ کے گم
ہو جانے والے اوراق کے لئے صرف ”یادداشت“ کی ہے اور بس!

خلاصہ کلام :

خداداد خطابت میں جو کام شاہ جی عمر بھر کرتے رہے اس کا خلاصہ دو باتوں
میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

(۱) حضور خواجہ دوسرا صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا۔

(۲) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے دائمی نہ ختم ہونے والا جھگڑا۔

شاہ جی کی شاعری کا سرمایہ بھی یہی دو باتیں ہیں اور یہ آفتاب کو چراغ
دکھانے کے سلسلہ میں آپ کے چند نعتیہ نشتروں کو پیش کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ
آپ براہ راست نور آفتاب سے مستفید ہو سکیں۔ چراغ تلے تو آپ کو معلوم ہے ہمیشہ
اندھیرا ہی ہوتا ہے اور دیر تک اندھیرے میں بھٹکنا ہی کچھ بھلے لوگوں کا کام نہیں۔

نعت کا مطلع ملاحظہ فرمائیں.....

جلوہ ایست کہ آسودہ در بر خاک است

کہ ذرہ ذرہ طرب ریز و بس طربناک است

دوسرے مطلع کی بلندی دیکھئے.....

بیا کہ باتو سخنها ز حرف لولاک است

بیا کہ باتو حکایت ز قدرِ افلاک است

نعت گوشاعروں کے ہاں حدیث لولاک لما خلقت الافلاک کا بیان عام

ہے۔ اور ہر شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثناء میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ مگر کسی نے آج تک

اس کی یوں تجزی نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے ما خلقت الارض نہیں فرمایا۔ بلکہ ما خلقت

الافلاک فرمایا ہے اور اس میں کیا نکتہ ہے؟ اگر یہ تجزی پہلے معہود ہوتی تو یہ مطلع تھا مگر

چونکہ یہ کام پہلے پہل آپ نے کیا ہے اس لئے دوسرے مطلع سے پہلے ایک شعر میں

اس طرح متوجہ فرماتے ہیں کہ.....

نگفت خالق مطلع کہ ما خلقت الارض

مقام فکر و تامل حدیث لولاک است

اس شعر کے بعد ذرا پھر شاہ جی کا مطلع ثانی پڑھ کر دیکھئے تاکہ آپ ”قدر

افلاک“ کی قدر پہچان سکیں۔ بیشک افلاک کی قدر بہت بڑی ہے۔ مگر اب زمین کی

قدر کی افزائش بھی قابل غور ہے.....

مقام و منزل قرآن و انبیاء گردید!

بہ مشتبہ خاک بنام چہ رتبہ خاک است

سبحان اللہ

زمیں کو اس ترقی پر فلک سے داد ملتی ہے
فلک کیا عرش باری سے مبارکباد ملتی ہے!

(مقدمہ سوانح الالہام ص: ۶۰ تا ۲۳)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی شاعری :

خطابت اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہ دونوں فن ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ خطیب نثر میں شاعری کرتا ہے وہی نثر جب موزوں ہو جائے تو شاعری بن جاتی ہے۔ خطیب اپنی تقریر کو دلکش اور موثر بنانے کے لئے شاعرانہ ہنر سے کام لیتا ہے۔ اس لئے ایک اچھے خطیب کے اندر ایک اچھا شاعر پوشیدہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں شعر فہمی اور شعر گوئی بھی علماء کی روایت رہی ہے عمر خیام جب رصد گاہ کے کام سے تھک جاتا تو رباعی کہہ لیتا، ابن سینا بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری خطیب بے مثل تھے۔ اسی ناطے سے ان میں ایک شاعر بے مثل پوشیدہ تھا۔ مگر انہوں نے شاعری کے فن کو اختیار نہیں کیا۔ اور نہ ہی اس پر توجہ دی، وہ اعلیٰ شعری ذوق کے مالک تھے۔ بچپن کے شعری مجالس نے اس ذوق کی تربیت کی مگر آپ نے باقاعدہ طور پر شاعری نہیں کی۔ بلکہ کہیں کہیں کسی خاص تحریک و ترغیب کے زیر اثر اشعار کہے اور ندیم تخلص اختیار کیا۔

ان کے اشعار کا ایک مجموعہ ”سوانح الالہام“ کے نام سے چھپ چکا ہے۔ سوانح الالہام فیضی کی تفسیر غیر منقوٹ کا نام ہے۔ چونکہ شاعری کو بھی الہامی سمجھا جاتا ہے۔ اور ساطعہ بجلی کی چمک کو کہتے ہیں۔ اس رعایت سے یہ نام موزوں ہے۔ جب

کسی الہام کی بجلی چمکی اس کے نتیجے میں جو شعر ہوا وہ ساطعہ ہے۔ یوں اس مجموعہ میں بہت سے ساطعات جمع ہو گئے ہیں۔

اس مجموعے میں دو زبانوں میں اشعار موجود ہیں۔ یعنی فارسی اور اردو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ جی کو ان زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ اس مجموعے کے فارسی اشعار میں فکری گہرائی بہت زیادہ ہے اظہار بھی موثر ہے اور اسلوب بھی سلیس ہے۔ شاہ صاحب کی اردو نظمیں ہنگامی موضوعات پر ہیں۔ ہنگامی موضوعات پر ہونے کی وجہ سے یہ نظمیں ہلکی پھلکی ہیں اور بعض میں طنز و مزاح پایا جاتا ہے۔ ان نظموں میں روانی کمال کی ہے، ایک نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجئے.....

دن کو پوجو ، رات کو پوجو

رنگ برنگی دھات کو پوجو

مٹی پتھر پات کو پوجو

ایک نہ پوجو سات کو پوجو

تم کیا جانو اے نادانو!

تم کیا سمجھو تم کیا جانو!

ان نظموں کے علاوہ شاہ صاحب کی فردیات قابل توجہ ہیں.....

چمن کو اس لئے مالی نے خون سے سینچا تھا

کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

یہ شعر وطن کی حالات کی خوب عکاسی کرتا ہے۔ شاہ صاحب نے یہ شعر ساحر

لدھیانوی کو عطاء کیا تھا۔ اور اب یہ شعر ساحر لدھیانوی کی کتاب ”تلخیاں“ کی زینت

ہے۔ چند اور فرد ملاحظہ کیجئے.....

وہ آنکھوں میں موجود اور چشم حیراں
ادھر ڈھونڈتی ہے ادھر ڈھونڈتی ہے
گر ہو دوائے عشق کی تلخی نصیبِ عقل
بنتی ہے پھر تو بادہ و ساغر کہے بغیر
سب سے پہلے حسن کی رعنائیاں ناپی گئیں
پھر ہمارے عشق کی پہنائیاں ناپی گئیں

ان اشعار سے شاہ صاحب کی شعر گوئی کا سلیقہ ظاہر ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل تھی، اور وہ اردو کی کلاسیکی شعری روایت سے واقف بھی تھے۔ اگر شاہ صاحب اس فن پر بھی کچھ توجہ صرف کرتے تو اردو کو ایک اور اچھا شاعر مل جاتا۔ مگر انہوں نے اس فن پر کیوں توجہ نہیں دی اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہے، ان میں سے بعض پر قیاس آرائی ممکن ہے۔ بہر حال مختصر سا مجموعہ ”سواطع الالہام“ ان کی شعر فہمی اور شعر گوئی کی اعلیٰ ذوق کی دلیل ہے۔

پنجابی شاعری سے دلچسپی :

مولانا مقبول احمد صاحب فرماتے ہیں :

ایک روز پنجابی شاعری پر گفتگو ہو رہی تھی۔ شاہ جی پنجابی زبان کی وسعت اس کی جدت اور اس کی بے ساختگی کی داد دے رہے تھے۔ شاہ جی نے ہیر وارث شاہ سے چند اشعار بھی سنائے۔ دوسرے پنجابی شعراء کا تذکرہ رہا۔ صوفیائے کرام کی شاعری پر شاہ جی نے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں جو سوز، رقت اور واردات قلبی کا اظہار کیا وہ دوسری زبانوں میں بہت کم نظر آتا ہے۔ شاہ

جی کو پنجابی کا ایک شعر سنایا گیا

میری گھگھری نوں گھنگھرو پو آدے
جے توں میری ٹور ویکھنی

شاہ جی کو شعر بہت پسند آیا۔ مجھے اس شعر میں کوئی جدت یا ندرت خیال نظر نہ آئی۔ مجھے شاہ جی کی شعر فہمی کے بارے میں علم تھا خاموش رہا۔

حضرت اقدس حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہ فیصل آباد میں خالصہ کالج کی مسجد میں مقیم تھے۔ شاہ جی بیماری کی وجہ سے سفر کے قابل نہ تھے۔ نقاہت بہت بڑھ گئی تھی۔ حضرت اقدس کے ارشاد پر شاہ جی کو کار بھیج کر بلوایا گیا۔ عصر کے بعد حسب معمول حضرت اقدس کی محفل جمی شاہ جی نے اپنی دھوتی کا پلو پکڑ کر حضرت اقدس سے مخاطب ہو کر شعر پڑھا۔ فرمایا حضرت ایک درخواست ہے۔ میرے بیٹے حافظ لدھیانوی نے شعر سنایا تھا۔ پھر اپنی مخصوص لے میں مندرجہ بالا شعر پڑھا۔ آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ دو تین سو آدمی اشکبار ہو گئے۔ شاہ جی شعر پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ حضرت اقدس پر بھی کیفیت طاری ہو گئی۔ شعر کی قسمت جاگ اٹھی اس ادائے خلوص و محبت میں نیاز مندی، حضرت اقدس سے وابستگی کے ہزار پہلو روشن کر دیئے۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۷)

ہے آنکھوں میں موجود اور چشم حیراں :

جانبا زمرزا لکھتے ہیں :

شاہ جی نے اپنا تخلص ”ندیم“ تجویز کیا۔ کبھی کبھار مولوی محمد دین غریب انہیں کوئی مصرعہ دیتے کہ اس پر گرہ لگا دو، چنانچہ ایک دفعہ مصرعہ طرح دیا کہ

ع وہ آنکھوں میں موجود اور چشم حیراں

اس پر امیر شریعت نے یوں گرہ لگائی ے

وہ آنکھوں میں موجود اور چشم حیراں

ادھر ڈھونڈتی ہے ادھر ڈھونڈتی ہے

اس گرہ پر مولوی محمد دین غریب بہت خوش ہوئے۔

عمر رواں کے ساتھ ساتھ جب کبھی طبیعت موزوں پاتے، فارسی اور اردو میں

شعر کہتے۔ چنانچہ ان کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ۱۹۵۵ء میں ”سوانح الالہام“ کے

نام سے شائع ہوا۔

قوم پر سکرات کا عالم طاری ہے :

گرتی ہوئی دیوار کی طرح امیر شریعت کی صحت کو بڑے سہارے دیے جاتے

رہے، لیکن پھول اپنی بہاریں ضائع کر چکا تھا۔ اب گھر میں محفلیں قائم ہوتیں، احباب

صبح و شام جمع رہتے، اور شعر و شاعری کا دربار لگتا۔ ان محفلوں میں جو لوگ شریک ہوئے

ان میں فیض احمد فیض، صوفی تبسم، علامہ لطیف انور گورداسپوری، مولانا عبدالرشید تبسم،

(جو اخبارات میں علامہ طالوت کے نام سے معروف تھے) عبد الحمید عدم اور

ساغر صدیقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس دوران حکیم صاحب نے ایک دن سوال کیا۔ شاہ جی ایسا لگتا ہے جیسے

آپ قوم سے مایوس ہو چکے ہیں۔ جواب میں ایک سرد آہ کے ساتھ فرمایا:

”آپ طبیب ہو کر ایسا سوال کرتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں؛

سکرات کا عالم طاری ہو جائے، تو آپ مریض کی زندگی سے مایوس نہیں ہو جائیں گے؟

بس! یہی حال قوم کا ہے، اس سے مایوس نہ ہو جاؤں تو اور کیا؟

پرسش احوال پر جواب :

اگر کوئی ان دنوں آکر پوچھتا، شاہ جی! کیسی طبیعت ہے؟ تو جواب میں اکثر

یہ دو شعر پڑھتے ے

نہ جانے لوگ کیوں ہنستے ہیں میرے چاک دامان پر

جنوں میں جیسا ہونا چاہیے ویسا گریباں ہے

یا

بے دلی ہائے تمنا، کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق

بے کسی ہائے تمنا، کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

(حیات امیر شریعت ص: ۴۴۳)

شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی :

شاہ جی نے شاعری میں اتنا شستہ و رفته مذاق پایا تھا کہ شاذ ہی کوئی خطیب کسی زمانہ میں ان کا ہم پایہ ہو۔ ان کی خطیبانہ دلکشی کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ عربی فارسی، اردو، اور پنجابی بلکہ علاقائی شاعری کے باکمال اساتذہ کے دواوین سے آشنا تھے۔ عرب شعراء کے ایک تہائی دیوان انہیں نوک زبان تھے فارسی کا کوئی شاعر ایسا نہ ہوگا۔ کہ شاعر ہو اور ان کے حافظہ میں نہ ہو۔ اردو میں ولی دکنی سے لے کر اس دور میں قیوم نظر تک کے تیر و نشتر ان کے جملہ گفتار میں رہتے تھے۔ پنجابی شاعروں میں انہیں وارث شاہ، فضل شاہ، علی حیدر، سلطان باہو، پیر مہر علی شاہ، بلھے شاہ، خواجہ غلام فرید حتیٰ کہ اس زمانے کے استاد عشق لہر اور استاد شرم تک کے کلام کا وافر حصہ یاد تھا اور تو اور

دوہڑے ماہیے، ثقہ سے ثقہ موضوع اور نازک سے نازک مضمون میں اس طرح کھپا جاتے تھے کہ انسان نہ صرف ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا بلکہ دماغ کی ایک پھریری کے ساتھ عیش عیش کراٹھتا تھا۔

امین گیلانی بیان کرتے ہیں :

پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں میں تقریر کر رہے تھے۔ موضوع تھا معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ٹھیٹھہ پنجابی میں بیان کرتے چلے گئے۔ فرمایا حضور عرش کو چلے تو کائنات تھم گئی، اب تھم گئی کو پنجابی میں سمجھانا شروع کیا کہ رک گئی، پھر فرمایا ٹھہر گئی۔ لوگوں سے پوچھا کیا سمجھے؟ زیادہ تر سرفی میں ہلے۔ کروٹ لیتے ہوئے فرمایا :

میرے ہالیو! (ہل جوتنے والو) اللہ کا محبوب عاشق کے گھر کو چلا تو حسن و جمال کے اس پیکر متحرک کو دیکھ کر کائنات تھم گئی ٹھہر گئی رک گئی۔ (تسی حال وی نہیں سمجھے تو تہانوں سمجھانا)

تیرے لونگ دا پیا لشکارا

تے ہالیاں نے حل ڈک لئے

اس خوش آوازی سے پڑھا کہ مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ”رب نے کہا کہ میرا سوہناں آریا اے تے زمین و آسمان دی ایس گردش نو ڈک لوؤ۔ جیہڑے جتھے سن او تھے، دے او تھے ای ڈک لتے“ جہاں زمین و آسمان تھے وہاں رک گئے فرش سے عرش کا سفر طے ہو گیا۔

گالی سے انسان قائل نہیں ہوتا :

فرمایا جو کچھ چاہتے ہو مجھے سمجھا دو گالی سے انسان قائل نہیں ہوتا نہ الزام سے

مانتا ہے اور نہ جھوٹ ہی کو دلیل کہا جاتا ہے۔ مجھے قائل کر لو۔ میں کسی کا لیڈر نہیں میں امیر نہیں، مبلغ ہوں۔ یار لوگوں نے شریعت کو نہ ماننے کے لئے مجھے امیر شریعت بنا رکھا ہے لیکن میں امیر نہیں فقیر ہوں۔ میں صرف سپاہی ہوں۔ اللہ کا سپاہی، رسول کا سپاہی، اسلام کا سپاہی، آزادی کا سپاہی، تمہارا سپاہی اور جب تم مجھے سمجھا دو گے پھر مجھے تنہا چھوڑ دو۔ تب میں جانوں اور میدان جنگ جانے، سپاہی میرے، خون میرا، رضا کار میرے، قید ہونا پڑے یا تختہ دار پر لٹکنا ہو تم مجھے ہر اول دستہ میں پاؤ گے گالی نہ دو سمجھا دو۔ (خوش آوازی کے ساتھ)

میری گھگری نون گھنگھروں پوآدے
جے توں میری ٹور ویکھنی

بس لوگوں کا یہ حال تھا جیسے کسی نے لوٹ لیا ہو۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۰۱)

سنگ اٹھایا تھا کہ سر یا د آیا :

فرماتے۔ غالب ہر کوئی پڑھتا ہے میں بھی پڑھتا ہوں لیکن میں ذرا عام روش سے ہٹ کر پڑھتا ہوں۔ یار لوگوں نے اس کی بہت سی شرحیں لکھی ہیں۔ ہر گلے رارنگ و بوئے دیگر است، سوچتا ہوں تو میرے سامنے ان کے مطالب کا رخ ہی دوسرا ہوتا ہے۔ میرا ذہن خوبخود اس کے اشعار کی گتھیاں کھولتا چلا جاتا ہے اور میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ غالب کا نصف دیوان سیاسی ہے۔ اس نے الفاظ کی ریشمی نقابوں میں نہ صرف اپنے عہد دارورسن اور اپنے زمانہ اذبار و انحطاط کی تصویریں بنائی ہیں بلکہ اشارات اور کنایات میں حالات و واقعات کے دفاتر کو سمودیا ہے۔

ایک دفعہ جانے کیا موضوع تھا کہنے لگے، بھم اللہ نفس نے کبھی کوئی جنسی

خیانت نہیں کی۔ کبھی کسی کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ کسی کی عصمت کو تا کا نہیں۔ کسی کی عصمت کو گھورا نہیں۔ دوسروں کی طرف نگاہ غیر شعوری طور پر اٹھی بھی تو اپنی عزت یاد آگئی.....

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

عمر کے آخری برسوں میں عموماً غالب ہی کے اشعار پڑھتے اور سردھنتے تھے۔
گو ان کے حافظہ پر بیسیوں اساتذہ سخن کے کلام کی راہیں کشادہ تھیں لیکن غالب کے ذکر پر فرماتے ظالم نے دل چیر دیا ہے۔ شیخ حسام الدین ملتان گئے تو بان کی چٹائی پر بیٹھے پان بنا رہے تھے کہنے لگے رات غالب نے کئی گھنٹے بے چین رکھا۔ ہائے سس دن کے لئے کہہ گیا تھا.....

بے کسی ہائے تمنا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

گستاخ اکھیاں :

کتھے مہر علی کتھے تری ثنا
گستاخ اکھیاں کتھے جا اڑیاں

فرمایا! حضرت کا یہ شعر پڑھا تو دنوں تک تڑپتا پھڑکتا رہا۔ عمر بھر لوگوں کو اس سے تڑپایا اور پھڑکایا۔ کئی نعتیہ دیوانوں پر تنہا یہ شعر بھاری ہے۔ گستاخ اکھیاں یہاں اس طرح لگی ہیں کہ کائنات کی حیا کا بوجھ ان پر پڑا ہے۔ اس شعر پر سوچتے جائیے اور پڑھتے جائیے۔ معانی کا ایک بازار آراستہ ہوتا چلا جائے گا پھر یہ رونق کبھی اور کسی وقت

بھی کم نہ ہوگی۔ میں نے لوگوں کو اس پر ماہی بے آب کی طرح لوٹتے دیکھا ہے بلکہ سیرت کے جلسوں میں لوگوں کی ہیبت کذائی ہی بدل ڈالی ہے۔

(بخاری کی باتیں ص: ۹۷)

میکدہ آباد است :

مولانا عبدالجمید انور فرماتے ہیں: شاہ جی کی عبادت کے لئے مولانا خیر محمد جالندھری چلے تو میں بھی ساتھ ہولیا، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر احباب بیٹھے تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے مولانا کو بیٹھک میں قدم رکھتے دیکھا تو معاً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ چہرہ پر خوشی کے آثار پیدا ہو گئے۔ فرمانے لگے حضرت! آج کئی دن کے بعد اٹھ کر کھڑا ہوا ہوں۔ یہ آپ ہی برکت معلوم ہو رہی ہے، ورنہ گھٹنے تو جواب دے چکے ہیں، پھر وجد کی کیفیت میں مولانا سے مخاطب ہو کر یہ اشعار جھوم جھوم کر پڑھنے لگے.....

صدرا ' بہ تو حاجت است چوں من صدرا

بدرا ' بہ تو رونق است نیک و بد را

از دیدن تو قامت من راست شد

چوں راست کنی بلند قدراً قدرا

مولانا عبدالجمید انور صاحب نے ایک اور واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ خیر المدارس ملتان میں تشریف لائے۔ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کو اچانک دیکھ کر طلباء کا ہجوم گرد ہو گیا، پھر مدرسہ کے احاطہ کی طرف نگاہ دوڑائی اور فرمایا

مدارسِ دینیہ دین کی حفاظت کے قلعے ہیں۔ ان کی بقاء سے دین کی بقا ہے، پھر طلباء سے مخاطب ہو کر ایک کیفیت میں یہ اشعار پڑھے.....

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد است
عالم نہ بود ویراں تامیکدہ آباد است
تادل کہ تو اں برون تاجاں کے تواند داد
دل برون و جاں دادن، ایں ہر دو خداداد است

(بخاری کی باتیں ص: ۱۴)

گھی لے کر پہنچو، جوتے تیار ہیں :

مولانا احمد الدین صاحب (موضع میاں علی) ضلع شیخوپورہ نے بتایا ہم ایک دفعہ شاہ جی کی خدمت میں ملتان حاضر ہوئے۔ وہاں ایک شخص کا ملتان جوتا بہت پسند آیا۔ شاہ جی نے فرمایا: ایسے جوتے بنانے والا ہمارے قریب ہی رہتا ہے۔ ہماری خواہش پر شاہ جی نے اس بلوا بھیجا، ہم نے پاؤں کا ناپ دے دیا۔ دوسرے دن جب واپس ہونے لگے تو ہم نے عرض کیا: شاہ جی! آج کل خالص گھی ملنا دشوار ہے۔ ہم آپ کے لئے جب آئے تو کچھ گھر کا گھی لیتے آئیں گے۔ شاہ صاحب نے منظور کر لیا، کچھ دنوں کے بعد شاہ جی کا خط ملا :

عزیزم مولوی احمد دین السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

”گھی لے کر پہنچو، جوتے تیار ہیں۔“

والسلام! عطاء اللہ بخاری

(بخاری کی باتیں ص: ۱۵)

اس لئے مجھ کو تڑپنے کی تمنا کم ہے :

ایک دفعہ تقریر میں فرمایا: دہلی میں ایک مجذوب تھا جو آہ بھر کر بڑے سوز و گداز سے ہمیشہ ایک ہی مصرع بلند آواز سے پڑھتا اور چل دیتا

ع اس لئے مجھ کو تڑپنے کی تمنا کم ہے

لوگ پوچھتے دوسرا مصرع کیا ہے؟ تو وہ کہتا جس دن میں نے دوسرا مصرع پڑھ دیا تڑپ کر جان دے دوں گا۔

ایک دفعہ چند نوجوانوں نے گھیر لیا اور کہا دوسرا مصرع سناؤ، اس مجذوب نے بہت لیت و لعل کی، مگر وہ باز نہ آئے، آخر اس مجذوب نے تنگ آ کر دوسرا مصرع پڑھ دیا اور تڑپ کر گرا اور جان دے دی

وسعتِ دل ہے بہت وسعت صحرا کم ہے

اس لئے مجھ کو تڑپنے کی تمنا کم ہے

فرمایا: اس مجذوب کی قبر شاہی مسجد کے قریب میدان میں چتلی قبر کے نام

سے مشہور ہے۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۵۸)

تم نے مشاعرہ لوٹ لیا :

امین گیلانی رقم طراز ہیں :

تقسیم ہند سے قبل ہریڈ یولا ہور میں ایک مشاعرہ ہوا، جس کی صدارت ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے کی۔ مشاعرہ میں حفیظ جالندھری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، احسان دانش، فیض احمد فیض کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔ صدر مشاعرہ تاثیر صاحب نے سب شعراء کے ناموں کا اعلان کرتے ہوئے میرے متعلق فرمایا :

”امین گیلانی اس مشاعرہ میں سب سے کم سن شاعر ہے۔“

میں نے جب غزل پڑھی تو شرکائے مشاعرہ نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی، خصوصاً جب مقطع کا یہ شعر پڑھا کہ.....

امین اہل جہاں کافر مجھے کہنے لگے جب سے

مرا اس بت پر ایماں اور محکم ہوتا جاتا ہے

تو بہت ہی داد ملی، اور مقطع بار بار پڑھوایا گیا۔ حضرت شاہ صاحب بھی امرتسر

میں یہ مشاعرہ سن رہے تھے۔ لاہور سے واپس آ کر جب کچھ دن بعد شاہ صاحب سے

ملنے کے لئے گیا تو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، فرمایا: امین! میں نے ریڈیو پر تمہارا

مشاعرہ سنا تھا، لطف آ گیا، تم نے مشاعرہ لوٹ لیا، کتنی عمدہ غزل تھی، کتنا پیارا ترنم تھا،

اور مقطع تو واقعی غزل کی جان تھا۔ پھر وہ غزل مجھ سے رو برو سنی اور والہانہ داد دیتے

رہے اور جھومتے رہے۔

کمالِ محبت کی ایک ادا :

تقسیم ہند کے کچھ برس بعد جب میں نے اپنا مجموعہ کلام ”دامانِ خیال“ کے

نام سے چھپوایا تو ایک نسخہ شاہ صاحب کی خدمت میں بھی بھیجا پھر کچھ عرصہ کے بعد شاہ

صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، علیک سلیک کے بعد فوراً مصنوعی ناراضی کا لہجہ اختیار

کر کے کہا: امین! میں تم سے ناراض ہوں، میں نے عرض کیا شاہ جی! قصور بھی تو

بتادیں۔ فرمایا: ایک نہیں دو جرم تم سے سرزد ہوئے۔ تمہارا مجموعہ کلام ”دامانِ خیال“ مل

گیا، اس کا شکر یہ مگر میں نے جب دیا چہ پڑھا تو اس میں تم نے تحریر کیا ہوا ہے کہ عطاء

اللہ شاہ سے ہماری دور و نزدیک کی رشتہ داری ہے، پھر فرمایا: نزدیک کے ساتھ یہ دور کا

لفظ مجھے کانٹے کی طرح چبھا۔ کیا تمہاری تایا زاد بہن میری بھانج نہیں۔ افسوس کہ نزدیکیوں کے باوجود تم نے مجھے دور کا رشتہ دار لکھ دیا۔ اچھا جی لو ان رشتوں کو چھوڑو۔ رشتے تو دلوں کے ہوتے ہیں، کیا میں تم سے دور ہوں یا تم مجھ سے دور ہو، شاہ جی نے یہ باتیں اتنے پیار سے کہیں کہ میں آبدیدہ ہو گیا اور عرض کیا معافی چاہتا ہوں، فرمایا: یوں نہیں وعدہ کرو، آئندہ ایڈیشن میں دور نکال کر صرف نزدیک لکھ دو گے، میں نے اقرار کیا، تو فرمایا: ہاں! اب معاف کر دیا۔

کورذوقوں کی پرواہ نہ کریں :

میں نے کہا: اچھا جی وہ دوسرا قصور کیا ہے؟ فرمایا: اس مجموعہ میں تمہاری وہ غزل بھی شامل ہے جو تم نے ریڈیو پر پڑھی تھی، مگر اس کے مقطع میں جو یہ مصرع تھا، مرا اس بت پر ایماں اور محکم ہوتا جاتا ہے، وہاں سے بت کا لفظ حذف کر کے جاں کیوں گھسیڑ دیا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے انگوٹھی میں سے خوب صورت چمکتا ہوا نگینہ نکال کر یونہی بے رنگ سے پتھر کا ٹکڑا لگا دیا ہو۔ میں نے کہا: شاہ جی! آپ جیسے علماء کا لحاظ آیا کہ وہ کہیں گے کہ میں نے کسی بت پر ایمان محکم کر لیا ہے۔ فرمایا: بھئی! افسوس ہے تم نے سب علماء کو ذوقِ لطیف اور سخن شناسی سے بے بہرہ سمجھ لیا، ہاں ناشناس سخن بھی ہوتے ہیں، لیکن ان کی پرواہ نہ کریں، کورذوقوں کی خاطر صحیح اور پھبتے ہوئے لفظ کو خارج کر دیا، آئندہ اس مقطع کو بھی لفظ بت سے مزین کر دینا۔ کورذوقوں کی پرواہ نہ کریں۔ بت فارسی کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں محبوب اور معشوق۔ سب اہل نظر اور صاحب دل یوں ہی سمجھتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں۔ میں نے وعدہ کیا آئندہ یہ بھی درست کر دوں گا، فرمایا: اب پوری پوری صلح ہو گئی۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۱۸)

نفسِ نفس میں رحمتیں :

تقسیم ہند سے قبل ہندو مسلم فسادات کا دور دورہ تھا۔ شاہ جی لاہور دلی دروازے مجلس احرار اسلام کے دفتر میں تھے۔ راقم الحروف (امین گیلانی) بھی دفتر گیا۔ شاہ جی سے ملا تو فرمایا: آؤ بھائی گیلانی! آج تمہارے استاد یعنی (حضرت احسان دانش) کی غزل نے بڑا مزادیا۔ واہ واہ بھئی! واقعی استاد ہیں، پھر وہ روز نامہ سامنے پڑا تھا، جس کے سرورق پر وہ غزل تھی۔ بڑے مزے سے پڑھ کر سنائی، ہر شعر پر سر دھنتے اور داد دیتے تھے.....

وہ شاخِ گل پہ زمزموں کی دھن تراشتے رہے
 نشیمنوں پہ بجلیوں کا کارواں گزر گیا
 جہاں نظر نہیں پڑی وہاں ہے رات آج تک
 وہیں وہیں سحر ہوئی جہاں جہاں گزر گیا
 نفسِ نفس میں رحمتیں قدم قدم پہ برکتیں
 جدھر جدھر سے وہ شفیع عاصیاں گزر گیا

ان اشعار کو خصوصاً کئی بار پڑھا۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک کسی ضروری کام کے لئے شاہ جی کو اٹھ کر دوسرے کمرے میں جانا پڑا، میں موقعہ پا کر جلدی سے مکتبہ دانش سے احسان دانش صاحب کو ساتھ لے کر دفتر میں پہنچا تو دیکھا کہ شاہ صاحب اندروالے کمرے کے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے اوپر والی کھٹ کو تھامے بار بار یہ شعر پڑھ رہے ہیں.....

جہاں نظر نہیں پڑی وہاں ہے رات آج تک
وہیں وہیں سحر ہوئی جہاں جہاں گزر گیا
ہم ایک دو منٹ خاموشی سے کھڑے رہے، پھر احسان صاحب نے بلند
آواز سے السلام علیکم کہا۔ شاہ جی! فوراً پلٹے اور وعلیکم السلام کہہ کر حضرت احسان سے
لپٹ گئے اور میری طرف دیکھ کر فرمایا: اچھا ستارہ سحر کو بھی لے ہی آیا۔ بھئی! تم
احسان کو لے آئے مجھ پر احسان کیا، اب کچھ وقت خوب گزرے گا، پھر کافی دیر تک
احسان صاحب سے کلام سنتے رہے اور والہانہ داد دیتے رہے۔

(بخاری کی باتیں: ۱۸)

چمگاڈ کے مہمان :

شاہ جی نے فرمایا : جنوری ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ الیکشن ہی کا زمانہ تھا۔ میں
پنجاب سے فارغ ہو کر سرحد پہنچا، شاید کچھ انتخابات ہو چکے تھے اور کچھ باقی تھے۔ مجھے
پروگرام کے مطابق کئی جگہ تقریریں کرنی تھیں۔ اسی سلسلہ میں ہزارہ پہنچا۔ وہاں
کانفرنس ختم ہوئی تو اوڑھ ٹنک پہنچے۔ بیت الخلاء کی ضرورت ہوئی تو میں نے پوچھا کہ
بھائی! پیشاب پاخانے کے لئے کوئی جگہ ہے۔ تو مولانا غلام غوث ہزاروی کہنے لگے
کہ جہاں ہم گئے تھے، وہیں کہیں آپ بھی بیٹھ جائیں۔ اب جو میں نے باہر نکل کر
دیکھا تو کھلا میدان ہے۔ اس میں کوئی دائیں آ رہا ہے، کوئی بائیں سے، کوئی آگے
سے کوئی پیچھے سے، اب بیٹھوں تو کہاں؟ میں واپس آ کر کمرے میں چپ چاپ لیٹ
گیا، اور وہیں یہ نظم لکھ دی۔ مجھے ”چمگاڈ کے مہمان“ کی ضرب المثل یاد آگئی کہ اس
کے پاس کوئی مہمان آ گیا اس نے کہا: بھائی! کہاں بیٹھیں اٹھیں؟ دن کا وقت تھا،

اور دن کو چمگادڑ درختوں یا مکانوں میں اُلٹے لٹکے رہتے ہیں۔ اس نے وہیں سے جواب دیا کہ ”بھائی! جہاں ہم لٹکے ہوئے ہیں تم بھی وہیں لٹک جاؤ۔“ اور یہی قصہ مجھے اکوڑہ خٹک میں پیش آ گیا کہ جن کے مہمان تھے انہوں نے بھی ”جہاں ہم لٹکے ہوئے ہیں، تم بھی وہیں لٹک جاؤ۔“ کی قسم کا مشورہ دے دیا، یعنی جہاں وہ خود لٹکے تھے ہمیں بھی لٹکانا چاہا۔“

”مولانا نے مجھے مشغول دیکھا، تو باہر سے ہی بول اُٹھے کہ آپ کہیں نظم تو نہیں لکھ رہے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں! لکھ تو رہا ہوں، کہنے لگے، سنائیے! میں نے پڑھی تو کہنے لگے، یہ لوگوں کو مت سنائیے گا۔ میں نے کہا: اچھا دیکھا جائے گا۔ چنانچہ جب سب اکٹھے ہو گئے، تو میں نے چپکے سے کاغذ نکال کر نظم پڑھنی شروع کر دی، بس پھر جو حال ہوا، وہ بیان سے باہر ہے۔“

ہری پور ہزارہ کے جلسہ کے بعد	یہ آرڈر ملا جیش احرار کو
کہ جانا ہے تم کو اکوڑہ خٹک	
یہ فرمان سنتے ہی سب سُرخپوش	بانداڑ خاص و بجوش و خروش
روانہ ہوئے سوئے رود اٹک	
ہوئی شام اور سُرخپوش آگئے	اٹک پر برنگ شفق چھا گئے
دئے سب نے بکس اور بستر پٹنگ	
کسی کو جو فطری تقاضے ہوا	مؤڈب وہ اس طرح گویا ہوا
کہ دوں اپنی بوری کو کس جا جھٹک	
یہ فرمایا اٹھ کر کے اک خان نے	وہ اک محترم اور ذیشان نے
بشان خصوصی قوم خٹک	

خو! تم نے سنا ہے وہ شہر کا بات

جو اُس نے کہا اپنے حزمان سے

دکھا کر کے اپنی لٹک اور منگ

یہاں ٹٹی مٹی کا حاجت نہیں

جہاں اُم لکتا ہے تو بھی لٹک

(سوانح الالبہام ص: ۸۳ تا ۸۱)

ہزارہ کے حکیم حاذق :

شاہ جیؒ نے فرمایا : میں مجلس احرار اسلام پشاور کے دفتر میں بخار سے پڑا ہو

اتھا کہ اتنے میں مولانا غلام غوث ہزارویؒ آئے، اور پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے؟ میں

نے کہا: بخار ہے۔ کہنے لگے میرے پاس کرنجوا ہے، وہ کھا لیجئے۔ میں نے کہا کڑوا ہوگا،

تو کہنے لگے بخار میں مفید ہوتا ہے۔ میں نے کہا دیجئے، میں نے ہتھیلی پر رکھ کر منہ میں

ڈال لیا اور اوپر سے پانی پی لیا۔ جب میں دوا کھا کر پانی پی چکا تو نہایت متانت سے

کہنے لگے: آپ کو معلوم ہے اسے فارسی میں کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہنے

لگے: اس کا نام ”خایہ ابلیس“ ہے اور اس پر ایک زور کا قہقہہ لگا۔ میں نے کہا: خدا کے

بندے! یہی کرنا تھا تو کھانے سے پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ تو فرماتے ہیں بتا دیتا تو آپ

کھاتے ہی کہاں؟ خیر! کوئی حرج نہیں، چیز مفید ہے، میں نے دل میں کہا کہ لے

بھائی! پٹھان چوٹ کر گیا۔ اگر اس کا جواب نہ ہو تو بات نہیں بنتی۔ خیر اس وقت تو میں

نے بات ٹال دی اور چب ہو کر لیٹ رہا، لیکن دھیان اسی طرف تھا کہ کچھ ہونا ضرور

چاہئے۔ مولانا تو یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ گئے اور باہر برآمدے والے کمرے میں

جا کر لیٹ گئے اور میں نے کاپی پینسل جو میرے سر ہانے رکھی تھی، اٹھا کر یہ قطعہ لکھا :

حضرت غوث ہزارہ کے حکیم حاذق

جو کہ بیمار سے کم فیس لیا کرتے ہیں

اب یہ معلوم ہوا کہ بخاروں میں حضور
کشتہ خایہ ابلیس دیا کرتے ہیں
اب مولانا کو فکر ہوئی، کیونکہ وہ مجھے لکھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ تو وہیں سے
گھبرا کر پوچھنے لگے کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا آپ کا قصیدہ لکھ رہا ہوں۔
مجھے کربنجا کھلا کر آپ نے اُسے ”خایہ ابلیس“ بنایا ہے۔ تو آپ کی تعریف لکھی ہے تاکہ
بیماروں کو آپ کے علاج اور دواؤں کا پتہ چل جائے کہ آپ کیا کچھ کرتے اور کھلاتے
ہیں۔ کہنے لگے: اچھا سنائیے! میں نے یہ قطعہ پڑھا، اب جو سنا تو لاجول و لا قوۃ
پڑھتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے کہ کشتہ نہیں بلکہ سفوف تھا؟ میں نے کہا:
اچھا، پہلے نہیں تھا تو اب ”کشتہ“ ہو گیا۔ اس پر بیچارے بہت پریشان ہوئے اور لوگوں
کو سنانے سے روکتے رہے، اور مجلس میں ایک تماشا بنا رہا۔“

(سوانح الالبام ص: ۹۲، ۹۳)



حاضر جوابیاں برجستہ جملے

ایک دفعہ شورش نے عرض کیا شاہ جی! سانحہ کربلا پر تقریر فرمائیے۔ کہنے لگے۔
میں اس موضوع پر تقریر نہیں کر سکتا، میرے خاندان پر جو بیتی ہے۔ بیاں کروں تو خود میرا
جگر شق ہو جائے گا۔ جب کبھی کسی سیاسی مسئلہ میں شیعہ اکابر کو جھنجھوڑتے تو فرماتے:
”کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ حسینؑ کا نام لیتے ہو لیکن صدیوں سے
تمہارا شعار یہ ہو گیا ہے کہ یزید مردہ پر لعن کرتے ہو اور یزید زندہ کی

پوجا کرتے ہو۔

باب ادب بے ایمان :

کسی نے کہا شاہ جی وہابی اور غیر وہابی میں کیا فرق ہے۔ فرمایا اس قسم کے سوال نہ کرو دین کی توقیر کم ہوتی ہے۔ سائل کا اصرار بڑھا تو کہنے لگے :
 ”میاں جو تم کہلوانا چاہتے ہو وہ یہ ہے کہ وہابی بے ادب با ایمان
 ہوتا ہے اور غیر وہابی با ادب بے ایمان۔“

دامن پکڑ لیا تو چھڑا یا نہ جائے گا :

ایک نوجوان نے شاہ جی سے کہا۔ ہم نے آپ کی شخصیت سے جو تاثر اخذ کیا وہ یہ ہے کہ آپ سے دارورسن نام کی ایک پکچر کا ہیرو بننے کی خواہش کریں کیونکہ آپ کی صورت حضرت یسوع مسیح سے ملتی جلتی ہے۔ شاہ جی کھکھلا کر ہنس پڑے فرمایا۔
 خوب ہے میاں۔ خود قد و گیسو میں رہو اور ہمارے لئے وہاں بھی دارورسن۔
 اب سمجھ میں آیا کہ غالب کے ہاں ”جہاں ہم ہیں وہاں دارورسن کی آزمائش ہے“ کے معنی کیا تھے۔ اس نوجوان نے رخصت ہوتے وقت شاہ جی کا ہاتھ چومنا چاہا تو آپ نے ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا : ع دامن پکڑ لیا تو چھڑا یا نہ جائے گا

حضرت عائشہؓ اور حضرت خدیجہؓ میں فرق :

کسی نے سوال کیا حضرت عائشہؓ اور حضرت خدیجہؓ میں کیا فرق ہے۔ فرمایا!
 اس قسم کے سوال نہ کیا کرو۔ سوالات میں چور ہو تو دل کا فر ہوتا ہے۔ خدیجہؓ محمد بن عبد اللہ کی بیوی اور عائشہؓ محمد رسول اللہ ﷺ کی زوجہ تھیں۔ اُمہات المؤمنین سے متعلق

دل کا چور نکال دو۔

یا علی مدو :

کسی قصبہ میں تقریر کرنے جا رہے تھے دیکھا کچھ لوگ چرس پی رہے ہیں اور چلم کا کش لگا کے یا علی مدو کا نعرو لگاتے ہیں۔ رک گئے، اور انہیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ میاں کیا حضرت علیؑ چرس پیا کرتے تھے؟ چرس پی کر میرے باپ (حضرت علیؑ) کا نام کیوں لیتے ہو۔ اپنے باپ کا نام لو۔

حضرت علیؑ اور حضرت عمرؓ :

کسی نے سوال کیا شاہ جی! حضرت علیؑ اور حضرت عمرؓ میں کیا فرق ہے؟ فرمایا بڑا فرق ہے۔ حضرت علیؑ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرید تھے اور حضرت عمرؓ مراد۔ سب خود حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے لیکن حضرت عمرؓ کو اللہ تعالیٰ سے مانگا تھا۔

وہ نوری ہیں اور میں خاکی :

کسی نے سوال کیا حضرت! آپ کو صاحبزادہ فیض الحسن نوریؒ نے کیوں چھوڑ دیا۔ ارشاد فرمایا، وہ نوری ہیں میں خاکی۔ ان نوریوں سے امید کب تک؟ سب سے بڑے نوری حضرت جبرائیل علیہ السلام نے شب معراج میں میرے نانا کو سدرۃ المنتہیٰ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ (سوانح و افکار ص: ۲۸۸)

مجھے بیعت کر لیجئے :

حضرت امیر شریعت کی بیٹی راویہ ہیں۔ فرماتی ہیں، اباجی اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھے ہوئے تھے ایک آدمی آیا اور کہا مجھے بیعت کر لیجئے۔ اباجی نے فرمایا! بھائی جا

کسی نیک آدمی کی بیعت کر لے۔ وہ چلا گیا۔ دوسری بار پھر آیا، اباجی نے پھر کہا کسی اور بزرگ کی بیعت کر لیجئے۔ تیسری بار وہ پھر آیا۔ سب ساتھی صبح کی نماز سے فارغ ہو کر چار پائیوں پر اباجی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اباجی بھی پاؤں لٹکا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس شخص نے آ کر پھر بیعت کرنے کو کہا، اباجی نے زچ ہو کر کہا آچڑھ میرے کندھوں پر تجھے بیعت کروں۔ وہ اتنا سادہ آدمی تھا فوراً اباجی کے کندھوں پر سوار ہو گیا۔ اباجی کے سب ساتھی ہنس ہنس کر دھرے ہو رہے تھے۔ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تالیاں بجاتے اور کہتے اب بھی نہ کرو بیعت۔ اباجی نے کہا بھائی میں نے بیعت کر لیا میرے پیر نے تجھے بیعت کیا تو نیچے اتر۔ اس بے چارے نے سمجھا شاہ جی کا طریقہ بیعت ہی یہی ہے۔ خیر بعد میں اسے اباجی نے بیعت کر لیا۔ (امیر شریعت نمبر ص ۲۶۵)

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ :

حضرت مولانا محمد یاسین جھنگوی راوی ہیں، حضرت شاہ جیؒ خود فرماتے:

ایک مرتبہ ایک آریہ سماجی نے مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ شاہ جی آپ جو کلمہ پڑھتے ہیں، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ یہ کلمہ تو حید تو نہیں ہے بلکہ یہ تو کلمہ شرک ہے (العیاذ باللہ) ہاں اگر صرف لا الہ الا اللہ ہوتا تو کلمہ تو حید تھا۔ لیکن جب محمد رسول اللہ آ گیا تو یہ کلمہ تو حید نہ رہا۔ میں نے برجستہ جواب دیا۔ یہ تو تمہارے لئے ہے تم لوگ بڑے لوگوں کی پوجا پاٹ شروع کر دیتے ہو کہ یہ بزرگ لوگ بھی الہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے وضاحت کر دی کہ محمد رسول اللہ ﷺ الہ نہیں بلکہ صرف رسول اللہ ہیں، کہیں تم بھی ان کی پوجا نہ شروع کر دو۔ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ کا فر مبہوت ہو گیا۔ (امیر شریعت نمبر ص ۲۷۵)

منکرین بشریت سے :

ایک موقع پر منکرین بشریت کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ بھائی لوگو! آپ کے کبوتروں کی بھی نسل ہو اور بیٹروں کی بھی۔ لیکن ہم ایک سید ایسے ہیں کہ جن کی نسل نہیں۔ حضور ﷺ کو تم بشر نہیں مانتے تو ہم کس کی اولاد ہوئے۔

میرادل چھین لیا ہے :

امین گیلانی راوی ہیں، ایک جگہ دعوت تھی، میں اور شاہ جی دسترخوان پر آمنے سامنے بیٹھے تھے، میزبان نے روسٹ کئے ہوئے سالم مرغ دو دو مہمانوں کے سامنے رکھ دیئے۔ مجھے شرارت سو جھی میں نے چھری سے مرغ کا دل الگ کر کے ہتھیلی پر رکھ کر شاہ جی کو دکھا کے کہا شاہ جی! یہ کیا ہے؟ دیکھتے ہی شاہ جی بھی میرے ساتھ بچوں ہی کی طرح شوخی پر تل گئے، زور زور سے شور مچانے لگے، اے لوگو! اے علماء حضرات! اس لڑکے کو دیکھو اس نے میرادل چھین لیا ہے۔ مچل مچل کر بار بار یہ فقرہ دہرایا تو سب بے اختیار ہنسنے لگے، یہ واقعہ لکھتے ہوئے مجھے داغ کا شعر یاد آ گیا، ضیافتِ طبع کے لئے درج ہے.....

نظر نکلی نہ دل کی چور زلف عنبریں نکلی

ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

ایک کرامت :

انہی دنوں کھلابٹ ہزارہ کے محمد زمان خان جو رشتے میں جنرل ایوب خان کے ماموں زاد بھائی تھی۔ شاہ جی کو ”کھلابٹ“ کے لئے دعوت دی۔ شاہ جی دن تو

متعین نہ کرتے، کہتے ہاں کسی دن آؤں گا۔ زمان خاں نے اپنی والدہ سے کہہ کر کہ شاید آج شاہ جی تشریف لے آئیں۔ باغ سے ایک دوٹو کرے مالٹوں کے اور دو چار مرغیاں ذبح کر کے رکھ لیتے، شاہ جی نہ پہنچتے تو وہ شام کو خود ہی کھاپی لیتے۔ کئی دنوں کے بعد شاہ جی کہنے لگے چلو آج کھلا بٹ ہو آئیں۔ میں تھا صاحبزادہ فیض الحسن تھے، کھلا بٹ پہنچے تو معلوم ہوا زماں خاں روزانہ انتظار کے بعد مرغیاں بھون کر چٹ کر جاتے اور مالٹوں کا رس پی لیتے۔ تقریر کے دوران شاہ نے مذاق کیا، بھئی! ہم فقیر سہی مگر ہم پر خدا کا اتنا احسان ہے کہ لوگ ہمارے نام پر مرغیاں بھون بھون کر کھاتے ہیں اور ٹوکری ٹوکری مالٹوں کا رس پی لیتے ہیں۔ یہ سن کر زمان خان نے یکدم پکارا، شاہ جی! خدا کے لئے مجھے بدنام نہ کریں۔ شاہ جی نے عوام سے ہنس کر کہا: لو بھئی! میں نے تو کسی کا نام نہیں لیا تھا۔ یہ بھی ہماری کرامت ہے کہ اس نے بھرے مجمع میں خود ہی اقرار کر لیا، سارا مجمع ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ (بخاری کی باتیں ص: ۱۲۱)

ظرف و استعداد کی بات :

غالباً امرتسر قلعہ بھنگیاں میں دورانِ تقریر جو کہ عوام الناس کی اکثریت خالصتاً پنجابیوں کی تھی اور ان میں اکثر ان پڑھ دکاندار مزدور تھے ایک موقع پر انہیں بات ذہن نشین کرانے کے لئے وارث مرحوم کا ایک شعر پڑھا.....

اک ناں شوق شراب دے ٹھٹ بھر لئے
 رہ گئے اک ناں دے ٹھوٹھے خالڑی دے

یعنی بعض نے شراب معرفت کے خم کے خم بھر لئے، مگر بعض کے معمولی پیالے بھی خالی ہی رہے۔ بات استعداد اور ظرف کی سمجھا رہے تھے، پھر مزاحاً فرمایا:

ہیر نام میں کیا حرج ہے؟

سید وارث شاہ نے ہیر لکھ کر ہیر کو کتنی شہرت دی، مگر اس کے باوجود کسی نے آج تک اپنی بیٹی کا نام ہیر نہیں رکھا۔ ایک منچلا نوجوان اٹھا اور بلند آواز سے کہا: شاہ جی! اگر ہیر نام رکھ لیا جائے تو ہرج بھی کیا ہے؟ شاہ جی نے اس کی طرف دیکھا، گیسوؤں کو جھٹکا دے کر مسکرائے اور فوراً فرمایا: اچھا پتر رکھ لیں بے ساری گلی رانجھیاں نال نہ بھر گئی تے میں جھوٹا۔ یعنی اچھا بیٹا! تم رکھ کر دیکھ لینا اگر ساری گلی میں رانجھوں کا ہجوم نہ ہو گیا تو میں جھوٹا ہوا۔ تمام سامعین ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

(بخاری کی باتیں ص: ۱۲۳)

ہم تمہاری بصیرت کے قائل ہیں :

ایک دفعہ سالک صاحب اور جناب مجید لاہوری حضرت شاہ جی سے ملنے کے لئے آئے۔ شاہ جی اس وقت نماز سے فارغ ہو کر مصروف تسبیح تھے۔ سالک مرحوم نے کچھ توقف کے بعد ازراہ شوخی یہ مصرع پڑھا..... ع ”برزبان تسبیح در دل گاؤخر“..... شاہ جی تسبیح سے فارغ ہوئے تو ہنس کر فرمایا: بھائی سالک! ہم تمہاری بصیرت کے قائل ہوئے۔ بتائیے تم دونوں میں گاؤ کون ہے اور خر کون؟ واقعی دوران تسبیح مجھے تم دونوں کا بار بار خیال آیا تھا کہ بیچارے گاؤخر میرے منتظر بیٹھے ہیں۔ اس جواب پر سالک مرحوم پھڑک اٹھے اور محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔

(بخاری کی باتیں ص: ۱۳۵)

تیسرا حلال :

ایک دفعہ شاہ جی مولانا محمد علی جالندھریؒ اور دیگر احباب دسترخوان پر بیٹھے

ناشتہ کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی صاحب نے سویاں چائے میں ڈال کر کھانا شروع کر دیں۔ شاہ جی نے دیکھا تو مسکرا کر فرمایا : یہ آرائیں کچھ بھی بن جائیں مگر انہیں کھانے کا سلیقہ نہ آیا۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا: شاہ جی حلال میں حلال ملا کر کھا رہا ہوں، بھلا آپ کو کیوں کراہت آرہی ہے۔ شاہ جی خاموش رہے۔ چند منٹ گزرے اور دیکھا کہ اب بقایا کچھ حصہ کھانے کا رہ گیا ہے تو چپکے سے ان کی چائے اور سویوں میں سادہ پانی انڈیل دیا اور ہنس کر فرمایا: لو میں نے تیسرا حلال بھی شامل کر دیا، اب اور مزے سے کھاؤ سب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ (بخاری کی باتیں ص: ۸۶)

سورۃ الرحمن ساتھ لگا دو :

مولانا عبدالکریم صاحب خطیب جامع صدر شاہ پور فرماتے ہیں، ایک دفعہ شاہ جی ایک جلسہ میں شاہ پور تشریف لائے، میری گزارش پر میرے ہاں قیام منظور فرمایا، مجھ سے پوچھا کتنے بچے ہیں۔ عرض کیا عرصہ ہو چکا شادی کو مگر ابھی تک اولاد سے محروم ہوں دُعا فرمائیں۔

حضرت شاہ صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دُعا فرمائی، اللہ کے فضل سے ڈیڑھ سال بعد پہلا لڑکا مسعود الرحمن پیدا ہوا۔ کچھ عرصہ بعد کھٹھی سیداں سے واپسی پر پھر بندہ کے مکان پر تشریف لائے۔ میں نے ”مسعود الرحمن“ کو حاضر کیا۔ نام پوچھا تو میں نے مزاحیہ انداز میں عرض کیا مختصر نام ہے۔ ”مسعود الرحمن ولد فی شہر رمضان فی ملک پاکستان“ ہنس کر فرمایا: بھئی! اتنا مختصر نام نہ رکھو، سورۃ الرحمن ساری ہی ساتھ لگا لو۔

خدا کا خوف کرو :

ایک دفعہ مولانا محمد علی صاحب جالندھری سندھ کے طویل تبلیغی دورہ سے

واپس آئے، تو سفر کی تھکان، طبیعت ناساز اور گلا خراب تھا۔ اسی حال میں شاہ جی کے پاس آ پہنچے۔ شاہ جی خود بھی بیمار تھے، دونوں نے ایک دوسرے سے مزاج پرسی کی، شاہ جی نے پوچھا: بھائی! محمد علی کیا حال ہے؟

مولانا نے کہا: شاہ جی مسلسل سفر پھر روزانہ تقریریں بیمار ہو گیا ہوں، گلابھی خراب ہو گیا ہے۔ شاہ جی لیٹے ہوئے تھے، اٹھ بیٹھے اور فرمایا: محمد علی! خدا کا خوف کر تیرا گلا خراب ہو گیا۔ پہلے ہی کونسا لحن داؤدی تھا، جواب تیرا گلہ خراب ہو گیا ہے۔ یہ سن کر ہم سب اور خود مولانا کھلکھلا کر ہنس پڑے اور ساری طبیعت کی افسردگی جاتی رہی۔

یہ بھی کوئی نام ہوا؟

ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے، ایک اسٹیشن پر ایک ادھیڑ عمر وضع دار شخص اسی ڈبے میں داخل ہوا، جس میں شاہ صاحب بیٹھے تھے، شاہ صاحب نے ذرا سمٹ کر کہا آئیے! یہاں تشریف رکھئے، وہ صاحب بیٹھ گئے۔ گاڑی چل پڑی، تعارف کیلئے شاہ صاحب نے کہا، کیا اسم گرامی ہے؟ اس نے کہا میرا نام کلب حسین (حسین کا کتا) اب اس نے پوچھا، جناب کا اسم گرامی؟ شاہ صاحب نے فوراً کہا ”خنزیر اللہ“ وہ صاحب بے ساختہ بولے حد ہوگئی یہ بھی کوئی نام ہوا۔ شاہ صاحب مسکرا کر جواب دیا اگر آپ حسین کے کتے ہو سکتے ہیں تو میں اللہ کا میاں سو نہیں ہو سکتا۔ اس میں تعجب کا کیا پہلو ہے؟ (بخاری کی باتیں ص: ۱۵۷)

حضرت امیر شریعتؒ ایک عہد، ایک انجمن اور ایک تاریخ تھے۔ بذلہ سخی، شعر گوئی، سخن فہمی اور حاضر جوابی میں ان کا مثیل ملنا مشکل ہے۔ وہ ایک فقیر،

درویش خدامست، ایک خطیب، ایک شاعر، ایک ادیب اور پیکرِ ظرافت تھے۔ جس تار کو بھی چھیڑا جاتا نغمے پھوٹتے۔ ان کی ذکاوت، ذہانت اور خوش طبعی کے تمام واقعات کو اگر مرتب کیا جائے تو ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے یہ تو صرف ایک نمونہ ہے اور بس۔



باب دہم

آخری ایام اور سفرِ آخرت

موت اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے جس کے سامنے ہر جاندار سر تسلیم خم کرتا ہے اور اس کے وارد ہونے پر احتجاج نہیں کرتا صرف فریاد کرتا ہے۔ فنا اس کائنات کی گھٹی میں ڈالی گئی ہے ہر چیز تیزی سے اپنی اس منزل کی طرف اپنے پاؤں پر چل کر خود جا رہی ہے۔ جہاں پہنچ کر اسے نابود ہو جانا ہے۔ انسان کی زندگی کا ہر قدم اپنے نشانِ فنا یعنی قبر کی طرف خود بخود بڑھتا رہتا ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں

یہ نکتہ میں نے سیکھا ہے بوالحسن سے

کہ جان مرتی نہیں مرگ بدن سے

انسان اپنے افکار و کردار کی روشنی میں زندہ رہتا ہے۔ حضرت امیر شریعتؒ کی

زندگی کے آخری ایام اور سفرِ آخرت کے مرحلے نذرِ قارئین ہیں۔

صحت کا گلہ کس سے کروں :

حیاتِ امیر شریعتؒ کے مؤلف جانباہ مرزا رقمطراز ہیں کہ امیر شریعتؒ خود

فرمایا کرتے تھے :

”انسان کے اندر ایک مستقل سلطنت آباد ہے، دل و دماغ اس کے بادشاہ اور وزیر ہیں، جب یہ دونوں اپنی رعایا کو تنگ کرتے ہیں تو آخر کو بغاوت کا احتمال تو ہوگا! یہی میں نے بھی کیا ہے، میں نے اپنے جسم پر کوئی رحم نہیں کھایا، رات دن کا سفر، مسلسل دس دس بیس بیس گھنٹے تقریریں، بے وقت کی خوراک، وہ بھی میزبان کی مرضی پر، یہاں سے فرصت ملی تو جیل خانہ، یہ کوئی سال دو سال کا عمل نہیں، بلکہ میری زندگی کے چالیس سال اس دشت کی سیاحی میں گزرے ہیں، ان حالات میں اپنی صحت کا گلہ میں کس سے کروں؟“

بیماری کا اثر زائل ہو گیا :

۱۶ نومبر ۱۹۵۴ء کو نمازِ عشاء کے لئے گھر میں وضو کر رہے تھے کہ دائیں جانب فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا، ذیابیطس کی شکایت پیشتر سے چلی آرہی تھی۔ فالج کے اس حملے نے اس بیماری کو بھی تو انانی دیدی۔ حضرت امیر شریعتؒ کا اپنا بیان ہے کہ :

”جب مجھ پر فالج کا حملہ ہوا تو تمام جسم بیکار معلوم ہونے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اب موت کا وقت قریب آ گیا ہے، چنانچہ میں نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور چار پائی پر جا کر لیٹ گیا، لیکن تھوڑی دیر بعد بیماری کا اثر زائل ہو گیا۔“

پھر بے اختیار آپ رونے لگ پڑے اور خوب روئے۔ اس دوران حضور

خاتم الانبیاء ﷺ کی یاد ذہن میں آئی اور یہ شعر بار بار پڑھتے رہے.....

اس وقت تیرا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جب تو نے یہ مئے ساقی شیشے میں بھری ہوگی

حضور ﷺ کی خواب میں زیارت :

لاہور میں علاج سے مایوس ہو کر ملتان واپسی پر حکیم حنیف اللہ کے زیر علاج رہے۔ حکیم حنیف اللہ قرآن کریم اور دوسرے دینی علوم کے سند یافتہ ہیں۔ گھر کے قریب ہونے کی وجہ سے بھی ان سے قرابت زیادہ رہی۔ شب و روز انہی کے بیٹھک میں مجلس رہتی۔

حکیم حنیف اللہ کا کہنا ہے کہ شاہ جی کی بیماری اس قدر جڑ پکڑ چکی تھی کہ اس کے لئے قیمتی دواؤں کی ضرورت تھی، جس کا میں متحمل نہیں تھا۔ شاہ جی سے اس کے پیسے مانگتے ہوئے بھی عار محسوس ہوتی۔ اسی پریشانی میں تھا کہ ایک رات خواب میں حضور سرور کائنات ﷺ کی زیارت ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کے ایک جانب شاہ جی اور دوسری طرف ایک برقعہ پوش عورت بیٹھی ہے۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اس خواب کی تعبیر تلاش کرنے لگا۔ مجھے اس فن پر ملکہ ہے۔

پریشانی اس پر تھی کہ خاتم الانبیاء ﷺ کے دربار میں عورت کون ہو سکتی ہے؟ آخر تعبیر سے پتہ چلا کہ برقعہ پوش عورت شاہ جی کی بیوی تھی۔

اس پر میں نے اندازہ لگایا کہ ایک تو شاہ جی کا خاندان (میاں بیوی) عالی نسب سید ہیں۔ دوسرا یہ مجھے علاج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد میں نے بلا جھجک شاہ جی کا علاج کیا اور قیمتی سے قیمتی دوائیاں استعمال کرائیں۔

میری محفلیں اجر گئی ہیں :

حضرت امیر شریعت اپنے پیچھے جن راہوں کو چھوڑ کر آئے تھے، اُن کے ایک ایک موڑ پر آرزوں کے ہزاروں ہجوم ان کے ساتھ تھے، لیکن جس موڑ پر وہ آج کھڑے ہیں وہاں تمناؤں کے جنازے اٹھتے نظر آرہے تھے۔ مایوسیوں اور نامراد یوں نے انہیں اس بازار کی بیکار جنس بنا دیا تھا، جس کا اقرار وہ خود اپنے معالج کے سامنے کرتے ہیں۔

”حکیم صاحب! میں فالج اور زیا بیطس کا مریض نہیں ہوں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ میری محفلیں اجر گئی ہیں۔ دیکھئے شادِ عظیم آبادی کیا کہہ گئے ہیں.....“

کانٹوں میں گھرا ہوا ہے چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

گھر میں خوب صورت تحریریں :

ملکی حالات، حکمران طبقہ سے مایوسی، دوستوں کی بے وفائی، بیماری اور بڑھاپا، ان تمام کے پیش نظر امیر شریعت نے اپنی انجمن اپنے گھر سجالی تھی، اور حسب ذیل تحریریں اس کی محفل میں نمایاں نظر آتی تھیں۔

(۱) حدیث رسول کریم ﷺ قال : قال رسول الله ﷺ إِذَا وَسَدَّ

الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ۔ (رواہ البخاری)

(ترجمہ) جب حکومت نا اہل لوگوں کے سپرد ہو تو قیامت کا انتظار کر۔

(۲) ہیروارث شاہ کے چند اشعار (پنجابی)

(۱) بھو کے آدمی کو چینی اور کھیر کی رکھوالی دے دی، اور جس کی اپنی بیوی فوت ہو چکی تھی اس کو رشتہ ناطہ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔

(۲) جسے زہر کے علاج کے لئے لائے تھے وہ خود زہر ثابت ہوا، گویا یہ کام انہوں نے اپنے ہاتھ سے کیا۔

(۳) اپنے گھر کی بربادی کے لئے انتظام آپ کیا۔

(۴) کیڑے مکوڑوں کے پاس سرسوں کا ڈھیر رکھ دیا اور مرغیوں کے سامنے دانے خشک کرنے کے لئے ڈال دیے۔

(۵) گیدڑ کو خر بوزوں پر نگہبان کر دیا اور اونٹ کو کہا کہ تو باغ لگانے جا۔

(۶) کاغذ کی بیڑی بنا کر بندر کو ملاح بنا دیا اور اندھے سے کہا کہ تم جاؤ اسے کنارے پر چھوڑ آؤ۔

(۷) خزانے کی نگہداری کے لئے چور کو مقرر کیا اور چور ہی سے کہا کہ تم چور کی تلاش کرو۔

(۸) دھان کے ڈھیر پر گدھے کو رکھوا لا کر دیا اور نابینے کو خط لکھوانے بھیجا۔

وارث شاہ نے یہ بات خدا جانے اپنے دور کے حاکموں سے کہی ہو یا نہ، لیکن امیر شریعت نے وارث شاہ کے اشعار سے اپنے دور کے حاکموں پر ایسی پھبتی کسی کہ امیر شریعت کی ذہانت کی داد دے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ انہوں نے وارث شاہ کے اشعار کو کیسے وقت پر استعمال کیا جب کہ پاکستان کے حکمران جوتیوں میں دال بانٹ رہے تھے اور اپنے اقتدار کی کرسیوں کے لئے وطن عزیز کو رسوا کر رہے تھے۔

جب کوئی دوست گھر آ کر پاکستان کے موجودہ حالات پوچھتا تو

امیر شریعتؒ ان تحریروں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے۔ ”بھائی! یہ پڑھ لو..... بس یہی کچھ ہو رہا ہے“۔ (حیات امیر شریعت ص: ۴۲۴)

دعائے صحت کے لئے :

۱۹۶۰ء میں امیر شریعتؒ کے معالج حکیم حنیف اللہ نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا، اور اس کے لئے درخواست دی۔ امیر شریعتؒ کو جب اس کا علم ہوا تو حکیم صاحب سے کہا :

”جب آپ حضور سرور کائنات ﷺ کے روضہ اطہر پر حاضر ہوں تو میرا سلام عرض کریں اور میری صحت کے لئے دعا کی درخواست کریں“۔

حکیم حنیف اللہ اس پر خاموش رہے، لیکن امیر شریعتؒ نے انہی دنوں ان کے والد حکیم عطاء اللہ خاں سے اس بات کا ذکر کیا، تو بڑے حکیم صاحب نے کہا :

”شاہ جی! گزشتہ دنوں میں نے آپ کی یہ درخواست خاتم الانبیاء ﷺ کی خدمت میں پیش کر دی ہے“۔

امیر شریعتؒ: (تعجب سے) ”وہ کیسے“۔

حکیم صاحب: ”مجھے پچھلے دنوں حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ سرور کائنات ﷺ کے گرد ایک حلقہ بیٹھا ہے، میں بھی اس میں شامل ہوں۔ میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔ ”سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی صحت کے لئے دعا فرمائیں“۔ مگر حضور ﷺ نے دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھائے، بلکہ ایک کاغذ کی طرف اشارہ کیا، جس پر لفظ ”صحت“ لکھا تھا“۔

امیر شریعت یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور حکیم حنیف اللہ سے آکر کہا :
 ”آپ نے تو میری درخواست حضور ﷺ کی خدمت میں لے جانے کی
 حامی نہیں بھری تھی، مگر بڑے حکیم صاحب نے یہ کام کر بھی دیا۔“
 یہ کہہ کر تمام واقعہ بیان کر دیا۔

والد صاحب کا خواب سن کر حکیم حنیف اللہ نے اس کا ذکر اپنے استاد حضرت
 مولانا عبدالرؤف صاحب سے کیا، جس سے انہوں نے حدیث اور فقہ پڑھی تھی۔
 انہوں نے فرمایا :

”اس خواب کی یہ تعبیر نہیں جو شاہ جی سمجھے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ شاہ جی
 کو روحانی صحت ہوگی یعنی ان کے وصال کا وقت قریب آ گیا ہے،
 لیکن مصلحتاً امیر شریعتؒ کو یہ تعبیر نہیں بتائی گئی تھی۔“

(حیات امیر شریعت ص: ۴۴۱)

زندگی کے آخری سانس گن رہا ہوں :

انہی دنوں روزنامہ ”امروز“ (ملتان) کے نامہ نگار نے امیر شریعت سے
 ملاقات کی، اس نے اپنے تاثرات یوں بیان کیے۔

”ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے، مجھ سے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
 پر ایک مصوّہ ریچر تیار کرنے کو کہا گیا۔ میں فوٹو گرافر کو لے کر محلہ ٹہنی شیر خان پہنچا۔ شاہ جی
 کا پتہ معلوم کیا۔ مسجد کے عقب میں ایک کچا سا مکان جس کے باہر لیٹر بکس لگا ہوا تھا۔
 گلی کی طرف کھلنے والے کمرہ میں شاہ جی موجود تھے، وہ ان دنوں بیمار تھے۔ خیر و عافیت
 پوچھ چکا تو اپنا مدعا بیان کیا۔ شاہ جی ٹال گئے، کہا کہ ”اب زندگی کے آخری سانس گن
 رہا ہوں، اب تو آرام کرنے دو۔ اخبار کے کالم بھرنے کے لئے میرے ماضی کے بچے

ادھیڑتے ہو۔ چند لمحے خاموش رہے، پھر کہا، ”ایک بات پوچھوں؟“ میں نے کہا ”ضرور ارشاد فرمائیے“ کہنے لگے، یہ جو چلی ہے اس کا بادشاہ شیخ چلی ہوگا۔ (ان دنوں چلی کی تباہی کے متعلق اخبارات میں خبریں آرہی تھیں) میں نے محسوس کیا کہ شاہ جی مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال رہے ہیں۔ اس پر میں نے انہیں پھر اپنے ڈھب کی بات کہہ دی، ”شاہ جی! آپ کب سے اس کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔“ فرمانے لگے ”۱۹۴۲ء میں یہاں آ گیا تھا، اب تک یہیں پڑا ہوں۔“ ”آپ نے کوئی مکان الاٹ نہیں کرایا؟ آپ کا کلیم (CLAIM) تو ہے۔“ جواب میں فرمایا۔ ”آپ مکان کی الاٹمنٹ کی بات کرتے ہیں، جانے قبر کے لئے چند گز زمین ملے گی یا نہیں؟ ایک دفعہ ایک مرکزی وزیر صاحب مجھ سے ملنے ملتان تشریف لائے، انہوں نے بھی فرمایا اگر میں انہیں کہوں تو وہ مجھے مکان الاٹ کرا دیں گے، اور ساتھ ہی یہ ارشاد بھی فرما گئے کہ فلاں تاریخ کو فلاں صاحب ملتان سے گزر رہے ہیں، ان سے مل لینا۔“ میں نے پوچھا ”پھر شاہ جی! آپ نے ان سے ملاقات کی؟“ کہا ”نہیں بابو میرے پاس کالی اچکن اور قراقلی ٹوپی نہیں تھی۔“

”شاہ جی! آپ کو ذیابیطس کی شکایت کب سے ہے۔“ جواب دیا۔ ”یہ مرض سکھر جیل میں میرے ساتھ آ لگا تھا، ابھی تک سنگت نبھا رہا ہے۔“

تماشائے اہل وفادیکھتے ہیں :

”ان دنوں جب کہ آپ اس قدر بیمار ہیں، اور پبلک لائف سے بھی ریٹائرڈ ہو چکے ہیں، کبھی دیرینہ رفقاء سے کوئی ملنے آیا؟“ جواب میں مسکرائے اور کہا۔ ”بیٹا! جب تک یہ کتیا (زبان) بھونکتی تھی، سارا برصغیر ہندوپاک ارادت مند تھا۔ اس نے

بھونکنا چھوڑ دیا ہے تو کسی کو پتہ ہی نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔ ہاں یارانِ دیرینہ میں سے ایک آدھ کو چھوڑ باقی میرے ہاں آ ہی جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایبٹ آباد سے ایک دوست ملنے آئے۔ انہوں نے ایبٹ آباد جانے پر اصرار کیا، میں نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”شاہ جی! آپ ان کے ہاں چلے جاتے، ایبٹ آباد صحت افزا مقام ہے۔ ملتان کی گرمی میں آپ کیوں تڑپ رہے ہیں؟“ جواب دیا۔ ”بیٹا! اب عمر کی اس سطح پر آ گیا ہوں کہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کتنے لوگ میرے ہاں آتے ہیں، ساری عمر لوگوں کی مہمانی میں گذاری۔ اب میزبان بن کر بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اخبار والوں سے شکایت :

میں نے دیکھا کہ شاہ جی اب کھلنے لگے ہیں۔ چنانچہ کاغذ پنسل سنبھال لی، تاکہ یادداشت کے لئے کچھ لکھ لوں۔ شاہ جی نے میری تیاری دیکھی تو انہوں نے بات روک لی۔ میں نے ایک اور سوال کر دیا۔ جواب میں کہا، ”اخبار والوں سے ڈر لگتا ہے۔ آپ لوگ اکثر واقعات مسخ کر دیتے ہیں۔ پھر غلط بیان دوسرے سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کا ایک واقعہ بھی سنایا۔ یعنی ایک دفعہ سالک مرحوم نے یو۔ پی کے ایک جلسے کی تقریر میرے نام سے منسوب کر کے اپنے اخبار ”انقلاب“ میں چھاپ دی۔ حالانکہ میں نے یو۔ پی میں کوئی ایسی تقریر نہیں کی تھی۔ جب ان سے اس غلط تقریر کی شکایت کی تو انہوں نے خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ اس پر میں نے ۲۵ سال تک سالک صاحب سے بات نہیں کی۔“

یارانِ کہن کی یادیں :

ایک دن صوفی تبسم مجھے پطرس بخاری کے ہاں دعوت پر لے گئے۔ پطرس

نے مجھے مدعو کیا تھا۔ اس دعوت میں سالک بھی شریک تھے، وہاں ہم دونوں کی صلح کرائی گئی۔ سالک نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”آپ نے میرے پچیس برس تباہ کر کے رکھ دیے ہیں۔“

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے شاہ جی کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ ایک لمبی سانس لی پھر کہا :

”سب یارانِ کہن بچھڑتے جاتے ہیں، ایک دن میں بھی ان میں جا ملوں گا۔“

پطرس بخاری کے مکان پر ہم چاروں ساتھی ماضی کے افسانے دہرا رہے تھے۔ نماز کا وقت ہو گیا تو میں نے پطرس سے کہا۔ ”آپ سید ہیں۔ قرآن پاک آپ کے گھر میں اترا، آپ بھی نماز نہ پڑھیں تو کتنی بری بات ہے۔“ پطرس نے سن کر سالک مرحوم کو آواز دی۔ ”سالک! اٹھو! شاہ جی ہمیں زبردستی جنت میں لے جائیں گے۔“

شاہ جی بیٹھے بیٹھے تھک گئے۔ یوں بھی دن کے گیارہ بج چکے تھے، اٹھے اور

یہ شعر پڑھا.....

پرانی صحبتیں یاد آرہی ہیں

چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

اور پھر اندر چلے گئے۔ اس ملاقات کے بعد مجھے شاہ جی سے باتیں کرنے کا چسکا پڑ گیا۔ اب میں تقریباً ہفتہ میں ایک بار ضرور شاہ جی سے ملنے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ہر ملاقات میں شاہ جی سے میں نے اخبار کے رپورٹرز کی حیثیت سے سوال پوچھے۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد میں نے ایک مختصر فیچر لکھ مارا۔ جب وہ شائع ہوا، تو کچھ خالوں نے اسے مسخ کر کے اپنے اخبار میں نقل کیا۔ اس فیچر میں راقم نے اپنے ان

جذبات کا اظہار کیا تھا۔

جس مجاہد اور خطیب اعظم نے ملک کی آزادی کے لئے اتنی لمبی عمر انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی، اور ساتھ ساتھ دین کی خدمت بھی کی، وہ کرائے کے مکان میں رہ رہا ہے۔ حکومت اور سوسائٹی نے ان کی خدمات کی قدر نہیں کی۔ شاہ جی ناراض ہو گئے۔ بہر کیف ان کی ناراضگی عارضی تھی۔ ایک دن فرمانے لگے ”بیٹا! میں اپنوں سے ناراض ہوتا ہوں، تمہاری نیت پر شک نہیں کرتا، تم نے تو میرے حق میں اچھا نہیں کیا۔“ میں نے دیکھا کہ شاہ جی نے مجھے معاف کر دیا تو ملاقاتوں کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک دن خود ہی فرمانے لگے۔

چائے کے رسیا :

ایک دفعہ دہلی جیل میں مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر انصاری اور میں اکٹھے ہو گئے۔ مولانا آزاد چائے کے بڑے رسیا تھے۔ ایک صبح بڑے اہتمام سے چائے تیار کر کے مجھے پلائی۔ میں چائے پی چکا، تو مولانا نے داد طلب نظروں سے پوچھا۔ ”شاہ جی چائے کیسے بنی؟“ میں نے کہا۔ ”حضرت ایک کمی رہ گئی۔“ مولانا ایسے بھنائے جیسے دماغ پر بجلی گری ہو۔ پوچھا ”وہ کیا میرے بھائی؟“ میں نے کہا۔ ”اس میں دو ہتھی زعفران کی بھی ہونی چاہیے تھی۔“ ”ہاں میرے بھائی! آپ تو اضافے کی بات کرتے ہیں۔ اچھا میرے بھائی! کل آپ کو زعفران پلاؤں گا۔“ پتہ پتہ دوسرے روز مولانا نے جیل کے ایک ملازم کو پانچ روپے دیکر زعفران منگوایا اور مجھے زعفران پلائی۔

عمر تھوڑی مگر قرینے کی ہو :

ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمن کے ہمراہ مولانا آزاد سے ملنے گیا۔ استفادہ کے لئے چند آیات تفسیر کے لئے پیش کیں۔ مولانا نے اپنے انداز میں ان کی تفسیر بیان کی۔ ہم بہت متاثر ہوئے، تو میں نے کہا۔ ”مولانا! خدا آپ کو بہت عمر نصیب کرے“۔ مولانا نے کہا ”نہیں میرے بھائی! تھوڑی ہو مگر قرینے کی ہو“۔

شبِ وصال بہت کم ہے :

ایک دفعہ میں میرٹھ کے جلسے میں تقریر کر رہا تھا۔ پر شوتم داس ٹنڈن صدر کانگریس بھی جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”شاہ جی! تلاوت قرآن پاک کریں تاکہ آتما کو سکون ہو“۔ پھر میں نے اس جلسے میں ساڑھے آٹھ گھنٹے تقریر کی۔ صبح آگئی تو یہ شعر پڑھ کر سٹیج سے اتر آیا.....

شب وصال بہت کم ہے آسمان سے کہو

کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

استبداد کی چکی :

ایک دفعہ میں نے لاہور موچی دروازہ کے باہر تقریر کرتے ہوئے کہا ”میں حکومت سے کہتا ہوں کہ وہ مفلسی اور بیکاری کے مسئلے کو حل کرے، جو حکومتیں اس مسئلہ کو حل نہیں کرتیں، یہ مسئلہ ان حکومتوں کو حل کر دیا کرتا ہے“۔ اس تقریر میں یہ بھی کہا کہ ”استبداد کی چکی کا دستہ گورے کے ہاتھ میں ہو یا کالے کے ہاتھ میں، چکی وہی رہتی ہے، اور میں اس چکی کو توڑ دینا چاہتا ہوں“۔

وراثت کا مسئلہ اور ہندوؤں میں کھلبلی :

۱۹۳۱ء میں، میں نے مسئلہ میراث پر ملک بھر میں تقریریں کیں، جن کا رد عمل یہ ہوا کہ آریہ سماج و چھو والی شاہ عالم لاہور میں ہندوؤں کے ایک اجتماع میں کماری ودیاوتی نے کھڑے ہو کر وراثت کا مطالبہ کر دیا۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج کے پرنسپل جھبیل داس جلسے کے صدر تھے۔ کماری ودیاوتی نے کہا ”اگر آپ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو وراثت میں حصہ نہیں دینگے تو ہم مسلمان ہو جائیں گی۔“

اس پر صدر جلسہ نے کہا:

”ہمارے لئے یہ مشکل ہے کیونکہ ہم دور جا کر شادیاں کرتے ہیں۔ لہذا جائیداد منتقل نہیں ہو سکتی۔“ اس پر کماری ودیاوتی نے کہا۔ آپ جگر گوشہ کو بیاہ کر دور بھیج دیتے ہیں، لیکن زمین کے ٹکڑے نہیں منتقل کر سکتے۔“

میری ان تقریروں سے ہندوؤں میں کافی دیر کھلبلی رہی۔

(حیات امیر شریعت^۲ ص: ۲۳۲ تا ۲۳۷)

فانج کا دوسرا بڑا حملہ معالج سے گفتگو اور چہرے کی سُرخی :

۲ جنوری ۱۹۶۱ء کو فانج کا دوسرا بڑا حملہ ہوا، تو اس سے رہی سہی صحت بھی برباد ہو گئی۔ پیشتر کبھی کبھار اگر معالج کے مطب تک چلے بھی جاتے تھے، تو اس حملے نے وہ ہمت بھی چھین لی۔ اب تو گھر چار دیواری کے سوا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، معالج خود مریض کے ہاں آتے۔ ان دنوں امیر شریعت^۲ نے حکیم عطاء اللہ خاں سے کہا :

”آپ کے زیر علاج اس لئے نہیں ہوں کہ آپ بڑے قابل حکیم

ہیں، بلکہ اس لئے ہوں کہ آپ بہت نیک آدمی ہیں شاید آپ کی نیکی

کی وجہ سے میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔“

ایسا لگتا ہے کہ امیر شریعت اس حملے کے بعد اپنی روحانیت سے محسوس کر چکے تھے کہ آخری وقت آپہنچا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے ہر تیماردار سے کچھ عجیب سی گفتگو کرتے۔ مولانا یسین نے ایک دفعہ کہا۔ ”شاہ جی کی بیماری کے دنوں میں بھی چہرے کی سرخی نہیں گئی، ہلکی سی مسکراہٹ سے فرمایا :

”یہ سرخی تو میرے مرنے کے بعد بھی رہے گی۔ یہ ہمارے خاندان

کی ریت ہے کہ مرنے کے بعد بھی عارض کی سرخی نہیں جاتی۔“

فالج کا آخری حملہ یہ زبان بھی تیری نہیں :

۶ مارچ ۱۹۶۱ء کو فالج کا تیسرا شدید حملہ ہوا، جس کا اثر زبان اور گلے پر

پڑا۔ اس حملے نے تمام احباب کو پریشان کر دیا۔ اکثر شہروں میں تو امیر شریعتؒ کی موت کی خبر بھی مشہور ہو گئی۔ اخبارات کے دفاتر سے ٹیلیفون اور برقی پیغامات کے ذریعے اس خبر کی تحقیق دریافت ہونے لگی۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد طبیعت نے فوراً سنبھالا لیا تو احباب کو خیریت کی اطلاع دی گئی۔ لیکن اس حملے سے امیر شریعتؒ کی زبان گفتگو سے عاری ہو گئی، گلابند ہو چکا تھا، بڑی مشکل سے آواز سمجھ میں آتی تھی، وہ بھی کان منہ سے لگانے پر انہی دنوں لاہور سے دوسرے احباب کے علاوہ شیخ حسام الدین بیمار پرسی کے لئے ملتان آئے تو امیر شریعتؒ نے شیخ حسام الدین کے کان میں کہا:

”میری زندگی میں اللہ تعالیٰ نے مجھے بتا دیا کہ عطاء اللہ یہ زبان

بھی تیری نہیں ہے، میں جب چاہوں، اسے چھین سکتا ہوں۔“

(حیات امیر شریعتؒ، ص: ۴۴۵)

شاہ جی غیر مسلموں کی نظر میں :

اس حوالہ سے آندھرا پردیش بھارت کے گورنر لالا بھیم سین سچر کا خط قابل مطالعہ ہے جو حیاتِ امیر شریعتؒ کے مؤلف مرزا جانباز کے نام لکھا گیا ہے۔
 ”جہاں تک سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا تعلق ہے، وہ ان چند بے خوف شخصیتوں میں سے ہیں، جن کے لئے میرا دل بے پناہ احترام کے جذبات سے معمور رہا ہے۔

میں جب ان سے پہلی بار متعارف ہوا تھا تو میرا تاثر یہی تھا کہ شاہ جی شمعِ حریت کے سرفروش پروانے اور جدوجہدِ آزادی کے جانناز سپاہی ہیں۔ جرأتِ ذہانت اور تجربہ علمی کے ساتھ ساتھ خدا نے انہیں فصاحت و بلاغت کے نایاب جوہر سے بھی نوازا ہے۔

جب ہم ان کی تقاریر سنا کرتے تھے تو ہماری دلی آرزو ہوتی کہ شاہ صاحب موتی بکھیر رہے ہیں اور ہم قلب و نظر کو ان سے منور کرتے رہیں۔ وہ سامعین کو مسحور کرنا جانتے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی تقریر کب ختم ہو۔ کیونکہ نہ تو شاہ صاحب کے ہاں متنوع مضامین کی کمی ہوتی، اور نہ ان کی جسمانی تھکاوٹ ہی سلسلہٴ تقریر میں حائل ہوتی۔ شاہ جی جیسے بہادر انسان جو انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے حامل ہیں، ہمارے دلی احترام کے مستحق ہیں۔

نشر ہسپتال میں معالجہ کے مراحل :

دستِ فطرت انسان کو جب عقلِ کامل سے نواز کر کارگاہِ عالم میں چھوڑتا ہے تو آسمان سے زمین تک ہر شے اس کے قدموں میں ہوتی ہے، پھر کبھی تو انا ہو کر انسان

تا تو انوں کی بے بسی کا تماشا کرتا ہے اور کبھی خود اپنے زوال کی کہانی گلیوں کے موڑوں پر بیان کرتا پھرتا ہے۔ یہی قانون فطرت ہے۔ عروج و زوال کی اس داستان کا مصنف انسان خود ہی ہے۔

حضرت امیر شریعت تو انا تھے، جوانی اور صحت ان کی بلائیں لیتی، گلے کی حلاوت زبان کا طرز تکلم ہمیشہ ان کے غلام رہے۔ جب وہ غیر ملکی سلطنت کے ظلم و جور کی دھجیاں بکھیرتے اور بغاوت کا علم لے کر پہاڑوں کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دیتے، تو وہ پانی پانی ہو کر ان کے ساتھ بہہ نکلتے۔ سمندروں کو آواز دیتے تو ان کی گہرائیاں ابھر کر سامنے آ جاتیں۔ رات کی سیاہی اور دن کے اجالے انہیں اپنے جلو میں لے کر چلتے، جس کی ہیبت سے ایوان برطانیہ لرز جایا کرتے تھے، جب اس کا کام ختم ہو گیا اور اس کے عروج کی پرچھائیاں ڈھلنے لگیں تو فضا میں گنگنائیں.....

ڈوبتے سورج کو وقت شام دیکھ

حسن والے حسن کا انجام دیکھ

فالج کے آخری حملے نے ملک بھر میں تشویش پیدا کر دی اور احباب نے فیصلہ کیا کہ امیر شریعت کو نشتر ہسپتال میں داخل کرادیا جائے، لیکن امیر شریعت کو جب اس فیصلہ کا پتہ چلا تو فرمایا :

”آپ لوگ مجھے فاسق اور فاجروں کے ہاتھوں سوئپ رہے ہیں۔“

فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خان کی ڈاکٹروں کو خصوصی ہدایت :

وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے، مگر اس کے باوجود مارچ کے آخری دنوں انہیں

نشتر ہسپتال (ملتان) میں داخل کرادیا گیا۔ ڈاکٹروں نے اپنی ذمہ داریوں کو پوری

طرح نبھایا۔ انہی دنوں صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر عالمگیر کو ہدایت بھیجی کہ :

”حضرت شاہ صاحبؒ کی صحت کا خیال کریں، اور ان کے علاج پر پوری ذمہ داری سے توجہ دیں۔ اگر پاکستان کے باہر سے کسی معالج کی یادوا کی ضرورت ہو تو فوراً درآمد کریں۔ نیز اس کا بل میرے نام گورنمنٹ ہاؤس بھیج دیں۔“

امیر شریعتؒ کے دوسرے بڑے لڑکے سید عطاء الحسن کے علاوہ مولانا زین احمد خان (یہ مولانا گل شیر کے قریبی عزیز ہیں) اور ایک رضا کار غلام محمد دیکھ بھال کے لئے ان دنوں ہسپتال میں رہے، یہاں ہر روز مغربی پاکستان سے آنے والے تیمارداروں کا ہجوم رہتا۔

توحید کا تصور :

بیماری کے دنوں امیر شریعت اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی ہمیشہ کھڑی رکھتے۔ بعض دوستوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا :

”میں نے تمام عمر توحید پر وعظ کیا ہے، اور عمر کے آخری حصے میں بھی اس تصور کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔“

کلمہ شہادت اور لانبی بعدی کی حدیث :

ہسپتال میں امیر شریعت کی دیکھ بھال کے انچارج ڈاکٹر بشیر احمد نے ایک دن ایسا ٹیکہ لگا دیا، جس کے باعث نبضیں ڈوبنے لگیں، دل بیٹھنے لگا، بڑھتے بڑھتے یہ تکلیف اس حد تک بڑھی کہ امیر شریعت کو اپنی موت کا گمان ہونے لگا، اور انہوں نے اپنے خادم مولانا زین احمد خان سے فرمایا :

”اس ٹیکے سے میرا کام ہو چکا ہے، لہذا آپ گواہ رہیں۔ (یہ کہہ کر آپ نے تین دفعہ کلمہ شہادت، تین دفعہ لانی بعدی کی حدیث پڑھی، اور اس کا ترجمہ کیا) نیز فرمایا تمام دوستوں سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ دین کا کام بہر حال کرتے رہیں۔“

یہ تکلیف نماز عصر سے شروع ہو کر ساری رات رہی، لیکن ہسپتال کے انچارج کو اس واقعہ کی اطلاع رات ایک بجے دی گئی، جیسے ہی انہوں نے آکر امیر شریعتؒ کی حالت دیکھی کہ چہرے کا رنگ بدل چکا ہے اور پاؤں پر ورم آ گیا ہے تو انہوں نے زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا، اور غصے میں کہا جب یہ حالت تھی تو مجھے کیوں اطلاع نہ دی، اس پر دونوں ڈاکٹروں کے درمیان انگریزی میں کافی دیر تلخ کلامی رہی، جس کا مفہوم یہ تھا کہ امیر شریعتؒ کو یہ ٹیکہ کیوں لگایا گیا؟ آخر رات آڑھائی بجے دوسرا ٹیکہ لگایا تو صبح ہونے تک طبیعت سنبھلی۔

بخاریؒ ابھی زندہ ہے :

کچھ دنوں بعد ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ شاہ جی تھوڑی دیر کے لئے اپنے کمرے سے باہر تفریح کیا کریں، اس ہدایت پر بڑی مشکل سے آمادہ ہوئے، حالانکہ چل نہیں سکتے تھے، لیکن جیسے ہی صحن میں ٹہلنے لگے۔ گردن اونچی کر لی اور چھاتی تان کر فرمایا۔ ”عمر بھر دشمنوں کے سامنے سر اونچا کر کے چلتا رہا ہوں لیکن آج اگر دشمنوں کو پتہ چل گیا کہ میں بیماری کے باعث کمزور ہو گیا ہوں، تو وہ خوش ہوں گے، اس لئے نقاہت کے باوجود میں چھاتی تان کر رکھنا چاہتا ہوں تاکہ دشمن سمجھے کہ بخاریؒ ابھی زندہ ہے۔“

”ہسپتال میں بعض اوقات کافی دیر تک بے ہوشی رہتی، لیکن تیمارداروں اور

خادموں کو تاکید کی تھی، کہ مجھے نماز کا وقت اور رخ بتا دیا کریں۔“

ذیابیطس کی وجہ سے کثرت بول کا عارضہ تھا، مگر اس کے باوجود وضو کر کے نماز پڑھتے رہے یا پھر کبھی کبھار تیمم کر لیتے، مگر نماز نہیں چھوڑی۔ البتہ خادموں کو رکعتیں بتانی پڑتی تھیں۔

ایک صدمہ :

ہسپتال میں مولانا یسین صاحب نے سوال کیا۔ ”شاہ جی! حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی عمر اس وقت اسی نوے سال کے قریب ہے اور حضرت لاہوریؒ کی عمر بھی آپ سے زیادہ ہے، لیکن آپ بہت جلد کمزور ہو گئے ہیں۔ جواب میں فرمایا:

”بھائی! ان لوگوں کے گھر آباد ہیں اور میں اپنا گھر اجڑا ہوا دیکھ رہا ہوں، یہی صدمہ مجھے موت کے قریب کر رہا ہے۔“

اپریل کے آخری دن تھے کہ سید سبط حسن (سابق ایڈیٹر ہفت روزہ لیل و نہار لاہور) بمعہ چند احباب عیادت کے لئے ہسپتال آئے۔ تعارف کے بعد ایک نوجوان نے کہا۔ ”شاہ جی! میرا نام ذوالفقار علی ہے اور میں پطرس بخاری کا بھائی ہوں۔ امیر شریعتؒ یہ نام سنتے ہی بے اختیار رونے لگے، اور اس قدر روئے کہ تمام محفل ان کے ساتھ رونے لگ پڑی۔ سید سبط حسن کی بیوی نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بھی امیر شریعتؒ کے کسی دوست کی لڑکی نکلی، اس پر وہ بچی بے اختیار امیر شریعت سے لپٹ گئی۔ آخر یہ محفل شعر و شاعری میں منتقل ہو گئی۔

مارچ کے کچھ دن سے مئی کا ابتدائی حصہ گزار کر امیر شریعتؒ نشر ہسپتال

سے واپس گھر آ گئے، لیکن بیماری سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ (حیات امیر شریعت ص: ۲۳۶ تا ۲۵۱)

دُعائے صحت کا اہتمام :

نشر ہسپتال سے واپسی کے بعد ملک بھر میں مایوسی پھیل گئی۔ دلوں میں کئی قسم کے وسوسے ابھرے، برصغیر کا عظیم خطیب کروڑوں انسانوں کے دلوں کا حکمران زندگی کے اس موڑ پر آن پہنچا، جہاں زندگی مستعار ملتی ہے، لیکن موت سے کوئی سودا نہیں کیا جاسکتا۔ اس مقام پر پاکستان کے اخبارات نے امیر شریعت کی صحت پر عوام اور حکومت دونوں کو متوجہ کیا۔ مساجد میں دعائیں مانگی گئیں۔ بھارت کے مسلمانوں نے بھی امیر شریعت کی صحت کے لئے دعائیں مانگی۔ ان دنوں کے دو تین اخبارات کے اقتباس حسب ذیل ہیں۔

ہفت روزہ المنبہ فیصل آباد :

”بہر نواستخلاص وطن کے عظیم کارنامے کی انجام دہی سے عہدہ برآ ہونے والوں میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک ممتاز مقام کے حامل خطیب ہیں۔ ان کی سیاست اور ان کے کام میں غلطیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہیں۔ اور پھر انبیاء کے سوا کون ہے جو غلطیوں سے مبرا ہو؟ لیکن شاہ جی کی جرأت، قربانی، ایثار اور اسلام دوستی سے انکار ممکن نہیں اور ان کی ساحرانہ خطابت نے باطل کے خلاف لڑنے کا جو ولولہ ملت اسلامیہ میں پیدا کیا، اس کی قدر افزائی شرط نجات کے مترادف ہے۔

برصغیر کے یہ خطیب ایک عرصے سے علیل ہیں۔ مرض بھی ایسا ہے جو اعضاء ہی کو شل نہیں کرتا، اعصاب، ذہن اور دل کو بھی ماؤف کر سکتا ہے۔ پچھلے دنوں سے مرض میں شدید اضافہ ہوا ہے، ہم سب کو اپنے خالق حقیقی سے اس عظیم انسان کی زندگی

کی بھیک مانگنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمر خضر عطا فرمائے۔“ (ہفت روزہ ”المنبر“ لائل پور)

روزنامہ امروز لاہور :

یہ خبر کئی ماہ سے عوامی حلقوں کی پریشانی کا موجب بنی ہوئی ہے کہ امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب سخت بیمار ہیں ان کی زبان میں جس کی سحر طرازی کی کبھی زمانے میں دھوم مچی تھی، لکننت پیدا ہو چکی ہے، اور ایسا لگتا ہے جیسے خدا نخواستہ یہ چراغ آخر شب میں چند لمحوں کا مہمان ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے سیاسی نظریات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن اتنی بات تو ان کے دشمن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ان کی ذات جدوجہد آزادی کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، انہوں نے اپنے طرز فکر کے مطابق ملک کو آزاد کرانے کے لئے ایک عمر قید و بند میں بسر کی، اور اس راستے میں ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ قادیانیت کے خلاف ان کا جہاد باللسان تو بالخصوص امت پر ایک عظیم احسان ہے، ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ پاکستانی قوم کا فرض ہے کہ وہ بیماری کے زمانے میں اس بطل جلیل کے علاج معالجے کے لئے ہر طرح کے ذرائع اور وسائل فراہم کرے، بعد میں کف افسوس ملنے سے کیا فائدہ؟ اب وقت ہے کہ حکومت اور شاہ جی کے معتقدین اور ملک کے عوامی حلقے اپنا فرض ادا کریں.....

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لئے

(روزنامہ ”امروز“ لاہور)

روزنامہ ”انجام“ کراچی :

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی علالت کے تازہ حالات نے جذبات کی دنیا میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے، ان پر فالج کا ایسا حملہ ہوا کہ ان کی قوت گویائی متاثر ہو چکی ہے۔ معاً یہ خیال ہوتا ہے کہ اس بلبل ہزار داستان کی یہ قوت تو سیاسی کشمکش نے پہلے ہی چھین لی تھی، یا دوسرے الفاظ میں مفلوج کر دی تھی۔

ہندوستان و پاکستان کے وہ بہترین خطیب ہیں۔ کاش زندگی میں پھر ان کی تقریر ہو اور اس میں کبھی زار و قطار روئیں اور کبھی بے اختیار ہنسیں۔

قرآن حکیم میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے۔ اے اللہ! میری زبان کھول دے، تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔

معلوم نہیں حضرت شاہ صاحب نے کبھی یہ دعا مانگی تھی یا نہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں یہ طاقت ضرور عطا فرمائی تھی کہ دشمنوں کا مجمع بھی تقریریں کر رام ہو جاتا تھا۔ پاک و ہند کی آزادی کے لئے ان کے طوفانی دورے اور ان کے خطیبانہ فتوحات تاریخ کے صفحات میں زریں حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔

کلام میں عجیب سحر تھا۔ جہاں چاہتے رلا دیتے، جہاں چاہتے ہنسا دیتے، بسا اوقات ان کی تقریر کا سلسلہ مؤذن کے نعرہ تکبیر پر ہی ختم ہوتا تھا۔ لیکن مجال ہے کہ ہزار ہا حاضرین میں سے کوئی اٹھ جائے یا اونگھ جائے۔

ایسا عدیم المثال خطیب پاکستان میں خاموش زندگی گزار رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہم جیسے عقیدت مندوں اور رفیقوں کے لئے یہی حقیقت کافی دردناک ہے کہ ان کے مرض میں کوئی افاقہ نہیں ہوا، اور وہ ہسپتال سے مایوس واپس

آئے ہیں۔

آؤ! ہم دل کی گہرائیوں سے دعا مانگیں کہ اے پروردگار! اپنے حبیب کے صدقے میں حضرت شاہ صاحب کو صحت عطا فرما، اور ہماری یہ حسرت پوری کر دے کہ ایک بار پھر ان کی خطابت سے ملت میں نئی زندگی آئے۔ (روزنامہ ”انجام“ کراچی)

پھر لاہور میں :

حالات سے پریشان ہو کر جون کے ابتدائی ہفتہ میں امیر شریعت کو پھر لاہور میں لایا گیا۔ اب کے وہ مالکان سلطان فونڈری کے ہاں، ماڈل ٹاؤن بلاک۔ بی کوٹھی نمبر ۷۶ میں ٹھہرائے گئے۔ لاہور میں ان کے علاج کے لئے دو الگ الگ بورڈ تجویز ہوئے۔ میڈیکل بورڈ ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ اور ڈاکٹر محمد یوسف پر مشتمل تھا، جب کہ اطباء کے بورڈ میں حسب ذیل لوگ شامل تھے، حکیم محمد حسن قرشی، حکیم نیر واسطی، حکیم نبی احمد سویدا، (پوتا حکیم اجمل خان) حکیم شیدائی اور حکیم محمد اسماعیل جگرانواں والے۔

یہ سب معالج مشورے سے علاج کرتے رہے، ان دنوں امیر شریعت کی تیمارداری کے لئے ان کا لڑکا سید عطاء الحسن پاس رہا، کبھی کبھار امیر شریعت کی حرم محترم اور دوسرے بچے بھی آتے رہے۔

امیر شریعت ۱۹۲۱ء میں پہلی دفعہ لاہور انجانے عالم دین کی حیثیت سے آئے تھے اور ۱۹۶۱ء میں جب آخری بار لاہور لائے گئے تو سارا لاہور ان کو دیکھنے اُٹھ آیا، اور کیوں نہ آتا جبکہ امیر شریعت نے لاہور کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ جوانی کی بہاروں سے موت کی پرچھائیں تک وہ انہی کے لئے سارا کچھ کہتے سنتے رہے۔ اہل

لاہور نے بھی امیر شریعت سے محبت، رفاقت اور عداوت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ بنا بریں امیر شریعت اہل لاہور کو کوفہ کہا کرتے تھے۔

ان دنوں ماڈل ٹاؤن کی اس کوٹھی میں عوام کے علاوہ سیاسی رہنماؤں، صحافیوں ادیبوں، شاعروں اور کاروباری لوگوں کی آمد آمد سے شب و روز ایک بھیڑ لگی رہتی۔ امیر شریعت سب کو جانتے تھے، لیکن بات نہیں کر سکتے تھے، لوگ آتے، دو منٹ چار پائی کے نزدیک کھڑے ہو کر زیارت کرتے اور چلے جاتے۔ فارسی کے مشہور شاعر علامہ محمد حسین عرشی امرتسری بھی انہی دنوں امیر شریعت کو ملنے آئے مگر حالات دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھے

برق و رعد آسودہ بستر شدہ
شعلہ جوالہ خاکستر شدہ

شدید علالت میں نماز کا اہتمام :

ان حالات میں بھی نماز سے غافل نہ رہتے۔ یہ ذات باری تعالیٰ کی ان پر خاص نوازش تھی۔ حالانکہ بول نہیں سکتے تھے، لیکن عین نماز کے وقت اگر کوئی آس پاس نہ بھی ہوتا تو کسی چیز سے زمین پر کھڑکا کر دیتے تھے۔ اس آواز سے اہل خانہ فوراً حاضر ہوتے تو امیر شریعت ہاتھ کے اشارے سے انہیں نماز کے لئے کہتے، اور نماز باجماعت ہوتی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ نماز کے دوران ان پر بے ہوشی طاری ہو جاتی اور ان کے صاحبزادے عطاء الحسن انہیں دوبارہ نماز لوٹانے کو کہتے۔

بے ہوشی کی نمازیں :

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ سرگودھا کے مولانا مفتی محمد شفیع، امیر شریعت سے

ملنے آئے، تو کوشی کے مالک مولانا محمد اکرم (مالک سلطان فونڈری نے مفتی صاحب سے) گزارش کی :

”حضرت! یہ فرمائیے کہ شاہ جی اس حالت میں نماز پڑھتے ہیں، اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ نماز میں بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ عزیزم عطاء الحسن شاہ جی پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنی نماز لوٹائیں۔“

اس پر مفتی صاحب نے فرمایا :

”نہ میرے عزیز! شاہ جی کی بے ہوشی کی نمازیں ہماری ہوش مندی کی نمازوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔“

اس کے بعد پھر کبھی انہیں نماز لوٹانے کو نہیں کہا گیا۔

یہ میرے اُستاد تھے :

مولانا خیر محمد جالندھری ملنے آئے تو دوران گفتگو ان کے منہ سے مولانا مفتی محمد حسن کی موت کی خبر نکل گئی، اور یہ بات امیر شریعت نے بھی سن لی! حالانکہ وہ کافی فاصلے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے، ان کو اشارے سے بلا یا، اور کاغذ پینسل مانگی، اس پر لکھا۔ ”یہ میرے استاد تھے“۔ اور پھر بے اختیار رونے لگ پڑے اور کافی دیر روتے رہے۔

اس طرح کے لیل و نہار میں قریباً ڈیڑھ ماہ لاہور میں گزار کر امیر شریعت کے حرم محترم کے ارشاد پر امیر شریعت کو جولائی کے آخری دنوں میں ملتان واپس لایا گیا، اور ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ کی تجویز کردہ ادویات کا استعمال ہوتا رہا، لیکن مرض مریض پر اس قدر غالب آچکا تھا کہ ڈاکٹروں اور حکماء کے تمام نسخے بیکار ہو گئے۔ اس طرح سے عقل

انسانی جب اپنی رائے پر مات کھا چکی تو قدرت کے فیصلے کا انتظار ہونے لگا۔

ماضی کی پچاس سالہ تاریخ کا معمار، افواج آزادی وطن کا سپہ سالار، جس کی گھن گرج میں شیروں کا سا وقار، گفتار میں بجلی کا سا کردار، ارادوں میں پہاڑوں کی سی پختگی، مقدروں میں سیاروں کا جلو اور جذبات میں سمندروں کے طوفان لے کر سلطنتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے والا آج چارپائی پر بے حس و حرکت پڑا اپنے خالق کے فیصلے کا منتظر ہے۔ (حیاتِ امیر شریعت ص: ۳۵۰ تا ۳۵۷)

انتقال :

لاہور سے ملتان پہنچنے کے پچیس (۲۵) روز بعد رات اڑھائی بجے اچانک طبیعت خراب ہو گئی اور سانس اکھڑنے لگی، بجلی شروع ہو گئی، گھر میں پریشانی بڑھی اور موت کے سائے ناچنے لگے، یہی منحوس خبر صبح گا ہی ملتان میں بھر میں لے اڑی کہ امیر شریعت انتقال کر گئے۔ تمام شہر آخری دیدار کو ان کے گھر آن پہنچا، لیکن ہنوز گل و بلبل کا رشتہ قائم تھا، اور امیر شریعت آخری سانس گن رہے تھے۔ حکیم عطاء اللہ خان اور ان کے بیٹے بھی اپنی آخری پونجی آزمانے آ موجود ہوئے، لیکن وہ بھی اپنے آنسوؤں میں الجھ کر رہ گئے۔ امیر شریعت اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھے اور سانس رک رک کر آرہی تھی، سورج غم آلود چہرے سے تمام دن اس ماتم میں شریک رہا، وہ اپنے ڈھلتے سائے کو کل کے ماتم میں شرکت کے لئے چھوڑ کر مغرب کی چادر میں جا چھپا۔ شفق نے لالہ و گل کا سال لباس پہن لیا۔ ۱۳۸۱ سن ہجری تھا، اگست ۱۹۶۱ء کی شدید گرمی برس رہی تھی۔ مؤذن مغرب کی اذان کے لئے اٹھا ہی تھا کہ چھنج کر پچپن منٹ پر برصغیر کا عظیم خطیب زندگی کے قریباً بہتر (۷۲) سال گزار کر اس جہان

فانی سے رخصت ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۷

ادا کر کے قرض اپنی خدمت کا
سحر دم وہ جاگا ہوا رات کا
ابد کے نگر کو روانہ ہوا
مکمل سفر کا فسانہ ہوا

موت کی خبر :

ریڈیو پاکستان نے یہ خبر رات پونے آٹھ بجے نشر کی۔ لیکن جہاں دل کی
تاریں پیوست تھیں، وہاں صبح سے اضطراب تھا، لاسکلی کی تصدیق نے دل کی دھڑکنوں
کی رفتار مزید تیز کر دی۔ عشاق، ہجوم در، ہجوم محبوب کے آخری دیدار کو آنسوؤں کا نذرانہ
لے کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ کراچی سے پشاور تک کے لوگ، قصبات سے
دیہات کے عوام جنازے میں شرکت کے لئے آن پہنچے۔

جنازہ :

۲۲ اگست نماز ظہر کے بعد امیر شریعت کا جنازہ اٹھانے کا اعلان تھا، اس دن
آفتاب اپنے ساتھ تاریخ کا ایسا المیہ لے کر طلوع ہوا، کہ نہ صرف سلطنتیں ہی اس کے غم
میں ڈوب گئیں، بلکہ جرات انسانی اور قوت ایمانی کا چراغ بھی ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔
اقلیم خطابت کا فرمانروا اپنی تمام رعنائیاں سمیٹ کر جہان بے مروت سے
رخ موڑ چکا تھا۔ وقت کے نشیب و فراز جس کے قدموں کی چاپ کے منتظر رہتے، آج
اس کی روح قریب کھڑی اپنے مہمانوں کی منتظر تھی۔ دھوپ کے سائے مکانوں کی

دیواروں سے اتر کر گلی اور بازاروں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔
کراچی سے پشاور تک کے لوگ ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کے
ذریعے جنازے میں شرکت کے لئے تیز رفتاری سے ملتان پہنچ رہے تھے۔ دیہاتیوں
کی ٹولیاں اپنے مرشد کے جنازے کے لئے پہنچ رہی تھیں۔ تانگے، لاریاں، سائیکل
بھی مصروف تھے، کہ ان پر انسانوں کا گلہ نہ رہ جائے کہ وہ وقت کے عظیم انسان کی
آخری رسم میں شامل نہ ہو سکے۔

نماز ظہر کے بعد جب اس مرد درویش کا جنازہ محلہ ٹبی شیر خاں سے اٹھایا
گیا، تو دو لاکھ انسانوں کا سمندر اس کے گرد ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جنازے کے ساتھ لمبے
لمبے بانس باندھ دیے گئے، تاکہ کوئی ہاتھ اس سعادت سے محروم نہ رہ جائے، تاہم
ہزاروں سوگواروں کو یہ شکایت رہی۔

جنازہ جیسے جیسے اپنی منزل کی طرف بڑھتا گیا، ہجوم در ہجوم لوگ اس میں
شامل ہوتے گئے۔ کچھری روڈ سے گزرتا ہوا یہ ماتمی جلوس چار بجے کے قریب ایمرن
کالج کی گراؤنڈ میں پہنچا اور جنازہ کی صفیں درست ہونے لگیں۔ تاریخ ماضی اپنی
شہادت لے کر آں پہنچی۔

حضرت امام ابوحنیفہ کی نماز جنازہ کے بعد اس کے دامن میں امیر شریعت کی
نماز جنازہ کا دوسرا واقعہ تھا۔ ورنہ اس سے پیشتر اس قدر ہجوم کسی درویش کے جنازہ میں
نہیں دیکھا گیا۔

نماز عصر سے ذرا پہلے حضرت امیر شریعت کی نماز جنازہ ان کے فرزند اکبر
سید عطاء المنعم شاہ بخاری نے پڑھائی۔

آخری آرام گاہ :

ملتان کو اس کے بڑھاپے نے اسے اپنی تاریخ کی یادداشتوں سے بھی محروم کر دیا ہے، ہاں اس قدر یاد پڑتا ہے کہ اس شہر کا تاریخی قلعہ جسے آج قاسم باغ کا نام دیا جا رہا ہے، صدیوں پیشتر راجہ داہر نے تعمیر کیا تھا، اور آج یہ قلعہ اہل ملتان کی عظیم تفریح گاہ ہے۔ دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے ہی جانتے ہیں کہ تاریخ کے اس بوسیدہ دامن پر کیا گزری اور کیا بتی.... کاش! گرتی ہوئی دیواروں کے منہ میں زبان ہوتی اور وہ چیخ چیخ کر اپنی بے بسی کا ماتم کرتیں، لیکن بے آسرا اور لاوارث عمارات اپنی غیرت اپنے معماروں کے ساتھ رخصت کر چکی ہیں، گو اس کے سینے پر حضرت پیر بہاول حق اور حضرت شاہ رکن عالم کے مزارات مرجع خلائق ہیں، مگر اس اندھیرنگری میں نیکی اپنا منہ چھپائے ایک طرف بیٹھ گئی تاکہ عارت گری کے اسباب مہیا کرنے میں زمانہ حجاب محسوس نہ کرے۔

اہل خانہ نے مزار کے لئے سرکار کی پیشکش ٹھکرا دی :

حضرت امیر شریعتؒ کی آخری آرام گاہ کا سوال جب احباب کے سامنے آیا تو کمشنر ملتان بی، اے، قریشی نے اطلاع دی کہ رات گورنر مغربی پاکستان نواب امیر محمد خان نے مجھے ہدایت کی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی تدفین کے لئے جو جگہ طلب کی جائے، اس سے انکار نہ کریں، اس پر احباب کی رائے ٹھہری کہ حضرت امیر شریعتؒ کی آخری آرام گاہ کے لئے قلعہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں اور اپنے اس فیصلے سے کمشنر ملتان کو آگاہ کر دیا، انہوں نے ایک گھنٹہ کے اندر اندر متعلقہ کاغذات مکمل کر کے ڈسٹرکٹ

مجسٹریٹ کے ہاتھ بھیج دیئے۔ البتہ ایک شرط عائد کر دی کہ حضرت شاہ صاحب کے علاوہ دوسری کوئی قبر نہیں بنے گی۔ مگر جیسے ہی حضرت امیر شریعت کے حرم محترم کو اس کی اطلاع ہوئی انہوں نے اس شرط کے علاوہ بھی امیر شریعت کو قلعہ میں دفن کرنے کی مخالفت کی نیز فرمایا :

”جو شخص عمر بھر حکومت کے کسی اعزاز کا احسان مند نہیں ہوا، اسے حکومت کی اجازت سے حاصل کردہ جگہ پر دفن کر کے اس کی روح کو صدمہ پہنچانا بہتر نہیں۔“

اللہ بنا پر نماز جنازہ سے فراغت کے بعد حضرت امیر شریعت کا جسد خاکی دولاکھ سے زائد انسانوں کے کندھوں پر اپنی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے بھاگری قبرستان کے ابتدائی کونے پر (میونسپل کمیٹی کے دیے ہوئے وسیع خطہ اراضی کو امیر شریعت کا خاندانی قبرستان قرار دے کر) سورج کی آخری کرنوں کے دیکھتے دیکھتے لاکھوں انسانوں کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی سینکڑوں من مٹی تلے لحد میں اتار دیا گیا۔

محمدؐ کی سیرت کا پیغامبر
خدا کے سندیے سناتا ہوا
بڑی منزلیں طے کر لیے علم کی
بڑی دیر چلتا چلاتا ہوا
نہایت اہم سوچ میں کھو گیا
گھڑی دو گھڑی کے لئے سو گیا
(عدم)

مغل فرمان رواؤں کے زوال کے ساتھ ۱۶۰۸ء کو جب ہندوستان کے تخت پر فرنگی عروج انگڑائیاں لینے لگا، اور آہستہ آہستہ یہ سورج وقت کے تمام ستاروں کو مات دے کر اپنی چمک کے سنگھاسن پر آبیٹھا تو شیخ و برہمن کی تسبیح کے تمام دانے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آن گئے۔ ہندوستان کا تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرے کی چمک دونوں غلامی کی زنجیر میں جکڑے گئے۔ یونین جیک کی اڑانیں لال قلعے کی چھت پر چڑھ کر گنگا و جمنہ کے پوتر پانیوں میں زہر گھولنے لگیں، مسجد کی اذانیں کلیساؤں کی آواز میں دب کر رہ گئیں۔ ایوان فرنگی کا ایک ایک قانون حجازی قافلے کے نقش پا پر اپنی نئی عمارت استوار کرنے لگا تو ایمان کی ایک نگاہ اٹھی، جس نے خون جگر کی آمیزش سے اس قدر آنسو بہائے کہ سارا ہندوستان رو پڑا، یہ آنسو حضرت شاہ ولی اللہ کے آنسو تھے۔ انہی آنسوؤں سے پھر ۱۸۵۷ء کے بعد کبھی شیخ الہند محمود حسن نے جنم لیا، اور کبھی قاسم نانوتوی کی پیدائش ہوئی۔ عبید اللہ سندھی اور حسین احمد مدنی بھی اسی کوکھ کے لعل تھے۔ محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان، مفتی کفایت اللہ اور احمد سعید بھی اس قافلے میں شامل ہوتے ہو گئے، تا آنکہ اس زنجیر کی آخری کڑی حضرت امیر شریعت (سید عطاء اللہ شاہ بخاری) تھے۔ یہ زنجیر ایک ایک کڑی سمیت ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء شام چھ بج کر پچپن منٹ کو اپنی تاریخ کھل کر گئی..... ع

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

(حیات امیر شریعت ص: ۴۵۰ تا ۴۶۰)

مجدوب کی دعا :

مقدمہ گورداسپور کی مصروفیت کے باوجود امیر شریعت اپنے مشن کے لئے

رواں دواں رہے۔ ۱۹۳۳ء کا سال آخری دموں پر تھا کہ معراج النبی ﷺ کے موقع پر امیر شریعت کو ملتان جانا پڑا۔ جلسے کی حاضری تا حد نظر تھی اور اس پر خاموشی کا یہ عالم، جیسے انسانی سروں پر پرندے بیٹھ رہے ہوں۔ رات کے اس سکوت کو صرف امیر شریعتؒ کی آواز توڑ رہی تھی۔ واقعہ معراج النبی کا ذکر کرتے ہوئے اسے تمثیلی انداز میں پیش کیا۔ اور حاضرین کی محویت کا یہ عالم تھا کہ وہ محسوس کرنے لگے جیسے حضور نبی ﷺ کی سواری ان کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ عین ایسے وقت پر مجمع سے ایک مجذوب اٹھا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اس نے ملتانی زبان میں کہا۔

”سیدا! شالا اتھائیں دفن تھیویں“ (اے سید! خدا کرے آپ یہیں (ملتان میں) دفن ہوں)

شاید یہ قبولیت کا وقت تھا کہ دل سے نکلی ہوئی بات حقیقت بن کر رہی۔



باب یازدہم

خوان زعفران

علی گڑھ میں خطاب، مسئلہ ختم نبوت کی دلچسپ تمثیل :

عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، خوب رو خوش گلو، خطابت کی ہر رمز کے شناسا، سٹیج پر آتے تو آنکھوں کو بھلے لگتے، بولتے تو فرودس گوش اور تقریر جیسے جیسے بڑھتی دماغ دل کے حق میں دست بردار ہو جاتا اور دل شاہ صاحبؒ کی انگلیوں میں ہوتا۔ شاہ صاحبؒ نے یونین ہال میں ایک معرکہ آراء تقریر میں **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** کی تفسیر بیان کی۔ یونین کے صدر کو گمان گزرا کہ تقریر شائد فرقہ وارانہ ہو جائے گی۔

چنانچہ انہوں نے شاہ صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ فرقہ وارانہ تقریر یونین کے قواعد کی رو سے ممنوع ہے، شاہ صاحبؒ نے اطمینان دلایا کہ یونین کی ہر روایت کی پاسداری کی جائے گی۔

تقریر شروع ہوئی اس حال میں کہ اسٹیج پر دیگر حضرات کے علاوہ رشید احمد صدیقی جیسے بذلہ سنج اور شہستہ مذاق اور ہادی حسن جیسے سحر بیان بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ

صاحبؒ جب ظرافت پر آتے تو رشید احمد ہنسی ضبط نہ کر سکتے اور جب خطابت کی بلند یوں کی چھوتے تو ہادی حسن جھوم جھوم جاتے، اُن کی تقریر کا نقطہ عروج وہ سین تھا جب اُنہوں نے اپنے رومال کی جھولی بنا کے آگے بیٹھے ہوئے بچوں سے کہا کہ آؤ بچو مٹھائی لیتے جاؤ، ایک ایک بچہ آگے بڑھتا، شاہ صاحبؒ اُس کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتے۔ جب آخری بچہ آیا تو اُس کی جھولی میں سب کچھ اُلٹ دیا اور جب اس کے بعد بھی ایک بچہ اچانک اُٹھ بیٹھا تو شاہ صاحبؒ نے اپنا خالی رومال ہوا میں لہرا کے وجد آفرین قرأت میں اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا اعلان کر دیا۔ یہ آیت اس سوز اور حتمیت سے پڑھی کہ پورا ہال تحسین کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ اقبالؒ کے مصرعہ ”داد مارا آخریں جامے کہ داشت“ کو یوں حقیقت کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے آنکھوں نے اُس روز دیکھا۔ شاہ صاحبؒ کو زبان پر جو عبور حاصل تھا اس پر اُنہوں نے اپنے فخر کا دلی اور لکھنؤ والوں کو خطاب کر کے اظہار یہ کہہ کر ”برس دن کے بعد اردو میں تقریر کر رہا ہوں، کہیں زبان کی غلطی کر جاؤں تو ٹوک دینا“۔

میں تقریر سن رہا تھا اور میرے ذہن میں شاہ صاحبؒ کی ایک اور ہی تصویر ابھر رہی تھی، چونڈے کا دیہاتی اسٹیج ہے، اُن پڑھ لوگوں کا ہجوم ہے، شاہ صاحبؒ پنجابی میں تقریر کر رہے ہیں اور ان سادہ ورق لوگوں کے دلوں کو گرماتے جا رہے ہیں، یا پھر گلو شاہ کے میلے میں منبر بچھا ہوا ہے اور وہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں اور لوگ سر دھن رہے ہیں، اسٹیج علی گڑھ کا ہو یا موچی دروائے کا، منبر جامع مسجد دہلی کا ہو یا گلو شاہ کا، شاہ صاحبؒ کا جادو یکساں ایمان افروز ہوتا۔

توضیح السنن

شرح

آثار السنن للامام النبیوی

(دو جلد مکمل)

تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

آثار السنن سے متعلق مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کی تدریسی، تحقیقی، درسی افادات اور نادر تحقیقات کا عظیم الشان علمی سرمایہ، علم حدیث اور فقہ سے متعلق مباحث کا شاہکار، مسلک احناف کے قطعی دلائل اور دلنشین تشریح، معرکہ الآراء مباحث پر مدلل اور مفصل مقدمہ اور تحقیقی تعلیقات اس پر مستزاد۔

کاغذ، کتابت، طباعت، جلد بندی اور اب نئے کمپیوٹرائزڈ چار رنگہ ٹائٹل، ہر لحاظ سے معیاری اور شاندار، اساتذہ اور طلباء مدارس کے لئے خاص رعایت۔

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس، خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

القاسم اکیڈمی کی تازہ، عظیم اور شاہکار علمی پیش کش



شرح شمائل ترمذی

(تین جلد مکمل)

ایک عظیم خوشخبری

تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ایک نادر تحفہ

حدیث کی جلیل القدر کتاب شمائل ترمذی کی سہل و دلنشین تشریح، سلجھی ہوئی سلیس تحریر، اکابر علماء دیوبند کے طرز پر تفصیلی درسی شرح، لغوی تحقیق اور مستند حوالہ جات، متعلقہ موضوع پر ٹھوس دلائل و تفصیل، رواد حدیث کا مستند تذکرہ، متنازعہ مسائل پر تحقیق اور قول فیصل، معرکہ الآراء مباحث پر جامع کلام، علماء دیوبند کے مسلک و مزاج کے عین مطابق، جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا محدثانہ منظر، نہایت تحقیقی تعلیقات اور اضافے، اردو زبان میں پہلی بار منصفہ شہود پر جدید ایڈیشن میں تمام حوالہ جات اور عربی عبارات کا بھی اردو ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

صفحات : 1600

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ سرحد پاکستان

عبدالقیوم حقانی کی تصنیفات

